فورٹ ولیم کالج

اور

اکرام علی

نادم سیتاپوری

شائع کردہ

ادارۂ فروغ اردو۔ لکھنؤ

مطبوعہ
سرفراز پریس لکھنؤ

ٹیلیفون نمبر 6135

قیمت للعہ

۱۹۵۹ء

برادر محترم جناب سید محمد اظہر صاحب

زائر مدار المہام ریاست محمود آباد کے نام-----

جن کی بزرگانہ شفقتوں نے مجھے تصنیفی شعور

کی لازوال دولت عطا فرمائی۔

نادم سیتاپوری

بھوپال- مئی ۱۹۵۹ء

پیش لفظ

جناب پروفیسر آغا اشہر صاحب لکھنوی

عرصہ ہوا کہ جناب نادم سیتاپوری نے مولوی اکرام علی مرحوم (مترجم اخوان الصفا) کے متعلق اپنا ایک مضمون بعنوان "علامہ سیتاپوری" مجھے سنایا تھا تو میں نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ وہ اس مضمون کا تحقیقی تجزیہ کر کے اردو ادب کی تاریخ کے اس ضروری موضوع کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ تاریخ ادب کی اس عظیم شخصیت کے بارے میں اب تک جو منتشر اور نامکمل اوراق سامنے آئے ہیں وہ نہ ہونے کے برابر ہیں --- یہاں تک کہ اردو ادب کی تاریخ مولوی اکرام علی کے وطن مالوف کی نشاندہی بھی نہیں کر سکی۔ نادم صاحب سیتاپوری کی یہ تحقیقی کاوش جو آج "فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی" کی شکل میں سامنے ہے اردو زبان و ادب کی تاریخ کے وہ اوراق گم گشتہ ہیں جنھیں کسی وقت مشعل راہ بنا کے ارباب تحقیق ادبیات کی ان منزلوں تک پہنچ سکیں گے جو ڈیڑھ سو سال سے پردۂ گمنامی میں چھپی ہوئی ہیں اگرچہ اس وقت یہ تاریکیاں اجالوں سے قریب ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔

مولوی اکرام علی میرے خسر محترم حضرت نظم سیتاپوری مغفور کے حقیقی دادا

تھے اور اسی نسبت سے مجھے تاریخ ادب کے اس خصوصی باب سے ایک قسم کا
فطری لگاؤ ہمیشہ سے رہا لیکن ملازمت کی مصروفیات اور "دربدری" نے کبھی
مجھے اس سلسلہ میں علمی کام کرنے کا موقع نہیں دیا پھر اس کے علاوہ اس
علم دوست خاندان میں جو تاریخی آثار و شواہد موجود تھے حضرت نظم کی وفات
کے بعد وہ کچھ اس طرح تباہ و برباد ہوئے کہ اب یہ سوچ کر دکھ ہوتا ہے کہ
تاریخ ادب کے اس اہم موضوع پر کیا کچھ لکھا بھی جاسکتا ہے؟ یہی وجہ تھی
جو اب تک یہ کام تشنۂ تکمیل رہا ورنہ شائد اس سے بہت پہلے انجام پاجاتا۔ مولوی
اکرام علی کی شخصیت اسی تاریخی عظمت کے لحاظ سے اہم نہیں ہے کہ وہ اردو ادب
کے موجودہ ترقی یافتہ عوامی رجحانات کے بانیوں میں سے ایک نمایاں فرد تھے۔
اور انھوں نے ڈیڑھ سو سال قبل پرانی طرز کی مرصع۔ مسجع اور مقفیٰ عبارت آرائی
کے خلاف ایک عملی جدوجہد میں ہاتھ بٹایا تھا بلکہ ان کی یہ اہمیت اور خصوصیت
اس لئے بھی قابل ذکر ہے کہ عربی کے ایک مستند اور متبحر عالم ہونے کے
باوجود انھوں نے عام فہم سلیس اور بامحاورہ اردو کے اس قدر نادر نمونے
پیش کئے ہیں جنھیں ان کے دوسرے معاصرین (میر امن دہلوی۔ میر شیر علی
افسوس۔ میر بہادر علی حسینی۔ سید حیدر بخش حیدری۔ مظہر علی ولا۔ مولوی امانت اللہ
شیدا۔ کاظم علی جوان اور مرزا علی لطف وغیرہ) کے مقابلے میں کسی نہج سے سبک
نہیں کہا جاسکتا بلکہ بعض ثقافتی زاویوں سے ان کے اسلوب نگارش میں انفرادیت
پائی جاتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں مولوی اکرام علی کے ساتھیوں میں صرف
ایک مولوی امانت اللہ شیدا کی ہستی ایسی تھی جو اپنے علمی تبحر کے لحاظ سے اکرام علی

کے ہم مرتبہ سمجھے جاتے تھے لیکن جہاں تک عام فہم اور سلیس طرز نگارش کا تعلق ہے
وہ ان کے یہاں قطعاً مفقود ہے چنانچہ مولوی محمد یحییٰ تنہا کا یہ فرمانا غلط نہیں ہے کہ۔

"مولوی امانت اللہ (شیدا) عالم و فاضل ضرور ہیں لیکن ان کی
عبارت میں شگفتگی اور روانی نہیں ہے۔ میر امن۔ سید حیدر بخش
حیدری اور میر شیر علی افسوس سے ان کو کوئی نسبت نہیں ہے۔

(صفحہ ۱۸۹۔ سیر المصنفین جلد اول پاکستان ایڈیشن)

ایک دوسری جگہ تنہا نے میر شیر علی افسوس کے ترجمے سے "اخوان الصفا"
کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"میر شیر علی افسوس نے "آرائش محفل" کے نام سے جو ترجمہ "خلاصۃ التواریخ"
کیا ہے اس میں یہ بات نہیں پائی جاتی حالانکہ یہ ترجمہ واقعی ترجمہ
ہے یعنی لفظی ترجمہ بھی ہے اور بامحاورہ بھی۔ برعکس اس کے افسوس
نے ملخص کیا ہے اور جہاں کہیں چاہا ہے اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا
ہے...... بہرحال افسوس کی عبارت سے مولوی اکرام علی کی تحریر
بہت بہتر ہے۔ خواہ لفظی ترجمہ ہو یا نہ ہو۔ علمی زبان کا انداز ہے اور
شگفتہ ہے۔ لطف یہ کہ آجکل کی تحریرات اور تصنیفات کے مشابہ ہے
اب اردو تصنیفات کا دور چہارم ہے اور یہ ڈیڑھ سو برس کی زبان
ہے لیکن بہت کم فرق ہے۔"

(صفحہ ۱۷۶۔ سیر المصنفین)

پروفیسر سید محمد (عثمانیہ) نے مولوی امانت اللہ شیدا کی "اخلاق جلالی"

اور "اخوان الصفا" کا ناقدانہ تجزیہ کرتے ہوئے واضح الفاظ میں مولوی اکرام علی
کے قلم کی امتیازی شان پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

"وہ تمام دقیق علمی اصطلاحات وخطبات کو خارج کرکے نفس مضمون
کو سلیس اور صاف زبان میں بیان کرتے ہیں اور مناظرہ میں قصہ
کہانی کا لطف پیدا کردیتے ہیں اور یہ اخوان الصفا) کی خاص خوبی
ہے اگر وہ اس (اخوان الصفا) کو اس قدر سلیس اور عام فہم نہ کرتے
تو مولوی امانت اللہ (شیدا) کے ترجمہ "اخلاق جلالی" کی طرح یہ کتاب
بھی طاق نسیاں کی نذر ہوجاتی۔"

(صفحہ ۲۲۳۔ ارباب نثر اردو۔ مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن)

ان دو ایک شواہد سے "اخوان الصفا" کی تاریخی اہمیت پر بہت کچھ روشنی
پڑتی ہے اور یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اکرام علی عام فہم اور بامحاورہ اسلوب
بیان کے لحاظ سے اپنے دوسرے معاصرین میں کسی سے بھی پیچھے نہیں تھے خواہ
وہ میر امن دہلوی ہوں یا حیدر بخش حیدری یا میر بہادر علی حسینی اور میر شیر علی
افسوس ـــــ!

مولوی اکرام علی کی نادر شخصیت سے اردو ادب کا ایک یہی تاریخی کارنامہ
(اخوان الصفا) ہی وابستہ نہیں ہے بلکہ جناب نادم سیتاپوری نے تحقیقی کاوشوں
سے پہلی بار یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ہندوستان میں اردو کا پہلا شخصی پریس (ہندوستانی
پریس کلکتہ) مولوی اکرام علی کی کوششوں سے قائم ہوا تھا اور وہ اردو زبان
کے پہلے "صحافی" تھے جنھوں نے سنہ ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے "اردو اخبار" کے نام سے

ایک اخبار بھی نکالا تھا۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں مولوی اکرام علی کی ایک دوسری
غیر مطبوعہ تصنیف "مصنفین اسلام" کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جس کا علم شائد
کم ہی لوگوں کو ہو۔

آخر میں یہ لکھنا ناگزیر ہے کہ اردو کے اس جمودی دور میں نادم صاحب
سیتاپوری کا اردو نواز قلم متواتر کام کرتا رہتا ہے خاص کر ان کی یہ سعی مشکور
کہ زبان وادب کی آغازی کڑیوں کو انتہائی سلسلوں سے پیوست کرتے رہیں قابل
صد تحسین و آفرین ہے جس کی تکمیل میں جن زحمتوں اور کاوشوں سے انھیں دوچار
ہونا پڑا اس کا اندازہ وہی حضرات کرسکتے ہیں جو میدان ثقافت کے شناور ہیں۔
مجھے یقین ہے کہ تحقیق و جستجو کی یہ کڑیاں یقیناً اردو ادب کی تاریخ کے بہت سے سلسلوں
کو جوڑنے میں کام دیں گی اور مستقبل کی تاریخ اس کی مضبوط شیرازہ بندی
کرسکے گی۔

سیتاپور۔ اپریل سنہ ۱۹۵۹ء

"گفتنی — ناگفتنی"

۱۵ مارچ ۱۹۵۸ء

آج جب میں ان بکھرے ہوئے اوراق کا سرسری جائزہ لے رہا ہوں تو بہت سی نہ کہنے والی باتیں بھی کہہ ڈالنے کو جی چاہتا ہے تاکہ میرے دل کا بوجھ ہی ہلکا نہ ہو بلکہ میں ان اہم ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہو جاؤں جو کسی وقت مورخین میرے سر عائد کرنے کی کوشش کریں گے اور شاید اس وقت اس اعتراف کے سوا کوئی بھی نہ ہوگا جو میری "نیک نیتی" کی "بے گناہی" پر دو لفظ بھی کہہ سکے۔

"تحقیق و تاریخ" کا کام ایک طرف تو مشکل ترین کام ہے دوسری طرف اتنی اہم ذمہ داریوں کا بار۔ جسے مستقبل کے بدلے ہوئے نظریات کبھی بھی معاف نہیں کرتے۔ آنے والا مورخ جب ماضی کی تاریخ کا جائزہ لیتا ہے تو نہ اس دور کے ماحول کی طرف دیکھتا ہے نہ گذرے ہوئے زمانے کی لاشعوری دشواریوں پر نگاہ ڈالتا ہے وہ تو ایک ماہر فن ڈاکٹر کی طرح اس بے جان لاش پر ٹوٹ پڑتا ہے جو اس کے سامنے "پوسٹ مارٹم" کے لئے رکھ دی جاتی ہے۔ اور اس کے بیدرد ہاتھوں کی روانی بلا گردو پیش دیکھے ہوئے صرف چند زاویوں کے آس پاس چکر لگاتی رہتی ہے۔ اور یہ ہوتے ہیں وقت کے تقاضے۔ بدلے ہوئے زمانے کی ضرورتیں، کچھ نظریات اور چند ایسے فرائض جو اکثر ناگہانی نہیں خود ساختہ ہوتے ہیں۔

"اکرام علی" کے حالات پہ وسط ۱۹۳۷ء میں جب میں نے پہلی بار ایک جگہ

سطحی مضمون (علامہ سیتاپوری) لکھا تھا تو میرے تصور پر بھی یہ بات نہیں تھی کہ پورے بیس برس کے بعد میں اس اہم موضوع کو پھر کبھی ہاتھ لگا سکوں گا۔ یہ مضمون گو کہ میری "نومشقی" کا ایک کامیاب نمونہ تھا لیکن نہ اسے کوئی تحقیقی اہمیت حاصل تھی نہ تاریخی۔ اسی لئے کسی اخبار یا رسالے میں اشاعت کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔ لیکن چند احباب نے نہ جانے کیوں اسے پسند کر لیا "مجلس ادب سیتاپور" کی طرف سے ایک چھوٹے سے "کتابچے" کی شکل میں "علامہ سیتاپوری" کے نام سے شائع کر دیا جس پر اس وقت کے ادبی رسائل نے کافی حوصلہ افزا تبصرے کیے۔

اس مضمون کو دیکھ کر ڈاکٹر عبدالحق صاحب (سکریٹری انجمن ترقی اردو دہلی) نے مجھے اس مفہوم کا خط لکھا:۔

"انجمن ترقی اردو قدیم کمیاب کتابوں کی احیار کا جو کام کر رہی ہے اس اسکیم میں "اخوان الصفا" بھی شامل ہے میں چاہتا ہوں کہ اگر "اخوان الصفا" کے مختلف ایڈیشن مل جائیں تو تصحیح کر کے اسے شائع کر دیا جائے۔ آپ کے پاس جو اڈیشن ہیں اگر کچھ دنوں کے لئے بھیج دیجئے تو اس کام کی تکمیل کر کے واپس کر دوں گا۔"

ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے اس خط میں کوئی ایسی بات مجھے نظر نہیں آئی جس پر کچھ سوچنے یا غور کرنے کا سوال پیدا ہوتا؟ میں نے بلا کسی جھجک کے "اخوان الصفا" کے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے جتنے نسخے میرے پاس تھے رجسٹری سے انھیں روانہ کر دیئے جس کی رسید بھی آگئی۔

یہ واقعہ آخر ۱۹۳۷ء کا ہے۔ کتابیں پہنچنے کے بعد ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے دونوں خطوط تو آئے۔ مگر اچانک ان تعلقات پر ایک خاموشی چھا گئی۔ ایسا سکوت جسے میرے وہ بے شمار خطوط بھی نہ توڑ سکے جو تقریباً دو سال تک برابر میں ڈاکٹر صاحب کو

لکھتا رہا! ان خطوط میں میں نے کئی بار اپنی ان کتابوں کی واپسی کے لئے بھی لکھا تھا جو عاریتاً بھیجی گئی تھیں۔ لیکن کتابوں کی واپسی کا کیا سوال تھا جب خطوط کی رسید تک نہ آتی تھی؟

پورے دو سال گذر گئے۔ میں ان قیمتی کتابوں کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکا تھا کہ اچانک ۱۹۳۹ء میں "انجمن ترقی اردو دہلی" کی طرف سے مجھے ایک کتابوں کا پارسل موصول ہوا۔ جس میں انجمن کے شائع کردہ "اخوان الصفا" کی صرف دو جلدیں تھیں یہ اڈیشن انجمن نے اسی زمانے میں شائع کیا تھا جس میں میرے بھیجے ہوئے "اخوان الصفا" کا حوالہ اور ذکر تو درکنار۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے خلاف معمول دو صفحوں کا مقدمہ یا دیباچہ تک نہیں لکھا تھا۔

اکرام علی کے حالات سے اب تک اردو زبان و ادب کی تاریخ بالکل نا آشنا تھی میرے اس مضمون (علامہ سیتاپوری) کو عام طور پر اسی لئے اہمیت حاصل ہوئی تھی کہ ان اوراق سے تاریخ کی ایک گمنام شخصیت کچھ نہ کچھ سامنے آگئی تھی اور "اخوان الصفا" کے اس جدید اڈیشن (مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۹ء) سے کم از کم میری اتنی امیدیں تو ضرور وابستہ تھیں کہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے اکرام علی اور "اخوان الصفا" کے موضوع پر کچھ نہ کچھ تو ضرور لکھا ہوگا جو ہو سکتا ہے کہ میرے پیش کردہ حالات ان کے زاویۂ تحقیق کو مطمئن نہ کر سکے ہوں اور اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے مخصوص طرز فکر سے "اخوان الصفا" پر کسی نئے انداز سے روشنی ڈالی ہو۔ لیکن انجمن کے اس نئے اڈیشن میں کچھ بھی نہیں تھا! ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے نہ دو سطریں "اکرام علی" پر لکھی تھیں نہ دو حرف "اخوان الصفا" پر۔!

ان تفصیلات کو پیش کرنے کے بعد غالباً یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے ان کتابوں میں سے ایک ورق بھی مجھے واپس نہیں کیا۔

اور بقول مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم یہ کتابیں۔ "ہرچہ در کان نمک رفت نمک شد۔۔۔۔!" ہوگئیں۔ اور ساتھ ہی ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے وہ تعلقات بھی منقطع کر دیے جن میں چند سال پہلے ان کے مسلسل خطوط نے کافی گرمی پیدا کر دی تھی۔

اس المناک حادثے کے بعد میں کافی دنوں تک نہ کچھ اکرام علی صاحب کے بارے میں سوچ سکا، نہ "اخوان الصفا" کے متعلق؛ انقلاب ۱۹۴۷ء سے چند ماہ پہلے میں ایک عرصہ کے بعد جب "مرض الموت" سے چھٹکارا پاکر حیدر آباد دکن سے واپس ہوا تو میرے محترم قاضی الیاس حسین صاحب جعفری سیتاپوری نے پھر ان دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دے دی جو قریب قریب سرد ہو چکی تھیں۔

قاضی سید الیاس حسین صاحب جنھیں نہ تو بقید حیات سمجھ کر ان کی زندگی کے لئے دعا کر سکتا ہوں نہ "مرحوم" سمجھ کر دعائے مغفرت۔ تقریباً پانچ سال ہوئے عجیب پُر اسرار طور پر "قصبہ باڑی" سے سدھولی (ضلع سیتاپور) آتے ہوئے کچھ ایسے غائب ہوئے کہ آج تک کوئی پتہ نہ چل سکا۔ کم گو۔ خاموش۔ نیک اور ایسے مرنج و مرنجان قسم کے آدمی تھے جن کا دنیا میں کوئی دشمن ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ مال و دولت سے اتنے مستغنی کہ چور و رہزن ان کے قریب آنا بھی اپنی فنکاری کی توہین سمجھتے۔ !پھر کہاں گئے؛ کیا ہوئے؛ زمین نگل گئی کہ آسمان کھا گیا؛ آج تک یہ معمہ حل نہ ہو سکا؟

قاضی صاحب سیتاپور کی زندہ تاریخ تھے۔ اکرام علی پر ۱۹۱۳ء میں سب سے پہلے انھوں نے ماہنامہ "الناظر" لکھنؤ میں ایک چھوٹا سا مضمون لکھا تھا جسے ادبی یا تاریخی اہمیت تو نہیں دی جا سکتی مگر "نقش اول" کی حیثیت سے اسے تاریخ ادب کا ایک قیمتی صفحہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ قاضی صاحب آخر وقت تک خیرآباد کے مشہور عربی دارالعلوم "مدرسہ نیازیہ" سے متعلق رہے۔ وہیں رہتے تھے۔

اکرام علی اور "خلیل الدین اشک" کے متعلق انھوں نے کافی تحقیق و تجسس کیا تھا۔ ان اوراق کی ترتیب میں قاضی صاحب کی مرتب کرائی ہوئی انھیں یادداشتوں سے کافی مدد لی گئی ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً مرتب کرادی تھیں اور مجھے اس اعتراف میں ذرا بھی جھجک نہیں ہے کہ اگر قاضی صاحب کی یادداشتیں میری رہنمائی اور رہبری نہ کرتیں تو شاید آج یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکتا۔ اس مضمون (علامہ سیتاپوری) کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے اس "غیر ادبی سلوک" نے بہت دنوں تک مجھے اس موضوع پر کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیا اور ایک کافی مدت تک میں اس ضروری اور اہم کام کی طرف سے "بے نیاز" سا ہو کر رہ گیا۔

۱۹۴۹ء یا ۱۹۵۰ء میں ایک دوست نے مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا کی "سیر المصنفین" (جلد اول) کا نیا اڈیشن (جو غالباً ۱۹۴۸ء میں شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے چھاپا ہے) لاکر دکھایا تو اسمٰعیل تنہا صاحب نے اس قسم کے مضامین بہت حوصلہ افزا تبصرہ کیا تھا لکھا ہے تنہا صاحب نے:۔

> "اب تک بہت سے ایسے مصنفین ہوں گے جو گوشہ گمنامی میں پڑے ہوں گے۔ لیکن اب یہ کام ان اصحاب کا ہے جن کے پاس ایسے گمنام اصحاب کی کتابیں [illegible] وہ خاکسار سے خط و کتابت کریں اور معلومات بہم پہنچائیں۔ ہم نادم صاحب سیتاپوری کے ممنون ہیں کہ انھوں نے "علامہ سیتاپوری" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا اور ہمارے پاس بھیجا تاکہ ہم مولوی اکرام علی صاحب سیتاپوری کے حالات زندگی میں کچھ اضافہ کر سکیں۔"
>
> (صفحہ ۲ دیباچہ طبع دوم "سیر المصنفین" پاکستان اڈیشن جلد اول)

اکرام علی کے حالات میں بھی میرے اس مضمون (علامہ سیتاپوری) کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ہم نادم سیتاپوری کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے "علامہ سیتاپوری" کے عنوان سے ایک نہایت مختصر رسالہ ہمارے پاس ۳ ستمبر ۱۹۳۶ء کو بھیجا تھا وہ مولوی اکرام علی صاحب کو "علامہ سیتاپوری" کے نام سے یاد فرماتے ہیں اور انھوں نے اس رسالہ میں ان کے حالات زندگی قلمبند کئے ہیں جن کو ہم نے کسی قدر اختصار کے ساتھ اوپر درج کیا ہے۔"

(صفحہ ۱۲۴ "سیر المصنفین" پاکستان ایڈیشن جلد اول)

تنہا صاحب نے بار بار حوصلہ افزائی کے لئے میرا ذکر کر دیا۔ حالانکہ اس مختصر مضمون میں سرسری اور سطحی حالات کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن کچھ نہ ہونے کے باوجود اس مختصر مضمون سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اب تک تاریخ ادب میں اکرام علی کے جو حالات چند سطروں میں لکھے جاتے تھے ان میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہو گیا۔

۱۹۵۰ء میں تنہا صاحب کی "حوصلہ افزائی" نے پہلی بار مجھے اس شدید ضرورت کا احساس دلایا۔ اسی زمانے میں مجھے پہلی بار مولوی خلیل الدین اشک خیرآبادی (جن کا نام اکثر و بیشتر تذکروں میں خلیل اللہ اشک یا خلیل علی اشک لکھا گیا ہے) کے کچھ سرسری حالات بھی معلوم ہوئے۔ میں اشک کے بارے میں تفصیلات فراہم ہی کر رہا تھا کہ پاکستان کے ایک ادبی رسالے نے مجھے "اکرام علی" پر تحقیقی مضمون لکھنے کی دعوت دی۔ مگر یہ مضمون اس وقت مکمل ہوا جب وہ پرچہ بند ہو چکا تھا چنانچہ اس مضمون کو میں نے اگست ۱۹۵۰ء میں ماہنامہ "آجکل" دہلی بھیج دیا جو اس وقت تک شائع نہیں ہوا۔

ادھر جب میں نے کتابوں کے سخت فقدان کے باوجود اس کتاب (فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی) کو مکمل کرنے کا ارادہ کیا تو مجھے اپنے اس مضمون کا مسودہ بھی نہ مل سکا جو میں نے "آجکل" دہلی کے لئے بھیجا ہے۔ صرف پہلا مضمون (علامہ سیتاپوری) سامنے ہے اور وہ یادداشتیں جو قاضی سید الیاس حسین صاحب نے مرتب کرا دی تھیں۔

جہاں تک میرا حافظہ ساتھ دیتا ہے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ واقعات کی ترتیب و تدوین کے لحاظ سے میری یہ کتاب میرے ان پچھلے مضامین سے بہت کچھ آگے بڑھی ہوئی ایک محققانہ کاوش ہے جو اب بھی نامکمل ہونے کے باوجود اردو ادب کی تاریخ میں کچھ جدید زاویوں کا اضافہ ضرور کرے گی۔

"تحقیق و جستجو" کی تنگ دامانی ایک مسلمہ حقیقت ہے اس لئے میں کسی وقت بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ اس "نقش اول" کے بعد جو دوسرے نقوش سامنے آئیں گے وہ اس سے زیادہ حسین و خوبصورت نہ ہوں گے میرے پچھلے مضامین اور اس نئی جد و جہد میں کہیں کہیں ایسے تضاد کا بھی امکان ہے جسے مستقبل کے محققین خواہ کسی نقطہ نظر سے کیوں نہ پیش کریں مگر میں انھیں اپنی نئی کد و کاوش کا ایک دیانتدارانہ نتیجہ سمجھتا ہوں ہو سکتا ہے کہ میرے آج کے فراہم کردہ واقعات کی وسعت آیندہ چل کر دوسری دستاویزی شہادتوں سے اور وسیع ہو جائے یا کسی واقعہ کی تفصیلات اپنی تاریخی نوعیت سے کسی اور موڑ پر پہنچ جائیں۔ لیکن آخری طور اس کا نتیجہ یہی نکالا جائے گا کہ علمی اور تاریخی تحقیق ہمیشہ آگے ہی بڑھتی ہے پیچھے نہیں ہٹتی۔

شکریہ۔ ایک رسمی لفظ بن گیا ہے اور بقول "غالب" میں کسی طرح بھی اس "مرگ انبوہ" کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوں لیکن چند بزرگوں اور دوستوں نے اس سلسلہ میں جس غیر معمولی انہماک اور دلچسپی کا اظہار فرمایا وہ بھی تو بھلانے والی چیز نہیں ہیں۔

محترمی پروفیسر آغا اشہر صاحب لکھنوی (داماد منشی علی محمد صاحب نظم نبیرہ اکرام علی) ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں جنھوں نے بہت سی خاندانی روایات اور واقعات کی کڑیاں ملانے میں مجھے سب سے زیادہ مدد دی اور بہت سی

تاریخی اور ادبی یادداشتیں مرحمت فرما کر اس اہم کام کی تکمیل میں تعاون فرمایا۔

برادر محترم جناب سید احمد حسن صاحب زیدی (ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ وزارت مال بھوپال) برادرم سید منظور سرورش صاحب (اسسٹنٹ اکزیکٹیو آفیسر میونسپل بورڈ بھوپال) برادرم جناب شرقی عثمانی بھوپالی اور مولانا سید وجدی الحسینی بھوپالی نے نہ صرف بہت سی کتابیں عنایت فرما کر تعاون عمل فرمایا بلکہ اپنے قیمتی مشوروں سے بھی میری رہبری اور رہنمائی فرمائی۔

ناسپاس گذاری ہوگی اگر محب محترم مولانا امتیاز علی صاحب عرشی رام پوری اور برادرم ڈاکٹر محمد صابر خاں ضبط (کلکتہ یونیورسٹی) کی تعاون فرمائی کا ذکر نہ کروں جو باوجود مشکلات کے یہ دونوں حضرات مخلصانہ اشتراک عمل کی صورت میں وقتاً فوقتاً فرماتے رہے خصوصاً برادرم ضبط نے اکثر نازک ترین مرحلوں پر اس وقت میری رہنمائی کی جب میری قوت عمل جواب دے چکی تھی — اور وہ بھی ان حالات میں کہ وہ اسی زمانے میں چار سال کے بعد یورپ اور امریکہ میں قیام کے بعد ہندوستان واپس پہنچے تھے اور کلکتہ یونیورسٹی کی نئی ذمہ داریوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھے ضبط صاحب نے نہ محض "اخوان الصفا" جیسے اہم موضوع پر کافی یادداشتیں مرتب فرما کر روانہ کیں بلکہ بعض ایسی کتابوں سے نوٹ بھی لکھ کر بھیجے جو کلکتہ کے سوا شاید ہی کسی بڑی لائبریری میں دستیاب ہوتیں۔

رفیقیہ اسکول روڈ
بھوپال

نادم سیتاپوری

کتابیات

۱- ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض اقتصادی اور سیاسی پہلو — ڈاکٹر زین العابدین احمد (مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی) مطبوعہ کارنیشن پریس دہلی سنہ ۱۹۳۹ء

۲- مسلمانوں کا روشن مستقبل — سید طفیل احمد منگلوری علیگ (مطبوعات مکتبہ جامعہ دہلی) مطبوعہ نظامی پریس بدایوں سنہ ۱۹۴۰ء

۳- سلطنت خداداد .. .. محمود خاں بنگلوری (مطبوعہ برقی کوہ نور پریس محسکر بنگلور سنہ ۱۹۳۹ء

۵- برطانوی حکومت ہند — محمد الیاس برنی مطبوعہ دار الطبع عثمانیہ حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۲۳ء

۶- باغی ہندوستان .. ... عبد الشاہد خاں شروانی مطبوعہ مدینہ پریس بجنور سنہ ۱۹۴۶ء

۷- بنگال میں اردو ... ... وفا راشدی (مطبوعات مکتبہ اشاعت اردو حیدرآباد پاکستان) مطبوعہ افتخار پریس حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۵۵ء

۸- تاریخ نظم ونثر اردو — ... آغا محمد باقر (مطبوعات شیخ مبارک علی) مطبوعہ برٹش کوآپریٹو کیپٹل پریس لاہور سنہ ۱۹۳۸ء

۹- انتخاب مخزن (جلد اول) آغا محمد باقر (مطبوعات شیخ مبارک علی) مطبوعہ عالمگیر پریس، لاہور۔

۱۰- تاریخ زبان اردو .. .. (یعنی اردوئے قدیم) حکیم شمس اللہ قادری مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۳۰ء۔

۱۱- داستان اردو .. .. نواب نصیر حسین خیال (ادارہ اشاعت حیدرآباد دکن)

۱۲ ـ اُردو زبان اور ادب .. ڈاکٹر مسعود حسین ـ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ

۱۳ ـ روحِ مقالات .. .. (گارساں دتاسی) یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ

۱۴ ـ مقالات گارساں دتاسی (مطبوعات انجمن ترقی اردو ہند دہلی) مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۴۳ء

۱۵ ـ داستان تاریخ اردو .. پروفیسر حامد حسن قادری مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ ۱۹۵۷ء (دوسرا ایڈیشن)

۱۶ ـ تذکرہ گلشن ہند .. مرزا علی لطف (مطبوعات انجمن ترقی اردو) مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور ۱۹۰۶ء

۱۷ ـ تذکرہ گلزار ابراہیم مع تذکرہ گلشن ہند (مطبوعات انجمن ترقی اُردو) مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۳۴ء

۱۸ ـ سیر المصنفین (جلد اول) .. مولوی محمد یحییٰ تنہا (مطبوعات شیخ مبارک علی) عالمگیر پریس لاہور (پاکستان)

۱۹ ـ سیر المصنفین (جلد دوم) مطبوعات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، مطبوعہ جامعہ ملیہ پریس دہلی ۱۹۲۸ء۔

۲۰ ـ ارباب نثر اردو .. .. مولوی سید محمد (عثمانیہ) مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ۱۹۳۶ء

۲۱ ـ تذکرہ یادگار ضیغم .. مطبوعہ مطبع قادری حیدرآباد دکن ۱۳۰۲ھ

۲۲ ـ اُردو شہ پارے .. ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری (مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن) ۱۹۲۹ء

۲۳ ـ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ } علامہ عبداللہ یوسف علی (مطبوعات ہندوستانی اکاڈیمی الٰہ آباد) مطبوعہ سٹی پریس الٰہ آباد ۱۹۳۶ء

۲۴ ـ سیاسی تاریخ ہند .. .. (سرجان میلکم) مطبع عثمانیہ سرکاری ـ حیدرآباد دکن ـ ۱۹۳۲ء

۲۵ ـ کیفیہ .. .. .. علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی ـ (مطبوعات انجمن ترقی اردو دہلی) مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی ـ ۱۹۴۲ء

۲۶ ـ خطبات عبد الحق .. .. ڈاکٹر عبد الحق (مطبوعات انجمن ترقی اردو دہلی) مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۴۴ء

۲۷ ـ "اختر شہنشاہی .. .. اختر الدولہ مرحوم ـ مطبوعہ اختر پریس لکھنؤ ۱۸۸۸ء

۲۸ ـ حیات مومن .. .. ضمیر الدین احمد عرش گیاوی مطبوعہ تجلی پرنٹنگ پریس دہلی

۲۹ ـ "دربار اکبری" .. .. محمد حسین آزاد ـ مطبوعہ مطبع رفاہ عام لاہور ۱۸۹۸ء

۳۰ ـ مقالات عرفان .. .. ایم ـ عرفان مطبوعہ علوی پریس بھوپال ـ

۳۱ ـ تاریخ فاطمین مصر .. مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ـ

۳۲ ـ تاریخ فرشتہ .. .. مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۳ء

۳۳ ـ تاریخ شعرائے اردو .. مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۸ء

۳۴ ـ اُردو کی نثری داستانیں .. ڈاکٹر گیان چند ـ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان

۳۵ ـ "ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں } محمد عتیق صدیقی ـ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۷ء

۳۶ ـ تلامذہ غالب .. مالک رام ایم ـ اے

۳۷ ـ کمپنی کی حکومت .. .. .. باری ـ مطبوعہ مکتبہ اردو لاہور

عنوانات

صفحہ

فورٹ ولیم کالج

ایسٹ انڈیا کمپنی

ذکر ہے ۱۴۹۹ء کا۔؟

عرب تاجروں کی چاول سے لدی ہوئی کشتیوں پر ڈاکے ڈالتا ہوا پرتگال کا ایک سمندری بیڑا "واسکوڈی گاما" کی قیادت اور رہنمائی میں "کالی کٹ" کے غیر آباد سے کنارے پر آ لگا — اور دیکھتے ہی دیکھتے چند روز کے اندر ہندوستان میں ایک پرتگالی نوآبادی کی داغ بیل پڑ گئی۔۔ لیکن یہ جدید "نوآبادی" پرتگال کو راس نہ آئی اور کچھ دنوں کے بعد پرتگال کو اپنی "سالمیت" سے ہاتھ دھو کر اسپین میں ضم ہو جانا پڑا۔

دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی میں "نارمنڈی" کی فتوحات نے انگلستان کو جس انقلاب کے بھنور میں پھینک دیا تھا "ٹیوڈر" خاندان کا عروج اب اسے کنارے پر کھینچ لایا تھا۔ جوٹس۔ اینگلز اور سکسنیز کے نیم وحشی قبیلوں میں قومی زندگی کا ایک اجتماعی احساس و شعور نشوونما پا رہا تھا۔ نئی زندگی اور نئے شعور نے ان میں "جذبۂ رقابت" کے احساس کو بھی شدت کے ساتھ ابھارا۔ اور انگلستان بھی ہالینڈ کی نگاہوں سے اسپین کی تجارتی اجارہ داری کو تکنے لگا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے اتحاد نے "تاج" کو "پراٹسٹنٹ" فرقہ کے شیرازے سے منسلک کر کے "برطانیہ عظمیٰ" کے ایک نئے تصور سے روشناس کر دیا تھا۔

اس زمانے میں ہالینڈ نے پورے سطوت و جبروت کے ساتھ اسپینی اقتدار کو تباہ و برباد کرنے کے لئے برسرپیکار تھا لیکن "طاقت آزمائی" کی یہ بہیمانہ جدوجہد بہت

زیادہ دنوں تک انسانی خون کی ہولی نہ کھیل سکی۔ اسپین کو شکست ہوئی اور شکست خوردہ اسپین کے ساتھ پرتگال کا زوال بھی شروع ہو گیا۔

پرتگال کے اس زوال سے اس کی اس "نوآبادی" کو بھی قدرتاً متاثر ہونا چاہیئے تھا چنانچہ ہندوستان میں اس نوآبادی کا سہارا لے کر جو تجارتی اجارہ داری قائم کی گئی تھی اس کا شیرازہ بھی منتشر ہونا شروع ہو گیا۔ انگلینڈ اور ہالینڈ جو اب تک ہوسِ ملک گیری کے بہت سے زاویوں پر متحد نظر آ رہے تھے "مشرقی مفاد" میں وہ بھی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے یہاں تک کہ سترھویں صدی عیسوی میں پرتگالی تو برائے نام ہی رہ گئے ہندوستان کی تجارتی منڈیوں میں صرف ولندیزی اور انگریز ایک دوسرے کے مد مقابل نظر آنے لگے۔

تجارتی مفاد کی اس دوڑ دھوپ میں ولندیزی تاجروں نے "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے نام سے جو ادارہ قائم کیا تھا انگریز تاجروں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی "ملکۂ الزبتھ" سے درخواست کی کہ ان میں بھی جزائر شرق الہند میں ایسی ہی اجتماعی تجارت کرنے کا حکم دیا جائے۔ ملکہ نے لندن کے تاجروں کی اس درخواست کو منظور کرتے ہوئے ایک منشور عطا فرمایا۔ جو دراصل جنگ کرنے کا ایک ایسا حکم تھا جس کی رو سے یہ تجارتی بیڑے حفاظت "خود رفتاری" اور تحفظ حقوق کو بہانہ بنا کر جب۔ جہاں اور جس سے چاہتے جنگ کر سکتے تھے؛

یہ تھی وہ "ایسٹ انڈیا کمپنی" جسے ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بھیانک خواب کہنا بیجا نہ ہو گا۔

ملکۂ الزبتھ نے لندن کے تاجروں کو "منشور جنگ" عطا فرمایا تھا اس کے نتائج بہت جلد ہی سامنے آ گئے۔ اسپین اب تک تنہا امریکہ کی دولت ہڑپ کرنے کا نیک کام انجام دے رہا تھا۔ انگریز ملاح آخر کب تک صبر کئے اپنی آنکھوں سے اپنے مفاد

کی اس بربادی کو دیکھتے رہتے چنانچہ انگریز ملاحوں نے اسپین کے ان جہازوں کو لوٹنا شروع کر دیا جو سونے چاندی کے ذخیرے سمیٹ کر امریکہ سے اسپین کی طرف جا رہے تھے۔ انگریزوں کے ان بحری قزاقوں کا سردار "فرانسس ڈریک" تھا جس کے متعلق شاہ اسپین نے "ملکہ الزبتھ" سے مطالبہ کیا تھا کہ اسے اسپین کے حوالے کر دیا جائے۔ انگلستان کی ملکہ نے نہ محض شاہ اسپین کی اس درخواست کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا بلکہ سمندری ڈاکوؤں کے اس سردار کو "سر" کا خطاب دے کر اسپین والوں کو یہ بھی سمجھا دیا کہ اس "بحری قزاقی" کی سرپرست خود ملکہ انگلستان "الزبتھ" ہے۔

اسپین پر ملکہ کے اس غیر دوستانہ طرز عمل کا ردعمل وہی ہوا جو ایک دشمن ملک پر دوسرے غیر حلیف ملک کا ہونا چاہیے۔ مفاد پرستی کے جوالا مکھی انگارے اگلنے لگے۔ سونے چاندی کی ہوس مذہبی جنگ میں تبدیل ہوئی اور اس جنگ میں اسپین کو شکست فاش کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ شکست اسپین ہی کی شکست نہیں تھی بلکہ انگلستان میں کیتھولک فرقے کی شکست تھی جس نے انگریزوں کے جذبۂ قومی میں ایک روح پرور بیداری پیدا کر دی۔ اور انگریز ملاحوں کے لئے تمام سمندری راستے کھل آنگن ہو گئے آرمیڈہ کی اس شکست کے بعد انگلستان اور ہالینڈ کی وہ کشمکش بھی ختم ہو گئی جو برسوں سے میدان کارزار بنی ہوئی تھی کمپنی سازی کا پہلا دور ۱۵۹۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ اور یہی سترھویں صدی صحیح معنوں میں مغربی ممالک کے مشرق میں عروج کی بنیاد کہی جا سکتی ہے۔ جہانگیر نے ۱۶۱۲ء میں پرتگیزیوں سے ایک تجارتی معاہدہ کیا۔ مگر ان لوگوں نے سال بھر کے اندر ہی اندر اس معاہدے کے پرزے پرزے ہوا میں اڑا دیے۔ "سورت" کی بندرگاہ کے قریب انھوں نے کئی جہازوں کو لوٹ لیا اور سورت کے قلعہ پر قبضہ کر کے پرتگال کا جھنڈا لہرا دینا چاہا۔

مغل فوجوں نے پرتگیزیوں کے خلاف سخت اقدام کیا اور ان کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔ انگلستان کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے سورت میں اپنی پہلی تجارتی کوٹھی ۱۶۰۸ء میں قائم کی تھی پرتگال کی اس شکست کے ایک ہی سال بعد شاہ انگلستان جیمز اول کی سفارت بھی "سر ٹامس رو" کی قیادت میں آگرے آ پہنچی اور پورے تین سال تک "مغل دربار" کے سیاسی اتار چڑھاؤ کا خاموشی کے ساتھ مطالعہ کرتی رہی

انگریزوں کا تجارتی مرکز پہلے پہل سورت میں قائم کیا گیا۔ اور یہ لوگ کافی صبر اور سکون کے ساتھ جہانگیر کی عطا کی ہوئی ان تجارتی رعایتوں پر قناعت کئے بیٹھے رہے جو "ٹامس رو" کی کوششوں سے انھیں حاصل ہوگئی تھیں ۱۶۱۶ء میں انھوں نے آہستہ آہستہ پاؤں پھیلانا شروع کئے۔ مسولی پٹم میں ایک کارخانہ قائم کر دیا گیا اور ۱۶۴۰ء میں مدراس کے ایک راجہ سے کچھ زمین خرید کر "سینٹ جارج فورٹ" کی بنیاد ڈال دی گئی۔ "ٹامس رو" نے جہانگیر کے دربار سے جو تجارتی مراعات حاصل کی تھیں اگرچہ اس میں آگرہ۔ اجمیر۔ احمد آباد اور بہرائچ (یو۔پی) ہی میں انھیں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت دی گئی تھی لیکن سترھویں صدی کے آخری دور میں یہ بنگال تک پھیلتے چلے گئے اور دریائے ہگلی کے کنارے بھی ان کا ایک کارخانہ "یونین جیک" لہراتا نظر آنے لگا جو اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے کلکتہ منتقل کر دیا گیا۔

سترھویں صدی کے وسط تک مغربی جنوبی ہند انگریزوں کے اثرات سے بہت کچھ محفوظ تھا لیکن کمپنی کی ہوس کار نگاہیں برابر ادھر لگی ہوئی تھیں چنانچہ ۱۶۶۲ء میں جب پرتگال نے بمبئی کا جزیرہ "چارلس دوم" کو پیش کیا تو چند ہی سال بعد انگریزوں نے جوڑ توڑ لڑا کر دس پاؤنڈ سالانہ لگان پر اسے چارلس سے حاصل کر لیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب فرانس مشرق میں انگلستان۔ ہالینڈ اور پرتگال کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھتے دیکھتے تھک چکا تھا "کمپنیوں" کی دوڑ میں کافی بھاری

پیدا ہو چکی تھی۔ خاموش تماشائی کی طرح اب فرانس کب تک اس تماشے کو دیکھتا رہتا۔ البرٹ نے "لوئی چہار دہم" سے "فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی" قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی اور جلد ہی فرانس کے بحری بیڑے ہندوستان کے ویران کناروں سے آ لگے۔ پانڈیچری اور چندر نگر پر قبضہ کرتے ہی ان لوگوں نے بھی ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ۱۷۴۱ء میں فرانسیسی ہند کے پہلے گورنر "ڈوپلے" نے ہندوستان کی تاریخ میں باقاعدہ طور پر ایک فرانسیسی "نوآبادی" کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔

"برطانوی حکومت ہند" میں محمد الیاس برنی نے لکھا ہے۔

"۱۷۴۱ء میں "ڈوپلے" گورنر بن کر پانڈیچری آیا کہ تاریخ ہندوستان میں ایک نیا دور شروع ہو گیا اس نے خوب اندازہ کر لیا کہ ہندوستان میں یورپ والوں کی ترقی اور اقتدار کے واسطے بہت وسیع میدان موجود ہے چنانچہ اس نے پالیسی یہ قرار دی کہ ہندوستانی حکمرانوں کے باہمی جھگڑوں میں دخل دے اور ہندوستانی فوجوں کو یورپ کے طریقے پر قواعد سکھائے۔ دم کے دم میں اس کو کامیابی حاصل ہو گئی اور کچھ روز کے واسطے جنوبی ہندوستان میں فرانس کا سب پر سکہ بیٹھ گیا"

(صفحہ ۵۶۔ "برطانوی حکومت ہند" مطبوعہ دار الطبع عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۲۳ء)

مشرق میں مغرب کے مفاد کو پروان چڑھانے کے لحاظ سے "ڈوپلے" کی یہ پالیسی غلط نہیں تھی۔ اگر بحری قزاقوں کو یہ جماعتیں باہمی رقابت اور آپسی چشمک کا شکار نہ ہو گئی ہوتیں تو جس مقصد کی تکمیل ۱۷۵۷ء میں "پلاسی" کے میدان جنگ میں کی گئی وہ اس سے کہیں پہلے مکمل ہو چکا تھا۔

انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی زندگی کی ابتدا ہی میں ہندوستان کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کر دیا تھا انھیں ہر بحری سفر میں بے حساب نفع ہونا شروع ہو گیا۔

یہاں تک کہ بارھویں سفر میں ہر حصہ دار کو 334 "فی صدی نفع ہوا۔ انگلستان کی آمدنی میں بھی دن دونی رات چوگنی زیادتی ہو گئی ۱۶۱۳ء میں برطانیہ کی سرکار کو کمپنی نے تیرہ ہزار پاؤنڈ محصول ادا کیا۔ اور ۱۶۶۲ء میں یہ رقم چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ ہندوستان میں پہلے بیس سال کے اندر یہ لوگ تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ پاؤنڈ کا سونا چاندی لائے جس کے بدلے ہندوستان کی مصنوعات خرید کر لے گئے۔

(صفحہ ۴۴ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۴۰ء)

لوٹ کھسوٹ کی یہ گرم بازاری کوئی عارضی قسم کا کاروبار نہیں تھا بلکہ ایک مستقبل پروگرام اور منصوبے کے مطابق ایک ایسی خطرناک قسم کی سیاسی "چور بازاری" تھی جو تیزی کے ساتھ انگلستان کے لئے ایک نوآبادی کی تشکیل کرتی چلی جا رہی تھی — اور ہندوستان کی دولت پر لگا کر سات سمندر پار پرواز کر رہی تھی۔ ڈاکٹر زین العابدین احمد نے کمپنی کی اس لوٹ کھسوٹ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"تجارتی اجاروں۔ سیاسی چالوں اور زمین پر گراں قدر محصولوں کے نتیجے میں کمپنی اس قابل ہو گئی کہ وہ ہر سال بڑی مقدار میں روپیہ انگلستان بھیجنے لگی اس طرح باقاعدہ دولت ہندوستان سے نکل کر انگلستان جانے لگی اندازہ لگایا گیا ہے کہ گزشتہ صدی کے شروع میں تیس لاکھ پاؤنڈ کی رقم ہر سال یہاں سے برطانیہ عظمیٰ کو جاتی تھی اور نجی طور پر جو روپیہ بھیجا جاتا تھا اسے ملا کر یہ رقم پچاس لاکھ پاؤنڈ تک پہنچ جاتی تھی یہ رقم نہایت سرعت کے ساتھ بڑھتی گئی اور ۱۸۳۴ء اور ۱۸۳۹ء کے درمیان تقریباً ۵۳،۴۷،۰۰۰ پاؤنڈ اور ۱۸۵۵ء اور ۱۸۵۹ء کے درمیان تقریباً ۷۷،۴۰،۰۰۰ پاؤنڈ سالانہ ہو گئی ہندوستان سے دولت کی اس قدر نکاس کے تباہ کن نتائج کا اندازہ ان راویوں سے ہو سکتا ہے جو برطانیہ

کے دورِ اول کے مدبرین اور اہلِ قلم نے ظاہر کی ہیں۔"

(صفحہ ۱۲ "ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض اقتصادی پہلو"
مطبوعات مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۳۹ء)

"چور بازاری" سے کمائی ہوئی اس اتھاہ دولت نے انگریزوں کی آتشِ حرص و آز کو اور بھی بھڑکا دیا۔ اب وہ مشرق میں کسی مغربی مفاد کو ایک آنکھ سے دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ انگلستان کی حکومت انھیں "بحری قزاقی" کا پروانہ پہلے ہی عطا کر چکی تھی اپنے نئے حریف (فرانس) کو میدانِ عمل میں دیکھ کر انگریزوں کے جذبۂ رقابت میں اور بھی آگ لگ گئی۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ اگر اس وقت انگلستان اپنے دوسرے حریفوں کے مقابلے پر "بحری برتری" نہ حاصل کر سکا تو مشرق میں اس کے قدم جمنا محال ہو جائے گا۔ سید طفیل احمد منگلوری نے "مسلمانوں کے روشن مستقبل" میں لکھا ہے۔

"سمندروں میں ان کی رقابت نہ صرف دیگر اقوامِ یورپ سے بلکہ خود انگریزی قوم کے قزاقوں سے رہتی تھی جن میں سے ایک طبقے نے تو "میڈاگاسکر" کو اپنا صدر مقام بنا کر بحرِ ہند کے سفروں کو مخدوش کر رکھا تھا۔ اس وجہ سے اہلِ یورپ کے تجارتی جہاز بہمہ وجوہ توپوں وغیرہ سے مسلح رہتے تھے ان حالات میں ان کی ٹکر سب سے اول عرب کے تاجروں اور ملاحوں سے ہوئی جن کے بیسیوں خاندان ساحلِ مالابار پر راجہ زیمورن کے زیرِ سایہ رہتے تھے اور جنھوں نے بالآخر ان کی بحری طاقت کا لوہا مانا اور تسلیم کر لیا کہ انھیں غیر یورپینوں کے پروانہ راہداری کے بحری سفر کا حق نہ تھا۔ نہ صرف عرب تاجروں اور ملاحوں کو بلکہ خود ہندی سلاطین کو اہلِ یورپ کی بحری برتری کا تجربہ ہوتا تھا چنانچہ اکبر و جہانگیر کے "جنگ" (یعنی جہاز) یورپ والوں سے پروانہ راہداری لے کر چلتے لیکن مغلوں کو کبھی محسوس نہ ہوا کہ یہ کمزوری ایک دن

ہندوستان کو بدیسیوں کا غلام بنا کر رہے گی خود جہانگیر کے عہد میں انگریزی کمپنی کو اپنی بحری قوت پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس نے ۱۶۲۳ء میں باقاعدہ جنگ کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس وقت فریقین کے درمیان بنائے مخاصمت یہ تھی کہ کمپنی کے لوگ تو یہ شکایت کرتے تھے کہ شاہی ملازم تجارتی مال درآمد پر محصول لینے میں سختی کرتے ہیں اور رشوتیں لیتے ہیں اور ہندوستانیوں کو یہ شکایت رہتی تھی کہ بدیسی تاجر ساحلی دیہات سے بچے پکڑے جاتے ہیں اور غلام بنا کر انھیں بیچ ڈالتے ہیں۔ ہندی تاجروں کے جہازوں کو سمندر میں لوٹ لیتے ہیں۔ ان باتوں پر جب دونوں میں لڑائی چھڑتی تو بدیشی تاجروں میں میدان میں لڑنے کی قوت تو تھی نہیں اس لئے وہ کوٹھیوں سے اپنا سامان ہٹا کر جہازوں پر لے جاتے اور سمندر میں ہندوستانی جہازوں کو خوب لوٹتے اور انھیں گرفتار کر لیتے۔

بالآخر ہندی تاجروں کی فریاد حکومت کو مجبور کر دیتی کہ کمپنی کے مطالبے پورے کر دے۔ اس نوع کی دو لڑائیاں ایک کلکتہ اور دوسری سورت والے انگریزوں نے اورنگ زیب سے لڑیں اور مغلیہ حکومت ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اسی طرح کمپنی کو احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت سے اور نیز مرہٹوں سے مخالفت کی نوبت آئی مگر کمپنی کا بال بیکا نہ ہوا۔

(صفحہ ۴۷-۴۸ مسلمانوں کا روشن مستقبل "نظامی پریس بدایوں")

انگریزوں کی اس "بحری برتری" اور کئی بار ہندوستان سے ٹکرا کر بچ نکلنے کی کامیابی نے ان میں ایک ایسی قوتِ فکر پیدا کر دی کہ وہ "ڈوپلے" کے سوچے ہوئے نقشوں کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گئے۔

مغلوں کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں کی صوبیداریاں

خود مختاری کا اعلان کر چکی تھیں دلّی کا تخت و تاج ہندوستان کی ایک سیاسی شطرنج بنتا چلا جا رہا تھا جس پر آئے دن نئے نئے مہرے جمائے اور ہٹائے جا رہے تھے۔ اور انگریز اس افراتفری کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

ادھر ہندوستان میں سازش کی سرنگیں بچھائی جا رہی تھیں۔ ادھر انگلستان میں ایک دوسرا گل کھل گیا۔ "جیمز اول" کی موت سے جو جگہ خالی ہوئی تھی اسے چارلس اول کے اعلان تخت نشینی سے پُر کیا گیا۔ وہی چارلس جس کے دور حکومت میں اندرونی انقلاب کی ایک زبردست لہر نے سارے انگلستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ پارلیمنٹ نے چارلس پر ملک دشمن اور ظالم ہونے کا جرم عاید کر کے اسے "وائٹ ہال" میں قتل کرا دیا اور اس کے بعد "کرامویل" ایک ڈکٹیٹر اور آمر کی حیثیت سے دو سال کے قریب حکمرانی کرتا رہا۔

چارلس اول نے تخت نشین ہوتے ہی ہالینڈ کی تجارتی کمپنی سے ساز باز کر کے انگلستان کی کمپنی کو طرح طرح سے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ چارلس نے انگلستان کی کمپنی سے ایک بہت بڑی رقم بطور قرض طلب کی کمپنی نے اپنی مالی مجبوریوں کا اظہار کرتے ہوئے چارلس کی خواہش کو پورا نہیں کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چارلس نے اجارہ داری کا وہ منشور منسوخ کر دیا جس کی رو سے مشرق میں صرف کمپنی کو تجارت کرنے کے حقوق حاصل تھے۔ اس فرمان کے منسوخ ہونے کا یہ اثر ہوا کہ انگلستان میں ایک دوسری کمپنی چارلس کی سرپرستی میں سامنے آ گئی۔ اس باہمی رقابت سے ہالینڈ نے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ انگلستان کی کمپنی کے پیر اُکھڑ گئے۔ چارلس کی مخالفت برابر مشکلات کے پہاڑ کھڑی کرتی چلی جا رہی تھی چنانچہ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے گھبرا کر کمپنی توڑ دینے کا اعلان کر دیا۔

اس اعلان منسوخی نے پہلی بار چارلس کو اپنی شدید غلطی کا احساس دلایا۔ لیکن اب اس کا علاج ہی کیا تھا۔ چارلس نے سوچا کہ اس موقع پہ مصلحت یہی ہے کہ

پرانی کمپنی کی مخالفت ترک کر دی جائے اور نئی کمپنی کی دلچسپیوں سے کنارہ کشی کر لی جائے تو یہ کشمکش ضرور ختم ہو جائے گی۔ چارلس کی یہ تدبیر غلط نہیں تھی اس کے خاموش ہوتے ہی دونوں کمپنیاں آپس میں متحد ہو گئیں مگر کمپنیوں کے حصہ داروں میں جو مخالفت پیدا ہو چکی تھی وہ دور نہ ہو سکی۔

چارلس اول کے قتل کے بعد "کرامویل" کے دور آمریت میں پھر ایک بار اسی قسم کا مد و جزر پیدا ہوا۔ اس نے بھی انگلستان کے نئے تاجروں کو ہندوستان سے تجارت کرنے کی آزادی دے کر چارلس اول کی غلطی کو دُہرانے کی کوشش کی لیکن جلد ہی ہوش میں آ گیا اور کمپنی کے پُرانے منشور کی تجدید کر کے ہندوستان کی تجارتی اجارہ داری اس کے لئے مخصوص رہنے دی۔

اورنگ زیب عالمگیر کا دور حکومت "مغل نظام سلطنت" کی آخری سانس تھی۔

"اس زمانہ میں کمپنی نے ہندوستان میں بہت سی زیادتیاں شروع کر دی تھیں سورت میں کمپنی نے اُدھم مچا رکھا تھا اورنگ زیب کے سپہ سالار نے انھیں سورت میں شکست دی۔ اس شکست کے بعد کمپنی کے ایک وفد نے اورنگ زیب سے اپنے گذشتہ افعال کی معافی مانگی اس پر اورنگ زیب نے کمپنی کو ایک فرمان دیا جس کی رو سے کمپنی کو مغلیہ سلطنت میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس فرمان میں شہنشاہ اورنگ زیب نے کمپنی کو اس بات کے متعلق آگاہ کر دیا کہ اگر اسے آیندہ صوبے داروں سے کوئی شکایت ہو تو اس کی اطلاع شہنشاہ کو دیا کرے۔

"درخواست اس مضمون کی مابدولت کے حضور میں آئی کہ جس قدر فساد برپا ہوا اس کے ذمہ دار تم ہو اور یہ کہ اس میں سراسر تم قصوروار ہو۔ تمھاری طرف سے مابدولت کو مابدولت کے صوبیداروں کے خلاف شکایات

موصول ہوئی تھیں۔ تمہیں یہ شکایت تھی کہ بابدولت کے صوبیداروں نے تمہارے ساتھ بدسلوکی کی۔ تمہیں لازم تھا کہ شورش برپا کرنے سے پہلے تم بابدولت کو تمام واقعات کی اطلاع دیتے۔ اب چونکہ تم اپنے جرم کو تسلیم کرتے ہو اس لئے اب نہ صرف گذشتہ واقعات کو معاف کرکے تمہاری درخواست ہی منظور نہیں کی جاتی بلکہ تمہاری التجا کے مطابق تمہیں ایک فرمان بھی دیا جاتا ہے۔ بابدولت نے اسد خاں کو حکم بھیج دیا ہے کہ وہ فرمان مذکور، سورت کے صوبیدار کے پاس بھیج دے۔ جب یہ فرمان تمہیں موصول ہو تم اس کا احترام کرو نیز آئندہ ایسی غلطی کا ارتکاب نہ کرنا۔ ہمیشہ بابدولت کی خوشنودی کے امیدوار رہو.........!

جب کمپنی کی ان بداعمالیوں کا پتہ چلا تو انگلستان میں اس کی مخالفت شروع ہوگئی چونکہ کمپنی دولت مند ہوچکی تھی اس لئے اس نے دولت سے اپنے مخالفوں کو چپ کرادیا پھر بھی اس کمپنی کا اجارہ ٹوٹ گیا اور اس کے مقابلے پر ایک نئی کمپنی میدان میں نکل آئی۔ لیکن ہندوستان انگریزوں کی دو کمپنیوں کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا دونوں کمپنیوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اس نقصان نے دونوں کو متحد کردیا اب "متحدہ ایسٹ انڈیا کمپنی" کے نام سے دوبارہ کاروبار شروع ہوا۔ اب کمپنی بادشاہ کی جگہ پارلیمنٹ کے ماتحت ہوگئی"۔

(صفحہ ۶۸-۶۹ "کمپنی کی حکومت" مکتبۂ اردو لاہور)

اٹھارہویں صدی میں مغل سلطنت کے متزلزل ہوتے ہی ایک طرف تو مرہٹوں نے سر اٹھایا دوسری طرف نادر شاہ کے حملے کا ردعمل شروع ہوگیا۔ بنگال میں علی وردی خاں روہیلکھنڈ میں روہیلے سردار۔ دکن میں نظام الملک اور اودھ میں برہان الملک

نے اعلان خود مختاری کردیا۔ لیکن دلی کی وفاداری سے ان کے دل اب بھی خالی نہ تھے خود مختار حکمراں بن جانے کے باوجود وہ اپنے آپ کو "مغل حکومت" کے زیر نگیں سمجھنے ہی میں فخر محسوس کرتے تھے۔

ان صوبوں کی خود مختاری نے اندرونی مشکلات کے کچھ اور مسائل بھی پیدا کردئے تھے نظام الملک کی وفات کے بعد کرناٹک ایک علٰحدہ صوبہ بن گیا۔ لیکن اس نومولود صوبہ میں بھی دو حقدار آپس میں دست و گریباں نظر آتے تھے۔ مدراس میں انگریز اور پانڈیچری میں فرانسیسی اسی موقع کے منتظر بیٹھے تھے۔ "ڈوپلے" ایک فریق کا حلیف بنا تو دوسرے کو انگریزوں نے گلے لگایا۔ آرکاٹ میں آگ و خون کی بارش ہوئی انگریزوں کا حلیف محمد علی کرناٹک کا نواب بن گیا۔

آرکاٹ کی یہ لڑائی کرناٹک کے دو نوابوں کی لڑائی نہیں تھی بلکہ ہندوستان میں انگلستان اور فرانس کی وہ پہلی جنگ تھی جس کے نتیجے نے انگریزوں کے حوصلے بڑھا دئے اور انھیں پہلی بار اچھی طرح یہ محسوس ہوگیا کہ ہندوستان کے تخت و تاج کو قابو میں لانا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ ہندوستانی اُمرا اور رئیسوں کی شمشیر زنی کی جو ہیبت ناک کہانیاں اب تک انھوں نے سُنی تھیں ان کا خوف و ڈر بھی ان کے دلوں سے دور ہوگیا اور انھوں نے ہندوستان میں پہلی بار اس یقین کو اپنے دل کی گہرائیوں میں سمو لیا کہ ہندوستان طاقت سے نہیں سازشوں اور چالوں سے فتح کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ۱۷۵۷ء کی "جنگ پلاسی" اسی یقین کی پہلی تجربہ گاہ ثابت ہوئی۔

پلاسی کی جنگ جس نے ہندوستان میں انگریزی رواج کی بنیاد ڈالی تھی سفید فام تاجروں نے اسے ایک ملکی لڑائی کے طور پر نہیں لڑا تھا نہ اس جنگ میں انگلستان کے سورماؤں نے میدان جنگ میں اگر شجاعت و جوانمردی کی کوئی ایسی داد تھی جس پر تاریخ فخر کرسکتی ہے۔ یہ لڑائی حقیقتاً سازشوں اور غداریوں کا ایک ایسا جال تھا جس کے

پھندے خود ہم نے اپنی گردنوں میں پہن لئے تھے۔ "فرکلائیو" جعفر کی غداری سراج الدولہ کے درباریوں کی ناپاک سازش اور بنگال کے "جینی بنیوں" کی وطن دشمنی یہی سب کچھ تھا جس نے مل جل کر ہندوستان میں بدیسی سامراج کو پروان چڑھا دیا میر جعفر تو جلد ہی اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے اور ہندوستان کی آزادی کا خون ناحق رنگ لاکر رہا تین کروڑ اکسٹھ لاکھ سات سو پچاس (30610750) روپیہ رشوت دینے کے باوجود کمپنی نے ان کو چین نہ لینے دیا۔ غداری کی موت مرے اور بنگال کی تاریخ انھیں آج بھی "خرکلائیو" سے زیادہ درجہ نہ دے سکی۔ لیکن بنگال کے "بنیوں" نے کمپنی سے ساز باز کرکے جس بیدردی کے ساتھ ملک و قوم کو لوٹا تاریخ ان واقعات کے منہ پر آج بھی ہاتھ رکھے ہوئے ہے حالانکہ ہندوستان میں انگریزوں کے قدم مضبوط کرنے کا جو اہم کام ان "بنیوں" نے انجام دیا غداری کے اس مرتبہ پر نہ تو دکن کے صادق پہنچے ہیں نہ بنگال کے جعفر ـــ اور نہ اودھ کے علی نقی خاں!

"یہ بنیے ان قدیم خاندانی ساہوکاروں سے مختلف تھے جن کے تعلقات پرانے نوابوں اور سرکاروں کے ساتھ پشتہا پشت سے چلے آتے تھے اور جن کے وہ خیرخواہ تھے اور کمپنی کے لوگوں کی دسترس سے باہر تھے اس لئے وہ اپنے چھوٹے ملازموں سے بازاروں میں خرید و فروخت میں مدد لیتے تھے اور انھیں کی دلالی سے فائدے اٹھاتے تھے پس جب کمپنی نے تجارت سے آگے بڑھ کر حکومت کے کوچے میں قدم رکھا تو سب سے زیادہ یہ دلال اور ملازم بنیے ہی ان کے لئے کارآمد ہو سکتے تھے چنانچہ وہ کارآمد ثابت ہوئے اور رفتہ رفتہ خود صاحب لوگوں پر حاوی ہو گئے بالخصوص نو وارد انگریز جنھیں ابتدا میں تھوڑی تنخواہیں ملتی تھیں ان بنیوں کے دست نگر ہوتے تھے کیونکہ وہی ان کی نجی تجارت کے کارکن

ہوتے تھے اور ضرورت کے وقت انھیں قرض دیتے تھے پس جب یہ انگریز بڑے عہدوں پر پہنچے تو قدرتی طور پر انھیں دل کھول کر نوازتے تھے ان تعلقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلکتہ میں فورٹ ولیم کے گرد ان بنیوں کی ایک معقول آبادی ہو گئی جن میں سے بعض اپنی دولت و ثروت کی بدولت حکومت کے انقلابات میں حصہ لیتے تھے مسٹر برک نے ان کا ذکر کرتے ہوئے ایک مرتبہ لکھا تھا۔

"بنیا یا دیوان انگریز کے گھر کا منتظم ہوتا تھا وہ تمام چالبازیوں۔ فریب اور عیاریوں سے واقف ہوتا ہے جو مظالم سے بچنے کے لئے ایک غلام استعمال کرتا ہے بنیا لوٹتا ہے۔ استحصال بالجبر کرتا ہے۔ غارت گری کرتا ہے اور پھر اس میں جس قدر مناسب سمجھتا ہے اپنے صاحب کو بھی دے دیتا ہے۔ ان بنیوں نے بڑے بڑے گھرانے الٹ دیئے۔ ملک کو برباد کر دیا اور سرکاری مالگذاری کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔

(صفحہ ۶۳-۶۴۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل")

انگریزوں کی بنائی ہوئی تاریخیں پورے دو سو سال سے ان وطن فروش سیاہ کار "بنیوں" کی وطن دشمنی کی پردہ پوشی کرتی چلی آ رہی ہے پروپیگنڈے کے ان تمام خوبصورت حربوں کو اس سلسلہ میں استعمال کیا گیا جن سے ان بنیوں کی ملت فروشی اور وطن دشمنی سے بھرے ہوئے کارنامے آج بھی اپنے صحیح خد و خال میں نظر نہیں آتے حالانکہ حقیقت یہی ہے کہ ہندوستان میں بدیسی سامراج کی جڑیں میر جعفر اور صادق سے کہیں زیادہ ان "بنیوں" نے مضبوط کیں۔ غریب عوام کا خون چوسنے والی انگریزی ایجنٹوں کی یہ ٹولی وہی تھی جس نے میر جعفر سے پہلے ملک و وطن کا سودا ایسٹ انڈیا کمپنی سے کر لیا تھا ایک مستقل سکوت کے باوجود تاریخ

آنا بتانے میں آج بھی ناکام نہیں رہی ہے کہ علی وردی خاں کی آنکھ بند ہوتے ہی کلکتہ میں سازشوں کا جو شرمناک جال بچھایا گیا تھا اس کی قیادت اور رہنمائی کا سہرا غدار جعفر کے سر نہیں تھا بلکہ اس کے پس منظر میں بنگال کے یہی "جینی بنئے" رقص کناں تھے۔

۱۷۹۳ء میں پارلیمنٹ نے کمپنی کے ایک معاہدہ کی اور تجدید کر دی جس کی رو سے کمپنی کو مزید بیس سال تک ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجارہ داری مل گئی۔

"اس فرمان میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ انگریز قوم کمپنی کی دراندازانہ حکمت عملی اور اس کی نصرت جویانہ سرگرمیوں کو اپنی خواہش اور عزت کے خلاف خیال کرتی ہے۔ پارلیمنٹ کا یہ اعلان ہندوستان کے ساتھ ہمدردانہ جذبات کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ انقلاب فرانس کی ان موجوں کی روک تھام کے لئے تھا جو ساحل انگلستان سے ٹکرا رہی تھیں نیز اس وقت اس امر کی اشد ضرورت تھی کہ انگلستان کو دنیا کے سامنے ایک امن پسند ملک پیش کیا جائے۔

۱۷۹۳ء میں کمپنی کی تجارتی اجارہ داری کے خلاف زبردست تحریک جاری تھی لیکن پارلیمنٹ نے جدید فرمان منظور کر لیا۔

(صفحہ ۱۷۵ کمپنی کی حکومت)

ممکن تھا انگلستان کی پارلیمنٹ اس مسئلہ کو کسی اور انداز پر حل کرنے کی کوشش کرتی لیکن یہ زمانہ وہی تھا جب نپولین اعظم نے یورپ کی تمام تجارتی منڈیوں کے دروازے انگریزوں پر بند کر دئے تھے اور انگریز تاجر بری طرح دیوالئے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس لئے پارلیمنٹ نے اس مسئلہ پر خاص طور سے غور کر کے انگریز تاجروں کو عام طور پر ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت دے دی کمپنی کے حصہ داروں نے پارلیمنٹ کی بہت مخالفت کی لیکن انگلستان کی رائے عامہ کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور ۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاوہ تمام انگریز تاجروں

ہندوستان سے تجارت کرنے کی عام اجازت کا قانون پاس کر دیا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا دو سو سالہ دور تجارت ہندوستان کی تاریخ کا سب سے گھناؤ زمانہ کہا جا سکتا ہے جس کے آغاز سے لے کر انجام تک مکاریوں۔ دغابازیوں۔ سازشوں۔ بے ایمانیوں اور نفع اندوزیوں کا ایک جال بچھا ہوا نظر آتا ہے۔

مسز اینی بسینٹ نے "ہندوستان کی کوشش آزادی کے لئے" کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

"کمپنی والوں کی جنگ سپاہیوں کی جنگ نہ تھی بلکہ تاجروں کی جنگ تھی ہندوستان کو انگلستان نے اپنی تلوار سے فتح نہیں کیا بلکہ خود ہندوستانیوں کی تلوار سے اور رشوت و سازش و نفاق اور حد درجہ دو رخی پالیسی پر عمل کر کے اور ایک جماعت کو دوسری جماعت سے ٹکرا کر اس نے یہ ملک حاصل کیا"۔

کمپنی کے اس دور حکومت کا خاتمہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ملکہ وکٹوریہ کے اس "اعلان امن و امان" نے کیا جو ملکہ کا فرمان کہا جاتا ہے اور یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو جاری کیا گیا تھا۔

اُردو کمپنیوں کے ہنگامی دَور میں

تمدن، تہذیب اور زبانوں نے صرف "بزم" کے دامن ہی میں نشو ونما اور ارتقاد حاصل نہیں کی بلکہ کارزار "رزم" بھی ان کی "جھم جھوم" رہی ہے۔ ترکی زبان کا لفظ "اردو" ہی اس حقیقت کا مظہر ہے کہ یہ زبان ہندوستان کے ان مختلف فرقوں، عقیدوں، قوموں اور نسلوں کے اس میل جول کا قدرتی نتیجہ ہے جو اکبر اعظم کی "ہندوستان گیر" فوجوں نے مختلف قوموں کے امتزاج سے پیدا کی تھی۔

کمپنیوں کے اس دو ڈھائی سو سالہ ہنگامی دَور میں بھی ہندوستان کی تہذیب وتمدن نے ایک انقلابی کروٹ لی۔ سیاسی طور پر تو ہندوستان ہر طرح سے موت کے منہ میں سسکیاں لیتا رہا مگر مغرب کے بحری "قزاقوں" نے ہندوستان کی تہذیب ومعاشرت پر کچھ اچھے اثرات بھی ڈالے خصوصاً اُردو زبان کا وہ پودا جو صدیوں سے کم روی کے ساتھ آہستہ آہستہ نشو ونما پا رہا تھا ان چند صدیوں میں اچھی خاصی تیز رفتاری کے ساتھ بڑھتا گیا اگرچہ شمالی اور جنوبی ہندوستان میں اُردو نظم کا کارواں نثر کے میدان تک پہنچ چکا تھا اور کچھوچھہ شریف (اودھ) کے خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کا "رسالہ اخلاق وتصوف" ۷۵۸ھ/۱۳۰۸ء میں تصنیف کیا جا چکا تھا اس کے بعد ہی بہمنی دَورِ حکومت میں جنوبی ہند کے شیخ عین الدین گنج العلم (ولادت ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء وفات ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء) کئی دینی رسائل اُردو زبان میں تصنیف کر چکے تھے جنھیں دکھنی ہندوستان میں اُردو کی پہلی نثری تصانیف کا درجہ دیا گیا ہے حضرت خواجہ سید

اشرف جہانگیر سمنانی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "امیر خسرو کے ہمعصر ہونے کے باوجود وہ ان سے عمر میں ۳۵ سال چھوٹے تھے اور عمر کے اس تفاوت کا فطری قیاس یہ قرار دیا گیا کہ ان کا رسالہ "اخلاق وتصوف" امیر خسرو کی "خالق باری" کے بعد تصنیف ہوا ہوگا"۔ یہ قیاس تاریخ کی بنیادی حقیقتوں سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا کیونکہ ابھی تک تاریخ یہ بتانے میں ناکام رہی ہے کہ "خالق باری" کا سن تصنیف کیا ہے؟ اس کے برعکس رسالہ "اخلاق وتصوف" کے سن تصنیف کا زمانہ ۷۵۸ھ/۱۳۰۸ء متعین کیا جا چکا ہے۔ میر نذر علی درد کاکوروی نے اس رسالہ اخلاق وتصوف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"سید اشرف جہانگیر نے اپنے سلسلہ کے ایک بزرگ مولانا وجیہ الدین کے ارشادات کو اُردو زبان میں (جس کو اس زمانے میں زبان ہندی کہا کرتے تھے) خود جمع کیا ہے میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ صفحہ کی ہے اس کے صفحہ ۱۱۰ کی ایک عبارت کا ٹکڑا یہ ہے۔

"اے طالب آسمان وزمین سب خدا میں ہے۔ ہو سب میں خدا ہے جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات"

(ماہنامہ نگار لکھنؤ بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۵ء)

پروفیسر سید حامد حسن قادری بھی شمالی ہند کی اس پہلی نثری تصنیف کو اُردو نثر کا پہلا زمانہ تصور فرماتے ہیں:۔

"اب تک ارباب تحقیق متفق الرائے تھے کہ شمالی ہند میں اٹھارہویں صدی عیسوی (بارھویں صدی ہجری) سے تصنیف وتالیف نثر کا کوئی وجود نہ تھا یہ فخر دکن کو حاصل ہے، وہاں شمالی ہند سے چار سو برس پہلے اردو تصانیف

کا آغاز ہوا۔ اب سید اشرف جہانگیر کے رسالہ تصوف کی دریافت سے وہ نظریہ باطل ہوگیا اور ثابت ہوگیا کہ دکن میں اُردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسرو اور سید اشرف جہانگیر نے نظم و نثر دونوں کی بنیاد ڈالی تھی۔"

(صفحہ ۱۷-۱۸۔ داستان تاریخ اردو۔ مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ سنہ ۱۹۵۷ء)

دکھنی ہند میں اُردو نثر کا تصنیفی دور "بہمنی سلاطین" کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ شیخ عین الدین گنج العلم رہنے والے تو دلی ہی کے تھے یہیں علاؤالدین خلجی کے عہد حکومت (سنہ ۱۳۰۶ء) میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں تحصیل علم کی جستجو گجرات لے گئی اور وہیں سے دولت آباد (دکن) پہنچے جسے سنہ ۱۳۲۶ء میں سلطان محمد تغلق نے دہلی اجاڑ کر اپنا دار السلطنت بنایا تھا۔ شیخ گنج العلم کچھ دنوں دولت آباد میں رہ کر بہمنی حکومت کے دار الخلافہ "بیجاپور" گئے اور وہیں سنہ ۱۳۹۳ء میں سپرد خاک کیے گئے۔

"شیخ صاحب کثیر التعداد فارسی کتابوں کے مصنف ہیں۔ دکنی اُردو میں بھی چند مختصر رسالے مسائل شرعیہ کے متعلق تصنیف فرمائے۔ دکن میں اردو زبان کی سب سے پہلی کتابیں بھی ہیں لیکن یہ رسائل اب نایاب ہیں۔"

(صفحہ ۳۱ داستان تاریخ اُردو)

شیخ عین الدین گنج العلم کے متعلق اس سے بھی زیادہ تفصیلات ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری نے فراہم کی ہیں لکھتے ہیں:-

"شیخ عین الدین دہلی میں ۷۰۶ھ میں پیدا ہوئے وہ بچپن ہی میں ترک وطن کر چکے تھے ان کی تعلیم و تربیت گجرات میں ہوئی یہاں سے وہ دولت آباد میں وارد ہوئے جو ان دنوں محمد تغلق کا پایہ تخت ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے عالموں اور ادیبوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں عین الدین نے حضرت "سید خوندمیر" کے ہاتھ پر بیعت کی اور شیخ شمس الدین سے علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ ۷۲۶ھ میں

وہ "عین آباد" روانہ ہوئے اور وہاں ایک مدت قیام کیا۔ وہ بڑے بلند پایہ عالم تھے اور اپنے اعلیٰ علمی ہی کی وجہ سے "گنج العلم" کے لقب سے مشہور تھے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مختلف علوم و فنون پر تقریباً "۱۳۲" کتابیں لکھی ہیں ان کا ایک نہایت مشہور کارنامہ "تاریخ طبقات ناصری" مصنفہ قاضی منہاج الدین کا خلاصہ ہے۔

ان کی نسبت مشہور ہے کہ دکھنی (اردو) میں چند چھوٹے چھوٹے رسالے تصنیف کئے تھے ان میں سے تین کے مخطوطے کہتے ہیں کہ "فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس" کے کتب خانے میں محفوظ تھے ان رسائل کی ضخامت صرف (۴۰) صفحے بتائی جاتی ہے اور وہ مذہبی موضوعات پر لکھے گئے تھے۔"

(صفحہ ۱۸-۱۹ "اُردو شہ پارے" مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۲۹ء)

شمالی اور دکھنی ہندوستان میں اُردو کی مستقل تصانیف کی حیثیت سے نثر میں یہی کتابیں ملتی ہیں البتہ نظم کا ذخیرہ اس سے کہیں زیادہ صدیوں پہلے موجود تھا جسے اُردو ادب کی تاریخ نے ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے کافی شرح و بسط کے ساتھ پیش کر دیا ہے جسے میں اس لئے نظر انداز کر رہا ہوں کہ یہ میرا موضوع نہیں ہے۔

شمالی ہند میں نویں صدی ہجری اُردو نثر کی تصنیفی سرگرمیوں سے کچھ زیادہ قریب نظر نہیں آتی لیکن دکھنی ہندوستان میں نثر کے کچھ مستقل نمونے ضرور ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں "دکھنی اردو" کی تحریک تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی "شیخ گنج العلم" کے بعد اس سلسلہ میں سب سے پہلے "حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی گیسو دراز" کا نام لیا جاتا ہے جو سنہ ۱۳۲۰ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے تھے اور اپنے پیر حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کے فیوض روحانی سے علوم باطنی حاصل کئے سنہ ۱۴۱۲ء میں "بعہد فیروز شاہ بہمنی" حسن آباد (گلبرگہ) پہنچے اور سنہ ۱۴۲۲ء میں

ہیں اللہ کو پیارے ہوئے۔

"معراج العاشقین" جو اس دور کا ممتاز اُردو شاہکار سمجھا جاتا ہے اس میں تقریباً ۲۳۴ سطروں کی ایک عبارت تصوف کے مسائل پر اُردو میں پائی جاتی ہے "تاریخ زبان اُردو" (یعنی اُردوئے قدیم) میں حکیم سید شمس اللہ قادری نے ان کی اُردو نثر کا یہ نمونہ "معراج العاشقین" سے پیش کیا ہے۔

"محمد ہوا اللہ کے درمیاں پردہ باندے۔ اسے نقاب کبریا بولتے ہیں۔ عرفان کرسی پر محمد کون (کو) سلاکے۔ اللہ۔ محمد باتاں (باتیں) کرتے عشق کون (کو) لائے عشق مشاطہ ہوکر عاشقاں کے باتاں (باتیں) معشوق کون (کو) معشوق کے باتاں عاشق کون (کو) سناے۔ اللہ سے آواز آیا۔ اے محمد یک لک چوبیس ہزار (ایک لاکھ چوبیس ہزار) پیغمبراں میرے طلب نین (نہیں) کیا۔ ہیں ان کو (کون) طلب نین (نہیں) کیا۔ تیرا فراق مجھے بہوت (بہت) ہوا۔ میں تجھے اس راہ ہو کر لیا۔ اپنے معراج کیاں (کی) نشانیاں میں تجھے دیتا ہوں۔ نشانیاں (نشانی) میریاں (میری) باتاں (باتیں) سُن کہ تیری امت کون (کو) میرے بندیاں (بندوں) کون (کو) خبر دیتا ہوں۔"

(صفحہ ۵۴ "تاریخ زبان اردو" مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۰ء)

ان دو تین بنیادی اور ابتدائی کتابوں کے بعد بھی چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں اُردو کی نثری تصانیف کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ملتا ہے جس میں بہت سے مخطوطات دکھنی ہندوستان کی نثری تخلیق سے تعلق رکھتے ہیں۔

سلاطین "عادل شاہی" جن کا دورِ حکومت ۱۴۹۰ء سے لے کر ۱۶۸۶ء تک رہا ہے دکھنی اردو کی نشو ونما میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

"اکثر شاہان بیجاپور خود عالم وشاعر اور قدردان تھے سلاطین بہمنی نے

اُردو کو دفتری زبان بنا دیا تھا۔ عہد عادل شاہی کے پہلے اور دوسرے بادشاہ نے پھر اُردو کی جگہ فارسی کو رواج دیا اور تقریباً پچاس سال تک دفتر پر فارسی کی حکومت رہی لیکن ابراہیم عادل شاہ اول (۱۵۳۴ء/۹۴۱ھ تا ۱۵۵۷ء/۹۶۵ھ) نے مصالح ملکی کے لئے "اردو" ہی کو موزوں سمجھا اور بجائے فارسی کے دوبارہ اُردو کو رائج کردیا۔"

(صفحہ ۴۳-۴۴۔ داستان تاریخ اردو)

اس زمانے تک دکن میں اُردو عام ہوچکی تھی۔ نظم کے مقابلے میں نثری تصانیف بہت کم ملتی ہیں پھر بھی ان صدیوں کا دامن نثری تصانیف سے خالی نظر نہیں آتا جس کا مختصر تذکرہ پیش کررہا ہوں۔

(۱) شمس العشاق شاہ میراں جی (وفات ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء) حضرت خواجہ گیسو دراز کے خلیفہ کے خلیفہ سے بیعت تھے ان کی نثری تصانیف میں "شرح مرغوب القلوب"، "جل ترنگ" اور "گل باس" کے مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں پہلے رسالہ کا نمونہ یہ ہے۔

خدا کہیا۔ تحقیق مال اور بیگڑے (اولاد) تمھارے دشمن ہیں چھوڑو یو (ان) دشمناں (دشمنوں) کون (کو) اے (یہ) کیا غفلت ہے جو تجھے اندھلا (اندھا) کیا موت کی یاد تے (سے) تجھے بسراکر (بھلاکر)

(صفحہ ۴۳۔ داستان تاریخ اُردو)

(۲) شاہ برہان الدین جانم۔ (وفات ۱۵۸۲ء) کے بعد شاہ میراں جی صاحبزادے تھے نثر میں رسالہ "حکمۃ الحقائق" کا وجود ملتا ہے۔

(۳) شاہ امین الدین اعلیٰ (وفات ۱۶۷۵ء) شاہ برہان الدین جانم کے فرزند تھے۔ نثر میں کئی رسالے لکھے ہیں ایک رسالہ کا نام "گنج مخفی" ہے اس کی زبان کافی آسان ہے۔

(۴) شاہ میران جی خدا نما۔ اصل نام سید میران حسینی تھا۔ خاص حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔ عبداللہ شاہ والیٔ گولکنڈہ کے عہد حکومت (۱۶۲۵ء تا ۱۶۷۲ء) میں سرکاری ملازم بھی رہے تھے۔ انھوں نے "تمہیدات عین القضاۃ" مصنفہ عین القضاۃ ہمدانی کا اُردو ترجمہ "شرح تمہید ہمدانی" کے نام سے کیا ہے۔ گراہم بیلی نے شاہ صاحب کا سن وفات ۱۶۵۹ء لکھا ہے مگر مولوی عبدالحق کے نزدیک ۱۶۷۳ء میں رحلت کی۔

(۵) عبداللہ۔ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں گذرے ہیں ۱۶۴۲ء میں فقہ حنفی پر ایک رسالہ "احکام الصلوٰۃ" کے نام سے دکھنی اُردو میں لکھا۔

(۶) ملا وجہی۔ قطب شاہی دورِ حکومت کا ملک الشعرا اور مصنف۔ جس نے چار قطب شاہی بادشاہوں (ابراہیم قلی قطب شاہ محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ) کا زمانہ دیکھا تھا۔ وجہی نے عبداللہ قطب شاہ کے زمانے (۱۶۳۵ء) میں "سب رس" لکھی تھی جسے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے۔ سب رس جس کا دوسرا نام "قصۂ حسن و دل" ہے قطب شاہی عہد سلطنت میں دکھنی اردو کا نثری شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

سب رس کا ماخذ مشہور فارسی نظم "دستور فتاحی" بیان کی جاتی ہے جسے ایران کے مشہور شاعر محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری (وفات ۱۴۴۸ء) نے نظم کیا تھا۔ فتاحی کی اس نظم کے ترجمے انگریزی اور جرمنی زبانوں میں بھی کئے گئے ہیں۔

(۷) میران یعقوب۔ شیخ برہان الدین اورنگ آبادی کی مشہور ضخیم کتاب "شمائل الاتقیاء" کا اُردو ترجمہ ۱۶۶۷ء کے بعد میران یعقوب نے کیا۔ جس میں تصوف کے بہت سے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ دکھنی اُردو میں اس کتاب کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔

(۹) سید محمد شاہ قادری۔ شہنشاہ اورنگ زیب کی فتوحات دکن ۱۶۸۶ء کے بعد انھوں نے تصوف کے کئی رسائل اُردو زبان میں لکھے۔ سید محمد شاہ قادری رائچور کے صوفی مشرب خاندان "نور دریا" کے ایک خاص فرد تھے اور حضرت شیخ امین الدین اعلیٰ کے خلیفہ۔!

(۱۰) شاہ ولی اللہ قادری (ابن شاہ حبیب اللہ قادری) نے [۱۷۴۲ء] میں شیخ محمود کی فارسی کتاب "معرفت السلوک" کا اُردو ترجمہ کیا۔ یہ کتاب بھی تصوف اور معرفت کا گراں قدر باب کہی جاتی ہے۔

شاہ ولی اللہ قادری کا انتقال [۱۷۴۴ء] میں ہوا۔

(۱۱) سید شاہ میر۔ قصبہ رانچور کے رہنے والے تھے۔ تقریباً اسی دور میں گذرے ہیں جو زمانہ شاہ ولی اللہ قادری کا بتایا جاتا ہے۔ انھوں نے اُردو میں رسالہ "اسرار توحید" لکھا جس کا موضوع بھی غالباً تصوف ہے۔

(۱۲) قادری۔ ضیاء الدین نخشبی بدایونی (وفات [۱۳۵۰ء]) نے سنسکرت کی ستر کہانیوں میں سے منتخب کر کے فارسی کا جامہ پہنایا تھا اور "طوطی نامہ" نام رکھا تھا گیارھویں صدی ہجری میں بدایونی کے اس طوطی نامہ کی ۲۵ کہانیوں کو ملا سید محمد قادری نے آسان اور بامحاورہ فارسی میں منتقل کیا تھا۔ سید محمد قادری کے اس طوطی نامہ کا اُردو ترجمہ [۱۶۳۹ء] میں کیا گیا۔ لیکن اب تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اُردو ترجمہ کرنے والے کا نام کیا ہے۔ مولانا احسن مارہروی نے اس سے اختلاف کیا ہے کہ "طوطی نامہ" کے اُردو مترجم کا نام قادری ہے۔

اس کتاب کا ایک مخطوطہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے جس سے بھی اصل مترجم کے نام و نشان کا پتہ نہیں چلتا۔

(۱۳) محمد باقر آگاہ۔ صوبہ مدراس کے رہنے والے تھے [۱۸۰۵ء] میں وفات [۱۲۲۰ھ]

پائی۔ ۱۸۶۸ء میں انھوں نے عقائد دینی اور فقہ کے متعلق اردو کے کئی رسائل لکھے ہیں۔

(۱۴) شرف الملک مولانا محمد غوث۔ نواب آرکاٹ کے مدار المہام سلطنت اور ایک بلند پایہ عالم گذرے ہیں ۱۸۲۳ء (۱۲۳۸ھ) میں وفات پائی ان کی تصانیف میں "کیدانی" کی فقہ حنفیہ کا اردو ترجمہ یادگار ہے۔ یہ محمد باقر آگاہ کے معاصرین میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۱۵) قاضی بدر الدولہ (ولادت ۱۷۹۳ء (۱۲۰۵ھ) وفات ۱۸۶۳ء (۱۲۸۰ھ)) شرف الملک کے صاحبزادے تھے۔ انھوں نے اردو زبان میں ۱۳ کتابیں لکھی ہیں جن میں فقہ شافعی۔ سیرت نبی کریم۔ سیرت صدیق اکبر۔ سیرت شیخ عبدالقادر جیلانی۔ تفسیر قرآن۔ ترجمہ و حواشی تفسیر مشہور کتابیں ہیں۔ بدرالدولہ دربار آرکاٹ کی طرف سے منصب قضاء پر فائز تھے۔

( ) سیوا۔ گلبرگہ کا رہنے والا تھا۔ سلطان علی عادل شاہ کے زمانے میں بیجاپور پہنچا۔ ۱۶۸۱ء میں اس نے فارسی "روضۃ الشہداء" کا اردو ترجمہ کیا جس کا ایک نسخہ ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔ (صفحہ ۵۷ اردو شہ پارے)

(۱۶) فضل علی فضلی۔ ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب "روضۃ الشہداء" کا اردو ترجمہ "دہ مجلس" (کربل کتھا) کے نام سے ۱۷۴۷ء (۱۱۶۰ھ) میں کیا۔ فضلی کے متعلق مورخین میں اختلاف رائے ہے کہ یہ دکھنی ہند کا رہنے والا تھا یا شمالی ہندوستان کا۔ مولانا احسن مارہروی نے ڈاکٹر نیلن اور مولوی کریم الدین سے اختلاف رائے کرتے ہوئے اس کا نام "فضل علی" کے بجائے "فضل اللہ" لکھا ہے اور عقائد کے لحاظ سے بھی "شیعہ" کے بجائے "حنفی نقشبندی" ظاہر کیا ہے۔

(۱۷) محمد حسین عطا خاں تحسین۔ فارسی کے مشہور قصہ "چہار درویش" کا اردو ترجمہ ۱۷۷۵ء سے قبل "نو طرز مرصع" کے نام سے کیا ہے جو میر امن دہلوی کے

"باغ و بہار" کے قالب میں آنے کے بعد کافی مقبول و مشہور ہوئی۔

تحسین۔ اٹاوہ کے رہنے والے تھے والد کا نام محمد باقر خاں شوق تھا۔ جنرل اسمتھ کے میر منشی کی حیثیت سے ایک دریائی سفر میں ان کے ساتھ تھے۔ کسی نے سفر بہلانے کے لئے یہ فارسی قصہ شروع کیا۔ انھیں بہت پسند آیا۔ چنانچہ انھوں نے اس فارسی قصہ کو اردو نثر میں لکھ ڈالا۔

کچھ دنوں کے بعد یہ انگریزوں کی ملازمت سے الگ ہوکر نواب شجاع الدولہ کے دربار میں جا پہنچے۔ کہا جاتا ہے کہ تحسین نے اس اردو ترجمہ کی تکمیل نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں کر ڈالی تھی جیسا کہ اس کے انتساب سے ظاہر ہوتا ہے جو نواب آصف الدولہ (جن کی مسند نشینی ۱۷۷۵ء میں ہوئی) کے نام کیا گیا ہے۔

"نو طرز مرصع" صرف دو تین بار بمبئی اور کانپور وغیرہ میں شائع ہوئی۔ اس کے دو قلمی نسخے برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔

(۱۸) محمد عوض زریں۔ انھوں نے بھی "نو طرز مرصع" کی طرح فارسی قصہ "چہار درویش" کا اردو ترجمہ کیا اور اس کا نام بھی نو طرز مرصع ہی رکھا لیکن اس کی تاریخ "باغ و بہار" سے نکالی۔ زریں کی "نو طرز مرصع" تحسین کی طرح مقبول نہ ہو سکی اگرچہ اس کا طرز بیان کافی سیدھا سادہ اور بے تکلف ہے۔ زریں کی یہ کتاب بھی تقریباً اسی زمانے میں پہلی بار شائع ہوئی جب میر امن دہلوی کی باغ و بہار چھپی تھی۔

یہ ہے ان قابل ذکر کتابوں کا مختصر حال جو فورٹ ولیم کالج قائم ہونے سے پہلے لکھی گئی تھیں اور ان میں اکثر و بیشتر کتابیں ایسی ہی ہیں جن کا تعلق ادب سے کم ہے مذہب اور طریق و مسلک سے زیادہ۔ لیکن ان کتابوں کی تاریخی افادیت سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جو اردو زبان کے تین سو سالہ ارتقائی

دور کی ترجمانی کر رہی ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے آخری زمانے میں قرآن پاک کے دو اردو ترجمے بھی ملتے ہیں جنھیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے صاحبزادے مولوی شاہ رفیع الدین (ولادت ۱۱۶۳ھ وفات ۱۲۳۳ھ) اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر (ولادت ۱۱۶۷ھ وفات ۱۲۳۰ھ) نے کیا تھا۔ یہ ترجمے اگرچہ اردو زبان کی تاریخ سے یک گونہ لگاؤ ضرور رکھتے ہیں لیکن ان کی علمی زبان بہرحال ایک ایسا اندازِ بیان رکھتی ہے جسے عوام کی زبان کہنا دشوار ہے۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے حضرت شاہ رفیع الدین کے "ترجمۂ قرآن" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

"ترجمہ اس قدر لفظی اور بے محاورہ اور دشوار فہم ہے کہ ہمارے زمانے میں کیا۔ اس زمانے میں بھی بول چال کی زبان ایسی نہ تھی۔"

(صفحہ ۵۰ داستان تاریخ اردو)

اسی طرح حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمے کے متعلق یہ رائے بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔

"اٹھارہویں صدی کے اختتام کے قریب (سنہ ۱۷۹۰ء) اردو نثر کا پہلا نمونہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن شریف شائع ہوتا ہے گو چونکہ اس کے مصنف نے عربی محاورات والفاظ واستعارات کی اندھا دھند تقلید کی ہے اس واسطے یہ ترجمہ تصانیف ادبیہ میں شمار کئے جانے کا مستحق نہیں ہے۔"

(صفحہ ۹۴ انتخاب مخزن حصہ اول مطبوعہ عالمگیر پریس لاہور)

مطبوعات شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور

نثر کی ان کتابوں میں زیادہ تر فارسی اور عربی کتابوں کے ترجمے نظر آتے ہیں۔

اردو کے ابتدائی دور میں اکثر مثنویاں اور نظمیں بھی فارسی حکایات و مضامین سے تلخیص کی جاتی تھیں اسی لئے ہمیں تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ نہ محسوس کرنا چاہئے کہ ان ہنگامی صدیوں میں اردو نظم و نثر کے تصنیفی شعور میں پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک اردو زبان نہ تو صحیح معنوں میں عوام کا درجہ حاصل کرسکی تھی نہ اسے خواص نے ادبی حیثیت سے تسلیم کیا تھا۔ اردو زبان نے گو کہ انیسویں صدی کے پہلے قرن کے بعد ہی (۱۸۳۵ء) میں سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرلیا تھا لیکن عام طور پر ملک بھر میں خط و کتابت اور مراسلت کی زبان انقلاب ۱۸۵۷ء تک فارسی ہی رہی جس کا رواج محض مسلمانوں ہی کے پڑھے لکھے طبقے تک محدود نہ تھا بلکہ ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی فارسی کی اعلیٰ تعلیم کو معیاری تعلیم سمجھ کر حاصل کرتا تھا اور قریب قریب ہندوستان کے تمام صوبوں کا مراسلاتی نظم و نسق جہاں ایک علیحدہ نظام حکومت کسی شکل میں بھی قائم تھا ان کاتب منشیوں کے ہاتھ میں تھا جو فارسی کے مستند ادیب اور انشا پرداز مانے گئے ہیں۔

لیکن تاریخ کی ان ناقابل انکار حقیقتوں کے باوجود اسے بھی ماننا پڑے گا کہ اٹھارہویں صدی عیسوی ختم ہوتے ہوتے اردو زبان ایک "ہندوستان گیر" درجہ حاصل کرچکی تھی اور رسل و رسائل کی مشکلات و نقل و حمل کی دشواریوں کے باوجود اسے درۂ خیبر سے لے کر راس کماری تک سمجھنے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد پیدا ہوچکی تھی۔ جنوبی ہند میں بہمنی حکمراں۔ عادل شاہی سلاطین اور قطب شاہی بادشاہوں نے مختلف زمانوں میں اسے سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا۔ اور شمالی ہندوستان میں بھی اس کی سرکاری حیثیت اس وقت تسلیم کرلی گئی تھی جب اسے سرکاری زبان کا درجہ بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ "بنگال کے راجہ نندی" کے مقدمہ

کی سماعت ہو رہی تھی کہ ایک پیشی پر استدعا کی گئی۔

"ایک تاریخ ۸ جون ۱۸۰۵ء کیدن وکیل نے مجسٹریٹ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ مدعی اور مدعا علیہ کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنا اپنا بیان ہندوستانی زبان (اردو) میں دیں کیونکہ یہ ایسی زبان ہے جسے بنگال میں ہر شخص بولتا اور لکھتا ہے۔ (صفحہ "بنگال میں اُردو" مطبوعہ مکتبہ اشاعت اردو حیدرآباد پاکستان)

پرتگالیوں نے پندرہویں صدی عیسوی کے آخری سال ہندوستان میں قدم رکھا۔ ڈچ اس کے بعد آئے پھر انگریز پہنچے اور فرانسیسی ان سب کے بعد ہندوستان میں داخل ہوئے۔ یورپ کی ان تمام قوموں نے اپنی تجارتی ضرورتوں کے لئے ہندوستان کی صوبائی اور مقامی زبانوں سے دلچسپی لینا شروع کی لیکن پرتگیزیوں نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی ان زبانوں کو "مسیحی تبلیغ" کا ذریعہ بنانے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ ہندوستان میں پرتگیزیوں کی "ہوس اقتدار" کے ناکام ہونے کا سبب بھی یہی بتایا جاتا ہے کہ ان کی دلچسپیاں تجارتی اغراض سے ہٹ کر ان کلیساؤں کی طرف زیادہ بڑھ گئی تھیں جو جنوبی ہندوستان میں جگہ جگہ قائم کئے جا چکے تھے۔

ہندوستان میں چھاپہ خانوں کی ابتدا بھی انھیں پرتگیزی پادریوں کی تبلیغی سرگرمیوں سے ہوئی جن میں مسیحی تعلیمات کی کئی "کاٹی کزم" (مسیحی تعلیمات بطور سوال و جواب) پرتگالی اور دیسی زبانوں میں سولھویں صدی کے وسط تک چھاپی گئیں اور اس کے بعد سولھویں صدی کے آخری دور میں "تامل" اور "ملائم" زبانوں میں بھی اسی قسم کی "کاٹی کزم" شائع کی گئیں جس سے ہندوستان کے تصنیفی شعور میں ارتقائی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔

کمپنیوں کا یہ ہنگامی زمانہ کم و بیش تین سو سال تک قائم رہا۔ گو کہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ ختم ہونے کے بعد انگریز ہندوستان کی سیاست میں حکمراں کا درجہ

حاصل کر چکے تھے لیکن ادبی اور تمدنی اعتبار سے ۱۸۰۰ء تک ہندوستان کی علمی، ادبی اور لسانی جدوجہد میں کوئی اجتماعی قوت عمل پیدا نہیں ہوئی یہ کام ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہونے کے بعد ہی باقاعدہ طور پر ایک لسانی اور ادبی تحریک کے طور پر شروع ہوا۔ اس سے پہلے افراتفری کے زمانے میں ہمیں جو کچھ بھی حاصل ہو سکا ہے اُردو زبان و ادب کے بکھرے ہوئے اوراق سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی حالانکہ تاریخ کے اس ہنگامی دور میں زبان و ادب کے ان کارناموں کو ہمیشہ ایک مقام حاصل رہے گا۔

آریوں، بدھوں، عربوں اور تاتاریوں کی طرح پرتگال، ہالینڈ، انگلستان اور فرانس بھی اپنے ساتھ اپنا "ثقافتی زاد راہ" لے کر ہندوستان کے ساحلوں پر اترے اور "جذبہ برتری" کی لعنت کے باوجود ہندوستانی تہذیب سے قریب تر ہوتے چلے گئے عربوں کے تمدن سے ہندوستان پہلے ہی متاثر ہو چکا تھا پرتگیزیوں کی تہذیب و معاشرت کو ان اثرات نے جلد قبول کر لیا کیونکہ پرتگال اسپین میں ضم ہونے کے بعد اسپین کے قدیم عرب تمدن کی بہت سی یادیں اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھا۔ اسی طرح ڈچ تہذیب اور فرانسیسی زبان کے الفاظ بھی انگریزی کے ساتھ ہندوستانی زبانوں میں گھل مل گئے جس کے امتزاج کا تقاضا ہی یہی تھا کہ ایک نئی زبان جنم پا جاتی۔ چنانچہ جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں پر ایک قسم کی نئی زبان پیدا ہو گئی جسے پروفیسر حامد حسن قادری نے "پرتگالی ہندوستانی" زبان کا نام دیا ہے۔

"اس تاریخ کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں یورپ کی جو جو قومیں آئیں ان کے رسوخ و اثر کا اندازہ ذہن نشین کر دیا جائے اور اُردو سے ان کا تعلق بیان کیا جائے۔ خصوصاً انگریزوں اور انگریزی کا

اثر اُردو پر دکھایا جائے۔

(۱) پرتگال والے سب سے پہلے آئے۔ تجارت سے ترقی کر کے حکومت میں حصہ لیا۔ ساحلوں پر قبضہ جمالیا۔ تجارتی کوٹھیاں بنائیں۔ جائدادیں خریدیں۔ اپنا مذہب پھیلایا۔ ہندوستانیوں کو عیسائی بنایا۔ ان سب مشاغل اور مصروفیتوں کے لئے اہل ہند سے میل جول کی ضرورت تھی چنانچہ پرتگال والوں نے سواحل ہند کی زبانیں سیکھیں اور اپنی زبان سکھائی۔

(۲) اہل پرتگال بہت سی چیزیں اپنے ساتھ لائے جو ہندوستان میں نہ تھیں ان کے نام ہندوستان میں باقی رہ گئے مثلاً الماری۔ بالٹی۔ پیپا۔ پستول۔ صابون۔ کارتوس۔ میز۔ تولیا وغیرہ۔

(۳) پرتگالیوں کا اثر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جنوبی ہند کی زبانوں پر پڑا۔ مرہٹی۔ بنگالی۔ اڑیا وغیرہ زبانوں میں صدہا پرتگالی لفظ مل گئے اور پھر اندرون ملک میں پہنچ کر اُردو میں شامل ہوئے۔

(۴) اہل پرتگال کے بعد جب ہالینڈ فرانس اور انگلستان والے آئے تو انھوں نے دیکھا کہ تمام بندرگاہوں اور ساحلی مقامات پر "پرتگالی نما ہندوستانی" یا "ہندوستانی نما پرتگالی" زبان پھیلی ہوئی ہے اور اہل ہند سے میل جول کے لئے یہ زبان سیکھنا آسان اور مفید ہے اس لئے ان لوگوں نے اس زبان کو حاصل کیا۔

(۵) کپتان ہملٹن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ہندوستان کے ساحلوں پر اہل پرتگال کی زبان کا اس قدر اثر موجود ہے کہ اہل یورپ باہمی گفتگو اور اہل ہند سے میل جول کے لئے یہی زبان حاصل کرتے ہیں۔ "لاکیر" اپنی کتاب (اشاعت ۱۷۱۱ء) میں ذکر کرتا ہے کہ اہل پرتگال کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کی

زبان نے سواحلی ہند پر ایک مشترک زبان پیدا کر دی ہے جو تمام اہل یورپ کے لئے مفید ثابت ہوئی ہے۔

(۶) ہالینڈ اور فرانس والے بھی ہندوستان میں آئے۔ تجارت و حکومت کی کوشش کرتے رہے۔ اہل ہالینڈ کو ہند میں رہنا اور اپنے مقبوضات قائم رکھنا نصیب نہ ہوا۔ ہندوستان سے جلد واپس جانا پڑا۔ اہل فرانس برسوں رہے۔ بعض مقامات پر قبضہ کیا اور اب تک[1] قابض ہیں لیکن ان دونوں قوموں کی زبان کا کوئی اثر ہندوستان میں نہ ہوا اور ان کی کوئی نمایاں یادگار باقی نہیں ہے۔ یورپ سے جو نئی چیزیں اور ان کے نام آئے اور رائج ہوئے وہ اکثر پرتگیز کے لائے ہوئے تھے ہالینڈ اور فرانس سے کچھ اور نئی چیزیں نہیں آئیں جن کی یادگار باقی رہتی صرف بعض الفاظ ہندوستان میں موجود ہیں۔

(۷) پرتگال۔ ہالینڈ اور فرانس کا جو کچھ اثر اردو پر ہوا وہ صرف الفاظ کی شکل میں ہوا۔ اردو انشاء پردازی پر کوئی اثر نہ پڑا بلکہ خود ان لوگوں نے ہندوستانی زبانیں سیکھیں۔ اردو حاصل کی۔ اردو میں شاعری کی۔

(۸) خصوصاً اہل فرانس میں سے بعض بعض پرائیوٹ طور پر ہندوستان میں اقامت پذیر ہو گئے۔ مختلف شہروں میں جاگیریں لیں مکانات بنائے۔ ہندوستانی لباس و معاشرت اختیار کی چنانچہ آگرہ میں ایک فرانسیسی مسٹر مارٹن کی یادگار مکانات اب تک موجود ہیں اور مارٹن محل کے نام سے مشہور ہیں۔ فرانسیسی اُردو شاعروں کی یادگاریں بھی تذکروں میں باقی ہیں۔

---

[1] انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد فرانس اپنے ان مقبوضات سے دستبردار ہو گیا جو "فرانسیسی ہند" کہلاتا تھا اب یہ حصہ بھی انڈین یونین کا ایک جزو ہے۔

(۹) انگریز پرتگالیوں سے سو برس بعد تجارت کرنے آئے لیکن ایسا سودا کیا کہ ہندوستان ہی کو مول لے لیا۔ انگریزوں کو ہندوستان میں قدم رکھے تین سو برس سے زیادہ ہو گئے۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو دو سو برس کے قریب ہوئے (از عہد لارڈ کلائیو) اور انگریزوں کی شہنشاہی کو ایک صدی کے قریب گزر گئی۔ انگریزوں نے اردو زبان کی رفتار ترقی اور قبول عام کو دیکھ کر اس کی طرف توجہ کی ان سے پہلے ہالینڈ اور پرتگال والے اردو کی قواعد صرف و نحو پر کتابیں لکھ چکے تھے انگریزوں نے بھی اٹھارہویں صدی میں اردو گرامر اور لغت کی متعدد کتابیں لکھیں۔ انیسویں صدی میں مشن کے پادریوں نے مذہبی کتابیں اردو زبان میں شائع کیں۔ اردو اخبار اور رسالے جاری کئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے انگریز ملازموں کے لئے اُردو زبان کا سیکھنا اور پھر اس میں امتحان پاس کرنا لازم کر دیا۔ ۱۸۳۲ء ۱۲۴۸ھ میں اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔

(صفحہ ۶۶ لغایتہ ۶۸ داستان تاریخ اُردو)

اس عہد کے فرانسیسی اپنے زمانے میں "نئے ہندوستان" کی تعمیر میں اپنے دوسرے ساتھیوں سے پیچھے نہیں رہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں ڈاکٹر گارساں دتاسی کی ادبی خدمات کو نہ بھلانا چاہئے جس نے برسوں فرانس میں بیٹھے بیٹھے اُردو زبان و ادب کی ایسی مخصوص خدمات انجام دیں جنھیں آج بھی ہم مشعل راہ بنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح گوالیار اور بھوپال کے ان فرانسیسی خاندانوں کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو اٹھارہویں صدی کے وسط میں ہندوستان پہنچ کر یہیں کی تہذیب و معاشرت میں گھل مل گئے تھے۔ ان کے طبی کارنامے تو اپنی جگہ پر ایک مسلمہ حقیقت

بن گئے ہی ہیں لیکن معاشرتی اور تمدنی طور پر بھی انھوں نے ہندوستانی زبان تہذیب اور معاشرت کا پورا پورا ساتھ دیا۔

بھوپال میں پہلے فرانسیسی "عنایت مسیح" آئے تھے۔ جنھوں نے اس وقت کی سیاست میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ ان لوگوں نے محض فارسی اور اُردو زبانوں ہی کو نہیں اپنایا بلکہ ہندوستانی معاشرت کو ہر پہلو سے قبول کیا۔ ان کے رہنے سہنے کے طریقے۔ لباس کی تراش و خراش اور معاشرتی و تمدنی یک جہتی نے مالوے کی سرزمین پر "ہند و فرانس" کے امتزاج کا ایک نمونہ پیش کیا۔

اسی فرانسیسی خاندان کے ایک فرد ایم۔ عرفانی نے "مقالات عرفانی" میں لکھا ہے۔

"اس کے علاوہ بھوپال میں فرانسیسی اطباء میں عنایت مسیح اور شہزاد مسیح کے نام سے لوگ بخوبی واقف ہیں۔ میں اپنے اسلاف کے اطباء میں سے خاص طور پر حکیم "میتھس ڈیسلو" کا ذکر کرتا ہوں جن کے جد امجد "پیڈرو ڈیسلوا" (PEDRO D'SILVA) عہد محمد شاہ بادشاہ ہندوستان ترچنا پلی سے محمد شاہ کی شہزادی کا علاج کرنے کے لئے طلب کئے گئے اور بعد صحت شہزادی "خرومند محمد خاں" کا خطاب اور عطیات شاہی سے نوازے گئے جن کو راجہ جے سنگھ بانی جے پور اپنے ہمراہ لے گیا اور ان کے بیٹے اور پوتے "شوبیر" (زیویر) XAVIR DESILVA اور "جوسی" (جوسف) JOSEPH ڈی سلوا اپنے زمانے کے ممتاز طبیب اور صاحب تصنیف تھے۔

جب سردار دوست محمد خاں بانی بھوپال کی اولاد کا دور حکومت صاحب علم و فن حضرات کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کر رہا تھا اسی زمانے میں حکیم "میتھس" (ڈیسلو) DOM MATHEW DISILVA بھی بھوپال وارد ہوئے جو تقریباً تین درجن کتب طبی کے مصنف اور مولف ہیں یہ میرے

والد مرحوم محمد سلیمان خاں صاحب عزت[1] اچھے جاگیردار (سابق اینڈ جوائنٹ سرسرخ وردی) کے پرنانا تھے ان کی ایک کتاب از نام "مجربات فرنگی" اور دوبارہ از نام "مجربات میتس" ۱۸۹۰ء میں نولکشور پریس لکھنؤ میں طبع ہو چکی ہے۔" (صفحہ ۲۵۔ مقالات عرفان مطبوعہ علوی پریس بھوپال)

اس ہنگامی دور کے یوروپین مصنفین میں "جان جوشوا کیٹلر" وہ پہلا شخص ہے جس نے تخمیناً ۱۷۱۵ء میں "ہندوستانی صرف و نحو" کے نام سے اردو زبان کی پہلی گرامر لکھی جس کو ۱۷۴۳ء میں "ڈیوڈ مل" نے لاطینی (لیٹین) حروف میں پہلی بار شائع کیا۔

"جان جوشوا کیٹلر" ہالینڈ کا رہنے والا تھا ۱۷۱۱ء میں ہالینڈ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر مقرر ہو کر ہندوستان پہنچا۔ تین سال تک سورت میں رہا اس کے بعد شاہ عالم بادشاہ دہلی کے دربار میں ۱۷۱۱ء سے ۱۷۱۲ء تک ہالینڈ کی سفارتی خدمات انجام دیتا رہا شاہ عالم کی وفات کے بعد ۱۷۱۲ء میں جہاندار شاہ کے دربار میں سفیر مقرر ہوا۔

"جان جوشوا کیٹلر" کی گرامر میں کئی جگہ پر اُردو زبان کی عبارتیں "اردو من" حروف میں لکھی گئی ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی مشہور دعا ان الفاظ میں درج کی گئی ہے۔

"ہمارے باپ کہ وہ آسمان میں ہے پاک ہووے تیرے نام۔ آوے ہم کو (کو) ملک تیرا ہووے۔ راج تیرا جوں آسمان تو جیہیں (زمین) میں روٹی ہمارا ہر دن کی ہم کو آس دے اور معاف کر تقصیر اپنی ہم کون (کو) جوں معاف

---

[1] محمد سلمان خاں عزت اچھے صاحب نفیس ایک خوشگوار اور خوش فکر شاعر تھے۔ امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ نفیس کا دیوان ان کے صاحبزادے ایم۔ عرفان کے پاس موجود ہے جو غالباً جلد ہی شائع کر رہے ہیں۔

کرتے اپرے (اپنے) قرضداروں کو نہ ڈال ہم کو اس وسوسے میں۔ بلکہ ہم کون (کو) گھس کر اس برائی سے۔ تیری پہنچی سواری عالمگیری حمائت میں۔ آمین۔"

(صفحہ ۶۰ داستان تاریخ اردو)

اس زمانے میں زیادہ تر کتابیں اُردو کے صرف و نحو اور لغات پر لکھی گئیں جن کی تفصیلات یہ ہیں۔

(۱) پادری "بنجمن شیلز" نے لیٹن زبان میں "قواعد اردو" لکھی جو ۱۷۴۴ء میں چھپی ہے اس میں اردو الفاظ فارسی رسم الخط میں لکھے گئے ہیں۔

(۲) پادری بنجمن ہی نے ۱۷۴۵ء میں بائبل کا اردو ترجمہ کیا۔

(۳) ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۴ء میں ہندوستانی حروف تہجی پر ایک مختصر کتاب لکھی۔

(۴) جی۔ اے فرٹز نے ۱۷۴۸ء میں ایک کتاب اردو کے حروف تہجی پر لکھی جس میں دوسری زبانوں کے حروف تہجی کا مقابلہ اردو حروف تہجی سے کیا گیا ہے۔

(۵) پادری کیسیانو بیلی گاٹی جو اٹلی کا رہنے والا تھا۔ اس نے بھی اردو رسم الخط پر ایک رسالہ "الفابیٹم برہمانکم" کے نام سے ۱۷۶۱ء میں لکھا۔

(۶) ہیڈلے نے ۱۷۷۲ء میں اُردو گرامر تصنیف کی۔

(۷) پرتگالی زبان میں اردو زبان کے قواعد پر ایک کتاب "گرامیٹکا انڈوستانا" کے نام سے ۱۷۷۸ء میں شائع ہوئی۔

(۸) ڈف جو پہلی بار ۱۷۸۵ء میں ہندوستان آیا تھا اور کلکتہ کے دوران قیام میں اسے سنسکرت، بنگالی اور اردو زبانیں سیکھی تھیں اس نے بھی ایک اردو گرامر لکھی تھی جو لندن سے شائع ہوئی ہے۔

(۹) ۱۷۹۳ء میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے ہندوستانی ڈکشنری مرتب کی۔

(۱۰) پھر ۱۷۹۶ء میں گلکرائسٹ نے ہندوستانی گرامر لکھی۔

(۱۱) اس کے بعد ۱۷۹۸ء میں انھوں نے "رونٹیل لنگوجسٹ" (مشرقی زباندانی) ترتیب دی۔

انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے اثر و اقتدار کے لحاظ سے نصف اٹھارہویں صدی کے فوراً بعد ہی ہندوستان کی حکمراں جماعت بن گئی تھی اور اس کے ستارہ اقبال کے چمکتے ہی پرتگال۔ ہالینڈ اور فرانس کی کمپنیاں صحیح معنوں میں زوال پذیر ہونا شروع ہو گئیں تصنیف و تالیف اور ترجموں کا جو انفرادی کام اب تک مختلف قومیں مل جل کر رہی تھیں اس عروج و زوال کے ساتھ ان کی راہیں بھی قدرتاً بدل گئیں۔ انگریز پہلی بار اپنی ضرورتوں کے لئے ان ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہوئے اور باوجودیکہ ہندوستان کے یہ نئے حکمراں (ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹرز) مفت کی کمائی ہوئی دولت سے ایک پائی بھی ہندوستان کے تمدنی یا معاشرتی مفاد پر خرچ نہیں کرنا چاہتے تھے وارن ہسٹنگز کی سعی و کوشش سے انھیں ان کاموں میں دلچسپی لینا پڑی کلکتہ کا مدرسہ عالیہ ۱۷۸۱ء میں قائم ہوا ہندوستان کی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی انگریز افسروں کی دلچسپیاں بڑھنا شروع ہوئیں۔ وارن ہسٹنگز نے سب سے بڑا جو کام انجام دیا وہ اردو فارسی ٹائپ کی ایجاد تھا۔

عجب اتفاق ہے کہ ہندوستان کی کئی زبانوں کا ٹائپ سولھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے اندر ہی ایجاد ہو گیا۔ عربی ٹائپ بھی سولھویں صدی عیسوی تک مکمل ہو چکا تھا ایسی ایک کتاب کا ذکر علامہ عبداللہ یوسف علی نے کیا ہے۔

"عربی میں سب سے پہلی مطبوعہ کتاب جو میری نظر سے گذری ہے وہ لندن کی برٹش میوزیم کی لائبریری میں موجود ہے اس کا نمبر سی۔ ۵۲۔ ای۔ ۱۷ (C.52-E.17) ہے۔ اس کتاب کا نام "صلوٰۃ السواعی" ہے۔ جس میں رومن کیتھولک مذہب کے اصول کے مطابق دن رات کے

مذہبی اوقات میں نمازیں درج ہیں یہ کتاب ۱۵۱۴ء میں گری گوریس" (GREGOVINS) نے بسرپرستی لیو دہم (POPE LEO X) پاپائے روما ملک اٹلی میں چھاپی"

(صفحہ ۹۴ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ)

لیکن اردو فارسی رسم الخط کے ٹائپ کی طرف ہندوستان تو ہندوستان اب تک یورپ نے بھی توجہ نہیں کی تھی اب تک اردو فارسی کی جس قدر کتابیں لکھی گئیں وہ قلمی تھیں ان کتابوں کی اشاعت کا صرف ایک ہی محدود طریقہ تھا اور وہ یہ کہ ان کی نقلیں کر کے مختلف کتب خانوں کے لئے انھیں فراہم کیا جاتا تھا یہ طریقہ ہر اعتبار سے مشکل محدود اور رقم آمیز تھا یہی وجہ ہے کہ گذشتہ دور کی اردو فارسی تصانیف ہیں جن تک ہم نہ پہنچ سکیں نہ ہم ان کی کسی قسم کی تفصیلات فراہم کر سکتے ہیں حالانکہ یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب کی تاریخیں اس وقت تک اردو مخطوطات کی جو فہرست پیش کر سکی ہیں وہ قطعاً نامکمل ہیں۔ سیکڑوں اور ہزاروں کتابیں ایسی ہوں گی جن کے مسودے نہ ہم تک پہنچ سکے نہ ہم ان کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔

وارن ہسٹنگز وہ پہلا شخص ہے جس نے اردو فارسی رسم الخط کے ٹائپ کی کمی محسوس کی۔ چارلس ولکنس CHARLEC WILKINS نے اٹھارہویں صدی کے آخری زمانے میں وارن ہسٹنگز کے مشورہ سے اردو فارسی حروف کا ٹائپ تیار کیا اور ہندوستان میں پہلی بار فن طباعت کو ترقی یافتہ شکل میں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کئے۔

"ولکنس ہندوستان میں فن طباعت کی ترقی یافتہ صورت کے بانی تھے کیونکہ انھوں نے فارسی اور بنگلہ زبانوں کے حروف کے ٹائپ تیار کر کے سانچے میں ڈھالے یہ غالباً ۱۷۷۸ء سے پہلے کا واقعہ ہوگا کیونکہ

ہیلہڈ (HAL HED) کی سنسکرت گرامر اسی سال اسی ٹائپ میں بمقام ہگلی چھاپی گئی۔

(صفحہ ۷۴ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ)

یہ صحیح ہے کہ اردو فارسی ٹائپ ۱۷۷۸ء میں ایجاد ہو جانے کے بعد کئی سال تک اپنے صحیح مصرف میں نہ آسکا اٹھارہویں صدی ختم ہوتے ہوتے اس ٹائپ کا استعمال کافی بڑھ چکا تھا مگر اس دور میں بھی زیادہ تر فارسی کتابیں اور فارسی اخبار اس ٹائپ میں چھپے ہیں اردو کتابوں کا کوئی قابل ذکر کام کہیں نظر نہیں آتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہ تاریخی کارنامہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس صدی کا سب سے شاندار کارنامہ کہا جا سکتا ہے جس کی بدولت انیسویں صدی میں "فورٹ ولیم کالج" کی ایک بہت بڑی تحریک ہر حیثیت سے کامیاب ہو گئی اور انیسویں صدی کے ابتدائی تیس چالیس برس تک جس قدر اردو کتابیں لکھی گئیں ان کا ایک بڑا حصہ انھیں ٹائپ حروف میں شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ انیسویں صدی کے شروع میں نکلنے والے اردو اور فارسی اخبارات کے اجرار و اشاعت کا سبب بھی یہی ایجاد ہوئی جو کم از کم اردو زبان کے لئے پہلا ارتقائی اقدام ضرور تھا۔

ہندوستان میں اردو فارسی ٹائپ کو کسی وقت بھی مقبولیت حاصل نہ ہوئی ابتدائی دور میں تو ایک نئی ایجاد سمجھ کر عوام ادھر متوجہ ہوئے لیکن جب پتھر کے چھاپے (لیتھو) کا طریقہ رواج پا گیا تو اس کے مقابلے پر اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی۔

"فورٹ ولیم کالج"

تذکرہ "گلشن ہند" کے مقدمہ میں ڈاکٹر عبد الحق (بابائے اردو) نے لکھا ہے!

"ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی اور جس کا تسلط اس وقت ہندوستان پر اس طرح بڑھتا چلا جا رہا تھا جیسے ساون بھادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے۔ اس نے اردو کی دستگیری کی اور وہ اس لئے کہ ہندوستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جلنے کے لئے اس کا جاننا ضروری تھا دوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی۔ جہاں جہاں اس وقت بھی مغلیہ حکومت کے آثار تھے اس کا دور دورہ تھا علاوہ اس کے ہندوستان کی جدید زبانوں میں سب سے زیادہ ہونہار نظر آئی اس لئے انھوں نے اس کی سرپرستی کی۔ سب سے بڑا احسان ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کا ہے جس نے انیسویں صدی کے شروع میں بمقام فورٹ ولیم کلکتہ اس کا ایک محکمہ قائم کیا جس کا ابتدائی اور اعلیٰ مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں ان کی تعلیم کے لئے اردو کی مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں اور غالباً اسی شخص کا احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اردو زبان دفتر کی زبان قرار پائی یہ عجیب واقعہ ہے اور یاد رکھنے کی بات ہے کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چہیتی زبان تھی ایک ہندو "راجہ ٹوڈرمل" کی کوشش سے دفاتر میں

داخل ہوئی اور دوسرے دَور میں اُردو نے ایک انگریز کی وساطت سے دربار سرکار میں رسائی پائی۔ اس شخص (گلگرائیسٹ) نے اس وقت کے قابل قابل لوگ بہم پہنچائے اور مختلف کتابیں لکھوانا شروع کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو نثر کا لکھنا اسی وقت سے شروع ہوا۔"

(صفحہ ۳-۴ تذکرہ "گلشن ہند" مطبوعہ رفاہ عام اسٹم پریس لاہور ۱۹۰۶ء)

"ایسٹ انڈیا کمپنی" نے جس ضرورت کو "فورٹ ولیم کالج کی تاسیس" کے طور پر پوری کرنے کی کوشش اٹھارہویں صدی کے اختتام پر شروع کی تھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے یہ مشکل گذشتہ کئی صدیوں سے انفرادی طریقہ پر حل ہوتی رہی تھی اور علامہ عبداللہ یوسف علی کے الفاظ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا عام رجحان اٹھارہویں صدی میں یہی تھا۔

"فارسی اور ہندوستانی (اردو) بنگلہ اور سنسکرت اس وقت عام طور پر ایسی زبانیں تھیں جنھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے علم و وسعت عہدیدار حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔"

صفحہ ۱۴ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ)

۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ ختم ہونے کے بعد "ایسٹ انڈیا کمپنی" "ایک حکمران" کی حیثیت سے ہندوستان میں اپنے قدم جما چکی تھی اقتدار کے اس استحکام کے ساتھ ساتھ ان مقبوضات کا نظم و نسق بھی کمپنی کی ذمہ داریوں کا ایک جزو بنتا گیا جن پر کمپنی نے کسی نہ کسی طرح تسلط حاصل کرلیا تھا۔ دفتری نظام میں تبدیلیاں ہوئیں۔ سماجی معاملات سے دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ عوام سے ربط ضبط بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہوس "ملک گیری" کی دہکتی ہوئی آگ پر "نئے مقبوضات" کے چھینٹے ڈالنے کی جد و جہد جاری رہی۔

کلائیو (۱۷۵۸ء لغایتہ ۱۷۶۰ء) ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا گورنر مقرر ہوا اسکے بعد ۱۷۶۵ء میں پھر اسے اسی عہدے پر مامور کرکے بھیجا گیا۔ ۱۷۵۸ء سے لے کر ۱۷۷۲ء تک کلائیو کے علاوہ کمپنی کے چار گورنر کمپنی کے مقبوضات پر شاہی کرتے رہے اور سب سے آخری گورنر وارن ہیسٹنگز WAREN HASTINGS کو جب ۱۷۷۲ء میں گورنر مقرر کیا گیا تو دو ہی سال کے بعد کمپنی نے اسی "گورنری" کے عہدے کو "گورنر جنرل" کے عہدے تک وسعت دے دی۔

وارن ہیسٹنگز پہلے با اختیار انگریز تھے جنھوں نے ہندوستان کی عنان اقتدار ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلے ہندوستان والوں سے ثقافتی اور تمدنی اتحاد کی طرف توجہ کی۔

"ہندوستان میں ہیسٹنگز کے ابتدائی میل جول اور بعد ازاں دوستانہ مراسم کا یہاں کے تہذیب و تمدن کے ان ابتدائی مدارج پر بہت بڑا اثر پڑا ہے جو برٹش انڈیا (برطانوی ہند) میں رونما ہوئے چونکہ انھیں ہندوستانیوں کے جذبات و حسیات سے ہمدردی تھی اور اہل مشرق کے افکار و خیالات سے ایک طرح کا انس تھا اس لئے وہ مشرقی علوم کے سرپرست بن گئے۔ وہ مسلمانوں کے ان علوم و فنون کے جو ہندوستانیوں میں مروّج تھے ایسے گرویدہ ہوگئے کہ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ فارسی زبان کی تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی میں انگریزوں کی وسیع تعلیم کا جزو قرار دی جائے۔۔ ....! اسی انہماک پر مغرب کے علماء اور فضلا نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے قوانین کی اس تحقیق پر ترتیب اور جدید شرح کی عمارت کھڑی کی جن کی بدولت ہمارے اصول قوانین قدیم محاوروں اور تبلوں کی پابندی سے کسی قدر آزاد ہوگئے ہیں۔"

(صفحہ ۴۲-۴۳۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ)

وارن ہیسٹنگز کی ثقافتی دلچسپیاں ان کے پہلے عہد حکومت میں صحیح طور پر بار آور نہ ہو سکیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ ۱۷۸۰ء میں جب انھوں نے "مدرسہ عالیہ کلکتہ" کا سنگ بنیاد رکھا تھا یقیناً اس عملی تعبیر کا پہلا خواب تھا جو بیس برس بعد فورٹ ولیم کالج کی شکل میں سامنے آیا۔

وارن ہیسٹنگز کے آخری دور میں جان گلکرائسٹ بمبئی سے کلکتہ پہنچ چکے تھے جن کے تقرر پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملکی ضرورتوں کے ساتھ ہندوستان میں ایک ایسے تعلیمی ادارے کی ضرورت کا بھی تصور تھا جو محض ان کے ہم وطنوں کی اغراض ملک گیری ہی کو پورا کرنے کے لئے کافی نہ ہو بلکہ ایک ایسی "ہندوستان گیر" تہذیب و تمدن کو بھی اپنے دامن میں سموئے جو ہر قسم کی طبقاتی کشمکش سے پاک و صاف ہو۔ ۱۷۸۴ء میں ڈاکٹر گلکرائسٹ نے پہلی مرتبہ کمپنی کے سامنے اپنی تجاویز پیش کیں جن پر غالباً پوری توجہ سے اس لئے غور نہیں ہو سکا کہ وارن ہیسٹنگز کا بلاوا انگلستان سے آچکا تھا۔

علامہ عبداللہ یوسف علی نے ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی ان تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"دو مقاصد ان کے پیش نظر تھے اول ایک تو وہ چاہتے تھے کہ ان کے "سویلین" شاگرد ایک ایسی دیسی زبان سیکھیں جو تمام ہندوستان میں بولی جاتی ہو جیسے فارسی اس وقت ملکی انتظامی اور سیاسی اغراض کے علاوہ عام طور پر شرفا اور ادبا کی زبان سمجھی جاتی تھی تاکہ وہ نہ صرف اپنے ماتحتوں یا اعلیٰ درجہ کے لوگوں سے بلکہ ہر شخص سے گفتگو کرنے کے قابل ہو جائیں۔

دوسرے ہندوستانی زبان (اردو) اس وقت بہ نسبت اور دیسی

زبانوں کے کچھ زیادہ ترقی یافتہ تھی اور جغرافیائی پہلو سے ہندوستان میں سب سے زیادہ پھیلی ہوئی تھی اس لئے ڈاکٹر موصوف (گلکرائسٹ) کی یہ خواہش تھی کہ اس زبان میں ایسی نثر پیدا ہو جو ہندوستان میں عام سرکاری زبان کا کام دے سکے۔"

(صفحہ ۱۰۹۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ)

ڈاکٹر گلکرائسٹ کی اس "ہندوستان گیر" خواہش میں خلوص ہو یا نہ ہو لیکن سیاسی طور پر اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس کی شدید ضرورت تھی کہ جو انگریز کمپنی کی ملازمت میں ہندوستان پہنچ رہے تھے انھیں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی تہذیب و معاشرت سے قریب تر کر دیا جائے۔ بنگال ختم کرنے کے بعد انگریزوں کی تمام سیاسی توجہ جنوبی ہندوستان کے اس سیاسی خلفشار کی طرف مبذول ہو چکی تھی جہاں ایک طرف تو مرہٹوں میں پھوٹ پڑ چکی تھی دوسری طرف نواب حیدر علی کا ستارۂ اقبال "نصف النہار" تک پہنچ چکا تھا۔ خود کمپنی نظام الملک کی مرضی کے خلاف "علاقہ گنٹور" پر قابض ہو چکی تھی اور انقلاب فرانس کے ردعمل کا بہانہ بن کر "فرانسیسی ہند" کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ "پولی لور" کی جنگ (۱۷۸۰ء) میں انگریزوں کو شکست ہوئی۔ "دیلور اور آرکاٹ" کے میدانوں میں بھی انگریز اپنے حلیفوں کا ساتھ دینے میں ناکام ہوتے نظر آرہے تھے اور انگلستان کی فوج برابر ہندوستان کے ساحلوں پر اترتی چلی آرہی تھی۔ فرانس اب کھل کر انگریزوں کے مقابلے پر آچکا تھا اور پہلی بار کمپنی ایسا محسوس کر رہی تھی کہ اگر جمے جمائے قدم جلد نہ سنبھل سکے تو شاید ہندوستان جیسی سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل جائے گی۔ بڑھتے ہوئے انقلابات کی اس تیز روی اور ہندوستان میں فوارد انگریزوں کے لگاتار اضافے نے ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی تجاویز کی اہمیت میں اچھا خاصا وزن

پیدا کر دیا تھا ۱۷۸۵ء میں وارن ہیسٹنگز ہندوستان سے روانہ ہوئے ان کی
جگہ پر "سر جان میکفرسن" قائم مقام گورنر جنرل مقرر ہوئے جو پہلے ہی سے ڈاکٹر
گلکرائیسٹ کی ان تجاویز سے متفق و متحد الخیال ہے "سر جان" نے اپنے عہدے
کا چارج لیتے ہی سب سے پہلے ڈاکٹر گلکرائیسٹ کو ایک طویل رخصت اس لئے
دی کہ وہ ہندوستان کے خاص خاص شہروں میں رہ کر مشرقی علوم و ادبیات کا
گہرا مطالعہ کریں تاکہ ان کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں کسی قسم کی مشکلات سدِ راہ
نہ ہوں۔ ڈاکٹر گلکرائیسٹ کے اس سفر کے تمام اخراجات کی منظوری بھی کمپنی کی
طرف سے دی گئی اور وہ ایک طویل مدت کے لئے اپریل ۱۷۸۵ء میں اپنے مشن
پر روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر گلکرائیسٹ نے کئی سال تک فیض آباد۔ لکھنؤ اور دہلی وغیرہ میں ہندوستانی
مشرقی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا اور جب وہ کلکتہ پہنچے تو لارڈ ویلزلی (LORD
WELLESLEY) گورنر جنرل ہو کر ہندوستان پہنچ چکے تھے۔

لارڈ ویلزلی بھی اول دن سے گلکرائیسٹ کی تجاویز کو کمپنی کی موت و زندگی
کا مسئلہ سمجھتے تھے۔ باوجودیکہ کمپنی کی تمام سیاسی سرگرمیاں ان دنوں "سلطنت
خداداد" مٹانے میں سرگرم عمل تھیں لیکن "ویلزلی" نے آتے ہی یہ تجاویز اپنی پر زور
سفارش کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کو انگلستان روانہ کر دیں
ان تجاویز میں واضح طور پر فورٹ ولیم کالج اور اس سے متعلقہ تمام شعبوں کے
جلد سے جلد قیام پر زور دیا گیا تھا۔ ویلزلی دسمبر ۱۷۹۸ء میں کلکتہ پہنچے اور چند ہی
روز کے بعد انھوں نے ایک اعلان جاری کیا جس میں کمپنی کے تمام انگریزی ملازمین
کے لئے فورٹ ولیم کالج کے امتحانات پاس کرنا ضروری اور لازمی قرار دیا گیا تھا۔
چونکہ اس وقت تک کالج قائم نہیں ہوا تھا اس لئے اس حکم کا نفاذ یکم جنوری ۱۸۰۱ء

سے کیا گیا تھا۔ ویلزلی کو توقع تھی کہ کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرز جنوری ۱۸۰۱ء سے
بہت پہلے اس اسکیم کو منظور کرے گا اور زیادہ سے زیادہ یہ کالج یکم جنوری ۱۸۰۱ء
تک اپنا کام شروع کر دے گا حالانکہ "لارڈ ویلزلی" کی یہ توقع غلط ثابت ہوئی اور
فورٹ ولیم کالج مئی ۱۸۰۰ء سے پہلے اپنا کام شروع نہ کر سکا۔

کپتان طامس روبک (CAPT. THOMAS ROEBUCK) جو ڈاکٹر
جان گلکرائیسٹ کے انگلستان روانہ ہونے کے بعد ۱۸۰۴ء میں فورٹ ولیم کالج
کے پرنسپل مقرر ہوئے تھے انھوں نے اپنی مشہور کتاب (ANNIS OF
COLLEGE OF FORT WILLIM) (مطبوعہ ہندوستانی پریس کلکتہ ۱۸۱۹ء)
میں فورٹ ولیم کالج قائم ہونے کی تاریخ ۴ مئی ۱۸۰۰ء لکھی ہے۔ کپتان طامس روبک
کی یہ کتاب "فورٹ ولیم کالج" پر سب سے زیادہ مستند کتاب مانی گئی ہے جو
نایاب تو نہیں ہے پھر بھی کمیاب ضرور ہے یہ کتاب پہلی بار "اکرام علی" کے ہندوستانی
پریس (کلکتہ) میں چھپی تھی جس میں ۴ مئی ۱۸۰۰ء سے لے کر دسمبر ۱۸۱۸ء تک
فورٹ ولیم کالج کی تمام سرگرمیوں پر سرکاری کاغذات کے حوالوں سے تفصیلات
پیش کی گئی ہیں [1]

فورٹ ولیم کالج کی جس قدر تفصیلات اب تک سامنے آ چکی ہیں ان سے معلوم
ہوتا ہے کہ "فورٹ ولیم کالج" تقسیم کام کے لحاظ سے کئی حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا
جس میں ایک طرف تو تعلیمی شعبہ تھا دوسری طرف دار التصنیف و تالیف اسی
کے ساتھ "فورٹ ولیم کالج" پریس اور ایک عظیم الشان کتب خانے کا بھی پتہ چلتا ہے۔
"شعبہ تعلیم" کی تعلیم اردو ہندی کے علاوہ کسی اور شعبوں میں کی گئی تھی

---

[1] اس کتاب کا اشتہار سب سے پہلے کلکتہ گزٹ اپریل ۱۸۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔
مجھے یہ کتاب اب تک دستیاب نہ ہو سکی

جس میں ایک "دارالمباحثہ" بھی تھا جہاں انگریز طلبا مختلف موضوعات پر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے اور اس تقریری مقابلے میں انھیں کالج کی طرف سے انعامات بھی دئے جاتے تھے۔ اس قسم کے تقریری مقابلوں کی کافی تفصیلات اس مطبوعہ ریکارڈ میں موجود ہے جو فورٹ ولیم کالج کی طرف سے وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا ہے کالج کے تعلیمی شعبہ میں یوروپین پروفیسروں کے علاوہ مولویوں۔ پنڈتوں اور منشیوں کی تعداد اتنی تھی جو بعض وقت طلبا کی تعداد سے زیادہ ہو جایا کرتی تھی۔

تعلیمی شعبہ کی طرح کالج کا شعبہ تصنیف و تالیف بھی اردو ہندی عربی اور فارسی وغیرہ میں تقسیم تھا جس میں زیادہ تر قدیم کتابوں کے ترجمے کا کام انجام پاتا تھا۔ چند کتابوں کو چھوڑ کر کالج کی طرف سے جتنی کتابیں شائع کی گئی ہیں ان میں زیادہ تر کتابیں فارسی۔ عربی۔ ہندی اور سنسکرت کے ترجموں پر مشتمل ہیں۔ اس شعبہ میں کام کرنے والوں کو کالج میں عام طور پر "منشی" کے لقب سے موسوم کیا جاتا تھا جو اس دور میں ارباب علم و فضل ہی کے لئے مخصوص تھا۔

کالج سے متعلق جو پریس قائم کیا گیا تھا اس میں کالج کے دو ڈھائی سال بعد چھپائی کا کام شروع کیا گیا۔ یہ ٹائپ پریس وہی تھا جس کے اُردو فارسی کا ٹائپ کی ایجاد کا سہرا ۱۷۷۸ء میں ولکنس (WILKINS) کے سر رہا تھا۔

ہیلہڈ (HALHED) نے ولکنس کی اس شاندار جد و جہد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"مسٹر ولکنس جنھیں بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سول سروس میں کام کرتے کئی سال گذر چکے ہیں ایک علم دوست شخص ہیں جنھوں نے گورنر جنرل (وارن ہیسٹنگز) کے مشورہ بلکہ فرمائش سے بنگلہ حروف کا سٹ تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچایا جس میں انھیں

توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ ایک ایسے ملک میں جو اس وقت یوروپین صناعوں سے اس قدر بے تعلق رہا ہو۔ مسٹر ولکنس کو ان تمام مختلف کاموں کا بار خود اٹھانا پڑا جس کا تعلق دھات کے گلانے اور صاف کرنے۔ کھودنے۔ ڈھالنے اور چھاپنے سے ہے قابل ذکر امر یہ ہے کہ مسٹر ولکنس نے صرف ایجاد ہی کا کام نہیں کیا بلکہ اس کی تکمیل خود اپنے ہاتھ سے کی۔

(صفحہ ۷۴ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ)

انھیں ولکنس نے بنگالی کے علاوہ اردو فارسی ٹائپ حروف کا بھی سٹ تیار کیا تھا جو سب سے پہلی بار "فورٹ ولیم کالج" میں استعمال کیا گیا۔

"ولکنس کا فارسی ٹائپ۔ فارسی اور اردو زبان کے اس ٹائپ کا پہلا نمونہ تھا جو ہندوستان میں اٹھارہویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز میں دور اول میں استعمال کیا گیا۔ یہ امر پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ان زبانوں کے لئے ٹائپ کی چھپائی کا سلسلہ لیتھو کی چھپائی سے پہلے شروع ہو گیا تھا۔ یہی ٹائپ یا ایسے ٹائپ جو بعد میں اس کے نمونے پر بنائے گئے کئی سال تک کلکتہ اور بنگال میں استعمال ہوتے رہے نہ صرف سرکاری قوانین اور ضوابط اس ٹائپ میں چھاپے گئے بلکہ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج (قائم شدہ ۱۸۰۰ء) اور انگلستان کے ہیلی بری کالج (قائم شدہ ۱۸۰۵ء) کی کتابیں بھی اسی ٹائپ سے چھاپی گئیں۔"

(صفحہ ۸۴ "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ")

فورٹ ولیم کالج کا یہ ٹائپ پریس اسی "ولکنس ٹائپ" سے تعلق رکھتا تھا جس میں کالج کی تمام کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ کتابوں کی اشاعت کا عام قاعدہ یہ

تھا کہ موضوع کا انتخاب پہلے کالج کے ذمہ دار افراد کرتے تھے اس کے بعد جب یہ کتاب ترجمہ یا تالیف کے مراحل طے کر لیتی تھی تو اسے ایک کمیٹی کے سامنے منظوری کے لئے پیش کیا جاتا اس کے بعد اسے کالج اپنے مصارف سے شائع کرتی تھی جن مترجمین یا مؤلفین یا مصنفین کی کتابیں کالج کی طرف سے شائع کی جاتیں ان لوگوں کو مطبوعہ کتابوں کی کچھ جلدیں بھی دی جاتی تھیں ابھی تک اس سلسلہ میں کسی قسم کی تفصیلات مہیا نہیں ہو سکیں کہ کالج کی ان مطبوعات کی فروخت کس طرح ہوتی تھی البتہ یہ قیاس صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات بلا قیمت کے تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ اس قیاس کی تردید ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی "انگریزی ہندوستانی لغت" کے اس واقعہ سے ہوتی ہے جو اس لغت کی فروخت کے سلسلہ میں رونما ہوا تھا۔ اس لغت کی پہلی جلد تو ۱۷۹۶ء میں شائع کر دی گئی لیکن جب دوسری جلد کی طباعت کا سوال پیدا ہوا تو بڑی مشکل سے صرف ستر خریداروں کی تعداد مہیا ہو سکی حالانکہ چھپائی کے اخراجات کا تخمینہ اس سے کئی گنا زیادہ یعنی چالیس ہزار کیا گیا تھا۔ مجبوراً گلکرائسٹ نے اس کی اشاعت کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ کالج کے تعلیمی شعبے میں تو نہیں لیکن تصنیف و تالیف کے شعبے میں ابتدا ہی سے ارباب علم و فضل کی کمی بری طرح محسوس کی گئی تھی کیونکہ اس دور کے علماء اور ادیب ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کو باعث عزت و افتخار نہیں سمجھتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان جذبات میں وہ قومی جذبۂ خودداری بھی شامل ہو جو بنگال کے خونین انقلاب نے عام طور پہ پیدا کر دیا تھا چنانچہ خدائے سخن میر تقی میر کے ذکر میں ایک واقعہ ملتا ہے جس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ کالج قائم ہونے کے بعد بھی کالج کے ارباب حل و عقد کافی دنوں تک اس فکر میں رہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں سے ارباب کمال کو بلا کر کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف کو وسعت دے دی جائے۔ میرزا علی لطف اپنے تذکرہ "گلشن ہند" میں میر تقی میر

کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جس ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زباندانان ریختہ کے مقدمہ میں کلکتے سے لکھنؤ کو گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب" کے روبرو تقریب میر کی ہوئی لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے اور جوانان نومشق مرثیہ گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔"

زمانہ خوش طبیعتوں سے کبھی نہیں خالی ہے۔ اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا درخواست خالی ہے۔"

(صفحہ ۵۲ و ۱۵۳ تذکرہ گلشن ہند مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور ۱۹۰۶ء)

میر کی بات ختم ہوئی ۱۷ اکتوبر ۱۸۰۱ء کو کرنل اسکاٹ نے میر شیر علی افسوس کو بلایا۔ پانچ سو روپیہ زاد راہ دیا۔ دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ اور انھیں کلکتہ روانہ کر دیا۔

اسی طرح میر امن دہلوی اپنے دوست میر بہادر علی حسینی کے بلاوے پر کلکتہ پہنچے۔ سید حیدر بخش حیدری نے بینی نرائن جہاں کو ملازم رکھ دیا۔ اکرام علی اور خلیل الدین اشک علامہ تراب علی نامی خیرآبادی کی وساطت سے فورٹ ولیم کالج سے منسلک ہوئے۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح کالج قائم ہونے کے بعد عرصہ تک چلتا رہا۔

"۴ مئی ۱۸۰۰ء" کو کالج کا افتتاح لارڈ ولزلی نے کیا۔ ڈاکٹر جان گلکرا پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اردو کا شعبہ بھی انھیں کے سپرد کیا گیا۔ اور فورٹ ولیم کالج کی تحریک نظم و نسق کے پہلے دور میں داخل ہو گئی۔

کہنے کو تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کالج قائم کرنے کی اجازت دیدی تھی مگر ان لوگوں میں اکثریت ایسے خیال کے لوگوں کی تھی جو ہندوستان سے بجز روپیہ حاصل کرنے کے ایک پائی بھی یہاں خرچ کرنا اپنے تجارتی اصولوں کے منافی سمجھتے تھے

چنانچہ ابھی اس کالج کو قائم ہوئے دو برس بھی نہیں گذرے تھے کہ ڈائرکٹروں نے اس کے اخراجات پر سخت نکتہ چینی شروع کر دی۔ قدرتاً ان نکتہ چینیوں کا اثر سب سے زیادہ گلکرائسٹ پر پڑا لیکن زہر سے بھرے ہوئے پیالوں کو وہ شربت کی طرح پی گئے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اگر اس نازک موقع پر ان نکتہ چینیوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیا گیا تو یقیناً فورٹ ولیم کالج کی یہ تحریک بہت جلد آخری سسکیاں لے کر دم توڑ دے گی اور اس سے ہندوستانی ادبیات کو جو نقصان پہنچنا ہے وہ تو پہنچے گا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں کمپنی کا اقتدار بھی ایک حد تک خطرے میں پڑ جائے گا۔

ڈاکٹر گلکرائسٹ اور ڈائرکٹروں کے درمیان یہ کشمکش تقریباً چار سال تک جاری رہی۔ اس عرصہ میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب سنہ ۱۸۰۲ء میں کالج قائم ہونے کے سال ہی بھر بعد بورڈ آف ڈائرکٹرز نے فورٹ ولیم کالج توڑ دینے کا حکم تک دے دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس زمانے میں لارڈ ولیزلی کے بجائے کوئی دوسرا کمزور قسم کا گورنر جنرل ہوتا تو شاید گلکرائسٹ کا لگایا ہوا یہ پودھا سنہ ۱۸۰۲ء ہی میں مرجھا کر خشک ہو جاتا۔ مگر ولیزلی اس تمام کشمکش میں گلکرائسٹ کے شانہ بشانہ اس تحریک کی تائید و حمایت ہی کرتا رہا۔ ڈائرکٹروں کی جب یہ چال کامیاب نہ ہوئی تو انھوں نے ایک دوسرا پلٹا کھایا اور ایک تجویز پاس کر کے یہ طے کر دیا کہ فورٹ ولیم کالج کے بجائے خود انگلستان میں ایک اسی قسم کی تعلیم گاہ قائم کر دی جائے جس کے امتحانات پاس کئے بغیر کوئی انگریز ہندوستان نہ بھیجا جائے۔

پانی اب سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ کمپنی نے ابھی اس نئی تحریک کے نفاذ کے لئے سنہ ۱۸۰۵ء کا تعین بھی کر دیا تھا ادھر لارڈ ولزلی کی انگلستان واپسی کی خبریں مشتہر ہو رہی تھیں۔ گلکرائسٹ نے سنجیدگی کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ انھیں ولیزلی کے انگلستان

واپس جانے سے پہلے ہی ریٹائر ہو جانا چاہئے چنانچہ گلکرائسٹ نے خرابی صحت کا بہانہ کر کے پنشن کی درخواست دے دی جسے کمپنی نے بلا کسی حیل و حجت کے منظور کر لیا اور یہ سنہ ۱۸۰۴ء میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن واپس چلے گئے۔

لارڈ ولیزلی ابھی تک اپنے عہدے پر برقرار تھے۔ سنہ ۱۸۰۵ء میں "ہیلی بری کالج" HAILEY BURY COLLEGE کے نام سے انگلستان میں ایک اور کالج قائم کر دیا گیا۔ لارڈ ولیزلی بھی اسی سال سنہ ۱۸۰۵ء میں انگلستان واپس چلے گئے لیکن فورٹ ولیم کالج بدستور سابقہ بنیادوں پر کام کرتا رہا۔

ڈاکٹر گلکرائسٹ کے جانے کے بعد سنہ ۱۸۰۴ء میں "کپتان ٹامس روبک" کا تقرر اسی جگہ پر ہو گیا۔ "روبک" فوجی ملازمت سے کالج میں پہنچے تھے اور ڈاکٹر گلکرائسٹ کے ان ہم خیال ساتھیوں میں تھے جنھوں نے گلکرائسٹ کے چلے جانے کے بعد بھی ان کے مشن کو ہر طرح کامیاب بنانے کی کوشش کی تھی۔ انھیں اردو سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ ابتداءً یہ کالج کے معتمد اور ممتحن کے عہدوں پر بھی فائز رہ چکے تھے۔ انھیں نثری کتابوں کے علاوہ اردو نظم سے بھی ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا۔ فورٹ ولیم کالج میں مشاعروں کی ابتدا انھیں کے زمانے میں ہوئی اور چند سال کے اندر ان ادبی محفلوں نے "فورٹ ولیم" کی زندگی میں ایک خالص مشرقی تہذیب کا ایسا یادگار ماحول پیدا کر دیا جس کی مثال اس دور میں دلی، فیض آباد اور لکھنؤ کے بعد شاید ہی کہیں اور نظر آتی ہو۔

ان مشاعروں میں فورٹ ولیم کالج کے متوسلین کے علاوہ کلکتہ کے وہ ارباب شعر و سخن بھی حصہ لیتے تھے جو عظیم آباد اور مرشد آباد کی مثالی ادبی صحبتوں سے لطف اندوز ہو چکے تھے۔ منشی بینی نرائن جہاں، مرزا جان طپش، خلیل الدین رشک اور کاظم علی جوان دہلوی ان محفلوں کی جان سمجھے جاتے تھے۔

"بنگال میں اردو" کے مصنف نے کاظم علی جوان دہلوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"۱۸۱۵ء میں فورٹ ولیم کالج کے تحت جتنے مشاعرے ہوئے ان میں برابر شرکت کی۔"

صفحہ ۱۴ "بنگال میں اردو" مطبوعہ اختیار پریس حیدرآباد پاکستان جنوری ۱۹۵۵ء

مؤلف "ارباب نثر اردو" نے فورٹ ولیم کالج کے مشاعروں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"خود فورٹ ولیم کالج کی طرف سے ہر سال غالباً ۲۵ر جولائی کو نہایت اہتمام کے ساتھ مشاعرہ منعقد کیا جاتا۔ وہاں کے تقریباً تمام شعراء اس میں حصہ لیتے تھے ۱۸۱۵ء کے ایک ایسے مشاعرے کی غزلیں "دیوان جہاں" (بینی نرائن جہاں) میں بطور ضمیمہ مندرج ہیں ان میں جوان اور ان کے دو نو بیٹوں ممتاز و عیاں (مرزا قاسم علی ممتاز و مرزا ہاشم علی عیاں) کی غزلیں بھی ہیں اکثر تذکرہ نویسوں نے ان کا ذکر ہی نہیں کیا۔"

(صفحہ ۱۹۷ ارباب نثر اردو)

ٹامس روبک کا ذکر پروفیسر سید محمد (عثمانیہ) نے "ارباب نثر اردو" میں کیا ہے۔

"ڈاکٹر گلکرائسٹ کے بعد کپتان ٹامس روبک نے اردو اہل قلم کی سب سے زیادہ سرپرستی کی۔ وہ ابتداءً فوج میں ملازم ہوئے اور لفٹنٹ اور پھر کپتان کے درجے تک ترقی کی ان کو اردو زبان اور اس کے ادب سے خاص شغف تھا۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ کے فیض صحبت سے ان میں اردو کا بہت اعلیٰ ذوق پیدا ہوگیا تھا وہ پہلے فورٹ ولیم کالج کے معتمد اور ممتحن مقرر ہوئے جب ۱۸۰۴ء میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کالج کی صدارت اور اردو پروفیسری سے سبکدوش

ہو گئے تو یہی ان کی جگہ مامور ہوئے۔

مصنفین و مؤلفین کی سرپرستی کر کے بڑا نام پیدا کیا۔ بہت سے اہل قلم کو تصنیف و تالیف کی ترغیب دی اور متعدد کتابیں شائع کرائیں ان میں سے ایک منشی بینی نرائن جہاں ہیں جو کپتان روبک ہی کی بدولت مصنف بنے۔ کپتان روبک کو عام نثری کتابوں کے علاوہ اردو شاعری سے بھی خاص دلچسپی تھی یہی وجہ ہے کہ بینی نرائن جہاں سے شعرائے اردو کا تذکرہ لکھوایا مرزا جان طپش نے جو کلکتہ کے مشہور اور فورٹ ولیم کالج کے متوسل تھے اپنی مثنوی "بہار دانش" میں ان کی تعریف عجیب پُر لطف انداز میں کی ہے۔

کپتان روبک "ہندوستانی لغت" کی تدوین میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کے شریک کار اور ان کی تجویز کے ہر طرح مدد و معاون تھے۔ بطور خود بھی انھوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں ان میں سے ایک "لغت جہاز رانی" ہے اس میں بحریہ اور جہاز رانی کی تمام اصطلاحیں اور الفاظ انگریزی اردو میں جمع کئے گئے ہیں اور ایسے الفاظ اور جملوں کا ذخیرہ کثیر ہے جو انگریز کمانداروں کو میدان جنگ اور "بیرکس" میں ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ بول چال میں کار آمد ہو سکتے تھے پھر اردو کے قواعد پر ایک مختصر رسالہ بھی اس کے ساتھ بطور ضمیمہ شریک کیا۔ اس مفید لغت کی پہلی اشاعت کلکتہ سے ۱۸۱۱ء میں ہوئی۔ دو سال بعد دوسرا اڈیشن لندن سے شائع ہوا کپتان روبک کی دوسری کتاب "ترجمان ہندوستانی" (ہندوستانی انٹرپریٹر) ہے اس میں قواعد زبان اردو کے ابتدائی مسائل مندرج ہیں یہ کتاب پہلے لندن سے ۱۸۲۴ء میں اور پھر پیرس و لندن سے ۱۸۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اہل یورپ کو اردو زبان کی تحصیل میں ان کتابوں سے بہت مدد ملتی رہی ہے کپتان روبک

نے ان کتابوں کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کی ایک مبسوط تاریخ بھی انگریزی زبان میں لکھی ہے"[1]

(صفحہ ۳۳ لغایتہ ۳۵ - ارباب نثر اردو)

دوسری زبانوں کی طرح اردو کے شعبہ تصنیف و تالیف میں کپتان روبک کے علاوہ کپتان جوزف ٹیلر۔ جان شیکسپیئر کپتان جیمس ماؤنٹ۔ ڈاکٹر اسپرنگر۔ اور براہم لوکٹ وغیرہ کا شمار ان انگریزوں میں کیا جاتا ہے جنھیں ہندوستانی ادبیات سے خاص لگاؤ تھا اور ان لوگوں نے کسی نہ کسی انداز میں اردو کی خدمت کی۔

کپتان براہم لوکٹ جو فوجی ملازمت سے کالج کی خدمات پر مامور کئے گئے تھے اکرام علی کے خاص شاگرد تھے۔ لوکٹ ایک عرصہ تک فورٹ ولیم کالج کے سکریٹری رہے۔ لیکن ان کے عروج کا خاص زمانہ ڈاکٹر گلکرائیسٹ کے انگلستان جانے کے (۱۸۰۴ء) بعد شروع ہوا کیونکہ کپتان ٹامس روبک ان کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ دوستوں میں تھے۔ اکرام علی کی ترقی کا آغاز بھی اسی وقت سے ہوا اور لوکٹ کی کوششوں نیز علامہ تراب علی نامی کی سرپرستی نے آگے بڑھ کر ان کی ترقیوں میں اور بھی چار چاند لگا دیے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں اور فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل و عقد کے درمیان کالج قائم ہونے کے دوسرے ہی سال بعد جو کشمکش شروع ہوئی تھی وہ گھٹنے کے بجائے برابر بڑھتی ہی گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصنفین۔ مولفین اور مترجمین کامل سکون سے بیٹھ کر کوئی کام نہ کر سکے۔ کچھ لوگوں کو تو کالج میں مستقل طور پر ملازم بھی نہیں رکھا گیا صرف ایک آدھ کتاب لکھوا کر کچھ معاوضہ دے دیا

---

[1] "ANNIS OF COLLEGE OF FORT WILLIM" مطبوعہ ہندوستانی پریس کلکتہ ۱۸۱۹-۱۸۱۰ء۔

گیا اور وہ چلے گئے۔ مشاہیر میں جو لوگ عرصہ تک کالج کی ملازمت سے منسلک رہے ان کی مدت ملازمت بھی کسی طرح دس پندرہ سال سے زیادہ نہیں قرار دی جا سکتی کالج کے عروج کا خاص زمانہ زیادہ سے زیادہ ۱۸۲۰ء تک سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۔ سید حیدر بخش حیدری۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں کلکتہ پہنچے۔ کالج قائم ہوتے ہی دار التصنیف میں ملازم ہو گئے۔ لیکن اس کے بعد ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں انہیں بنارس میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے ہوئے پایا گیا۔ ۱۸۲۳ء/۱۲۳۸ھ میں وفات پائی۔ یعنی بارہ چودہ سال سے زیادہ کالج کی ملازمت میں نہیں رہے۔

۲۔ میر بہادر علی حسینی۔ کالج قائم ہونے کے سال ہی بھر کے اندر میر منشی کی جگہ پر تقرر ہوا۔ ۱۸۱۶ء میں ان کی آخری تالیف "رسالہ گلکرائیسٹ" کلکتہ سے چھپا۔ اس کے بعد ان کا ذکر کسی جگہ نظر نہیں آتا۔ ان کی آخری کتاب ۱۸۰۵ء میں ختم ہوئی معلوم نہیں کہ وہ کب تک کالج کے متوسل رہے" صفحہ ۱۱۱ ارباب نثر اردو)۔

۳۔ میر شیر علی افسوس۔ ۱۸۰۱ء/۱۲۱۵ھ میں کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف میں پہنچے۔ ۱۸۰۹ء/۱۲۲۴ھ میں انتقال کیا۔

۴۔ مرزا علی لطف۔ ۱۸۰۱ء سے پہلے کلکتہ پہنچ گئے تھے۔ تذکرہ "گلشن ہند" ۱۸۰۱ء میں ترتیب دے کر پیش کیا۔ لیکن انھیں باقاعدہ کالج کی ملازمت میں جگہ نہیں دی گئی۔ "ارباب نثر اردو" میں لکھا ہے۔

"مرزا علی لطف ۱۸۰۱ء میں "گلشن ہند" کی تالیف سے فارغ ہو کر حیدرآباد آئے۔

(صفحہ ۱۳۱ ارباب نثر اردو)

۵۔ مولوی حفیظ الدین احمد۔ قیام کالج کے بعد ہی شعبہ تعلیم میں ملازم ہو گئے تھے مگر ۱۸۱۰ء سے پہلے وہ دلی جا چکے تھے اور وہاں دہلی کی ریزیڈنٹ کے میر منشی مقرر ہو گئے تھے۔

(۶) مظہر علی ولا۔ ۱۸۱۴ء تک زندہ تھے۔

(۷) بینی نرائن جہاں۔ ۱۸۱۴ء کے گرد و پیش فورٹ ولیم کالج میں تھے۔

(۸) اکرام علی۔ ۱۸۱۴ء میں کالج کے شعبہ تالیف و ترجمہ سے نکل کر لائبریری میں پہنچے۔

"فورٹ ولیم کالج" کی ادبی۔ تالیفی اور تصنیفی سرگرمیوں میں جو جوش و خروش انیسویں صدی کے ابتدائی پندرہ برس رہا وہ ۱۸۱۵ء تک بتدریج اور بھی سرد ہوتا گیا کیونکہ کمپنی کے ڈائرکٹر مسلسل فورٹ ولیم کالج توڑ دینے کی جد و جہد میں مصروف تھے۔ ۱۸۰۵ء میں "ہیلی بری کالج" قائم کرنے کے باوجود ڈائرکٹروں کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اس عرصہ میں شعبہ تصنیف و تالیف کے بجٹ میں بھی کمی کی گئی یہاں تک کہ "کلکتہ ریویو" (جلد ۱۳۔ صفحہ ۴۴ الغایتہ ۱۴۸) کے بیان کے مطابق ۱۸۱۳ء سے لے کر ۱۸۳۱ء تک فورٹ ولیم کالج کی طرف سے اٹھارہ سال میں صرف اٹھتیس کتابیں "اردو زبان" کی شائع کی گئیں پھر بھی یہ تحریک اتنی سخت جان ثابت ہوئی کہ نہ کالج بند ہوا نہ شعبہ تصنیف و تالیف۔

ڈائرکٹروں کے معاندانہ رویہ میں اب بھی کوئی ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا تھا۔ "ہیلی بری کالج" کی طرح انگلستان میں ایک دوسرے کالج کی بنیاد ڈال دی گئی ۱۸۱۸ء میں اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ (ادارہ شرقیہ) کے نام سے ایک ادارہ "لیسٹر اسکوائر" میں قائم کیا گیا جس کا مقصد ہندوستان آنے والے ڈاکٹروں کو طبی تعلیم دینا تھا۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے اسی زمانے میں اپنے طور پر ایک اپنا ذاتی ادارہ علوم مشرقی کے متعلق بھی قائم کر لیا تھا۔ انھیں مجبور کیا گیا کہ وہ "لیسٹر اسکوائر" کے ادارہ میں آجائیں۔ گلکرائسٹ کمپنی کی مالی پالیسی سے بہت بددل تھے لیکن شائد حب الوطنی کے جذبے سے مجبور ہو کر انھیں اپنا کام ختم کرکے اس کالج کی خدمات قبول کرنا پڑیں۔ یہ کالج

بھی مشکل سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر سات سال چلا ہوگا کہ ڈائرکٹروں کی کنجوسی اور خست نے اسے بھی ۱۸۲۵ء میں موت کی نیند سلا دیا۔

فورٹ ولیم کالج اب بھی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا ڈائرکٹروں کی شدید مخالفت کا سلسلہ بھی جاری تھا اور کالج کی تحریک بھی آہستہ آہستہ زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔ اس عرصہ میں بار بار ہندوستانی کی سیاست میں مد و جزر پیدا ہوا۔ حالات بدلے۔ حکمرانی کے طریقوں پر قابو حاصل کیا گیا۔ مالیاتی پالیسی میں بھی رد و بدل ہوا آخر کار ڈائرکٹروں کی جیت ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج ۱۸۵۴ء میں ایک مدّ فضول قرار دیکر توڑ دیا گیا۔

جہاں تک فورٹ ولیم کالج کے چوّن سالہ دور حیات کا تعلق ہے اس غیر معتدل سبک روی کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فورٹ ولیم کالج کی یہ تحریک ہندوستان کے تصنیفی شعور کی سب سے پہلی اجتماعی تحریک تھی اب تک اس قسم کا جو کام نامکمل طور پر انجام پایا تھا اس کی پشت پر ہندوستان کی دیسی ریاستوں اور امراء و نوابین کے سوا کوئی نہ تھا اس لئے ہندوستانی ادبیات کے تصنیفی شعور میں کسی قسم کی اجتماعی پختگی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی تحریک کا نیم سیاسی پس منظر دراصل ایک ایسی زبان و ادب کی تخلیق تھا جو درباری چاؤ چونچلوں سے بلند ہو کر زیادہ سے زیادہ عوام سے قریب تر ہونے میں ممد و معاون ثابت ہوتا۔ اب تک اردو زبان فارسی اثرات کے بوجھ سے اتنا دبی ہوئی تھی کہ عوام لاکھ کوششوں کے باوجود اسے اپنانے میں مشکلات محسوس کرتے تھے۔ مقفی اور مسجع عبارتوں کی بھول بھلیاں۔ ادق علمی ترکیبوں کا ہیر پھیر۔ اور مصنوعی عبارت آرائی کے چکر نے اس نوخیز زبان کو ایسے بھنور میں ڈال دیا تھا جہاں اس نئی کونپل کے سرسبز و شاداب ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عوام ان دشواریوں کو محسوس کر رہے تھے لیکن امراء کے خس خانوں میں ان کی صدا ایسی ہی تھی جیسے نقار خانے میں طوطی کی آواز۔ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ جنھوں نے

کافی حد تک اُردو زبان کے روشن مستقبل پر غور کیا تھا پہلی بار اس خیال کو سے کر اُٹھے کہ اس زبان کی ارتقا اسی وقت ممکن ہے جب اسے تکلفات ۔ رسمیات اور عبارت آرائیوں کے منجدھار سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اور فورٹ ولیم کالج گلکرائسٹ کے انھیں خوابوں کی ایک عملی تعبیر تھی! آغا محمد باقر "تاریخ نثر اردو" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"شمالی ہند میں اس وقت فارسی کا عام رواج تھا کیونکہ فارسی درباری زبان تھی ہر قسم کی تحریریں فارسی ہی میں لکھی جاتی تھیں۔ نثر نگاری میں ظہوری اور بیدل کی پیروی ہوتی تھی۔ اردو میں بھی فارسی نثر کی اقسام یعنی مرجز، مقفیٰ مسجع اور عادی وغیرہ رائج تھیں معمولی معمولی باتیں نہایت پر تکلف عبارت میں بیان کی جاتی تھیں ان دنوں نظم کا رواج عام تھا کیونکہ نظم لکھنا قابلیت اور علمیت کی نشانی سمجھی جاتی تھی گویا نظم کی مقبولیت عام نے نثر کو گوشہ گمنامی میں ڈال رکھا تھا۔ یہی اسباب اس کی ابتدائی تاخیر اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ جیسے دور دراز مقام سے منصۂ شہود پر آنے کا باعث ہوئے۔

(صفحہ ۲۰۷۔ تاریخ نثر اردو مطبوعہ کیپٹل پریس لاہور سنہ ۱۹۳۸ء)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اگر اُردو نثر نے فورٹ ولیم کالج کی گود میں یہ نئی کروٹ نہ لی ہوتی تو ۱۸۳۵ء میں نہ تو اردو زبان کو سرکاری زبان کا بننے کا مرتبہ حاصل ہوتا نہ آج اس زبان کو وہ "ہندوستانگیر" فوقیت حاصل ہوتی جس سے سیاسی طور پر انکار کرنے کے باوجود آج بھی تمام سیاسی اور غیر سیاسی پارٹیاں اظہار خیال کا سب سے زیادہ آسان ذریعہ سمجھنے پر مجبور ہیں۔

آج کے بدلے ہوئے سیاسی رجحانات میں زبان و ادب کا تاریخی تجزیہ کرتے ہوئے ہمیں اپنے سامنے صرف ایسٹ انڈیا کمپنی اور بدیسی سامراج کے بہیمانہ طرز

حکومت ہی کو نہ رکھنا چاہئے بلکہ پیچھے مڑ کر اس ماضی کی طرف بھی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جس میں تعمیر یا تخریب کی رنگ آمیزیوں نے نشو و نما پائی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی اور لسانی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے وقت ہندوستان کے بعض ممتاز بزرگ بھی جادۂ اعتدال سے ڈگ گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس سیاسی دور کے چند اجاگر پہلوؤں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ نہ کر سکے۔ علامہ عبد اللہ یوسف علی کی مثال ہمارے پیش نظر ہے جنھوں نے فورٹ ولیم کالج کے ایک بہت بڑے افادی پہلو کو نمایاں کرنے کے بجائے سبک اور ہلکا کر دیا ہے فرماتے ہیں۔

"اس امر کا اکثر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اُردو نثر کی ابتدا فورٹ ولیم کالج سے ہوئی ہے؟ یہ دعویٰ صرف ایک حد تک صحیح ہے دہلی کے میر امن جیسے آدمیوں نے سلطنت مغلیہ کے دار الحکومت میں اپنا سب کچھ کھو دیا تھا کہ انھیں کلکتہ میں ملازمت مل گئی اور وہ لارڈ ویلزلی کی مدح کے گیت گاتے تھے میر امن نے گورنر جنرل (ویلزلی) کی نسبت ذیل کے مبالغہ آمیز الفاظ استعمال کئے ہیں:۔

"اشرف الاشراف جن کی تعریف میں عقل حیران اور فہم سرگرداں ہے"

"ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔

"صاحب ذی شان نجیبوں کے قدر دان"۔!

دراصل ہندوستانی زبان کی سرپرستی نتیجے کے لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن نوجوان برطانوی افسروں کے لئے ایسے ادب کی جو نئی صلاحیت پیدا ہوگئی اور جوان کو سکھائی گئی اس سے منشیوں اور ان لوگوں میں جو سرکاری حلقوں میں آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھتے تھے ادب کی ایک نئی داغ بیل پڑ گئی۔

رہے پرانے طبقہ کے علماء یعنی "متمدن انسان ذی شعور" جن کا حلقہ دلی اور لکھنؤ میں قائم تھا انھوں نے اس کی ہستی اُڑادی خود میر امن نے بھی کلکتہ میں اپنی کتاب "باغ و بہار" کے دیباچے میں دو ضمنی دلائل سے اپنے نئے محاورے کے متعلق عذر خواہی کی ہے۔ اول یہ کہ وہ غیر ملکوں کی تعلیم کے لئے لکھ رہے تھے۔ دوئم یہ کہ دہلی کی تباہی اور بربادی نے وہاں کے رہنے والوں کو دور دراز مقامات میں منتشر اور ان کی اصلی زبان کو مخلوط کر دیا تھا۔ کسی اہل علم نے کبھی "باغ و بہار" یا فورٹ ولیم کالج کی دوسری درسی کتابوں کو بطور ادب کے نہیں پڑھا۔"

(صفحہ ۱۱۰۔۱۱۱ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ)

علامہ عبداللہ کے انتہائی محتاط الفاظ سے دو ہی نتیجے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ قدیم طرز نگارش میں مصنوعی بناوٹ اور بعید از عقل تکلفات ایک سنجیدہ اور ستھرے ادب کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتے۔

۲۔ فورٹ ولیم کالج کی کتابیں جو کافی حد تک اس قسم کے قیود سے آزاد ہیں "اہل علم" کے نزدیک ادبی اہمیت نہیں رکھتیں۔

ہوسکتا ہے ان متضاد نظریات سے انھوں نے اپنے موضوع (انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ) کے لئے کوئی ایسا میدان ہموار کیا ہو جہاں تک میری بے بضاعتی کی رسائی نہ ہوسکی ہو لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں فورٹ ولیم کالج کی پوری تاریخ سامنے ہونے کے باوجود ان کا "تہذیبی تجزیہ" یہ نتیجہ نکالنے میں کامیاب نہیں ہوا کہ تہذیبی اور لسانی انقلابات جادو کے زور پر رونما ہوا کرتے ہیں۔ زبانیں تمدن اور تہذیب رفتہ رفتہ مٹتے ہیں اور آہستہ آہستہ بدلا کرتے ہیں یہ کہنا کہ میر امن نے لارڈ ولیزلی اور ڈاکٹر گلکرائسٹ کی تعریف میں جن رسمی الفاظ کا استعمال کیا ہے وہ

ان کی اس شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ تھی جس سے انھیں دلی لٹتے وقت دوچار ہونا پڑا تھا" ایک نظریاتی خود فریبی ہے۔ میر امن پر کیا منحصر اس زمانے میں فورٹ ولیم کالج کے تمام نثاروں نے اپنے بدیسی آقاؤں کے متعلق کم و بیش اسی قسم کے "تعظیمی الفاظ" کا استعمال کیا ہے ۔۔۔ اور ان سب لوگوں کے بارے میں یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دلی کے انقلاب سے اتنے ہی متاثر تھے جتنا اثر میر امن پر پڑا ہوگا۔

جس زمانے میں میر امن یا ان کے دوسرے ساتھیوں نے اپنے انگریز آقاؤں کے متعلق اس قسم کے "تعظیمی الفاظ" استعمال کئے تھے اگر علامہ عبداللہ اس دور کے خالص مشرقی ماحول کو اپنے سامنے رکھتے تو یقیناً وہ بھی یہی نتائج نکالنے پر مجبور ہو جاتے کہ دلی کے قلعہ معلیٰ کا پیدا کیا ہوا ماحول اس وقت تک زندہ تھا۔ راجوں اور نوابوں کے دربار اس وقت تک "ایوانہائے دولت" کی شکل میں جگمگا رہے تھے اور ہندوستان کا بیشتر حصہ ایرانی اور تورانی امراء کی تہذیب میں اس حد تک ڈوبا ہوا تھا جسے میر امن کیا کوئی بھی حشم زدن میں مٹا نہیں سکتا تھا۔

اب رہا فورٹ ولیم کالج کی لکھوائی ہوئی ادبی افادیت کا سوال؟ اس بات کو اس حد تک تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت کی سرکاری زبان چونکہ فارسی تھی اور خواص زیادہ تر درباری اثرات کے تحت عربی اور فارسی علوم سے زیادہ قریب تر تھے اس لئے ان طبقوں میں کالج کی کتابوں نے مقبولیت حاصل نہیں کی۔ اس سے زیادہ نہ تو ان کتابوں کی ادبی افادیت کا دامن کبھی تعلیم کی وجہ سے وسیع ہو سکتا تھا نہ یہ کہنا درست ہے کہ ان کتابوں کی کوئی ادبی حیثیت ہی نہیں تھی۔

دنیا کی کوئی تحریک اپنے ابتدائی درجات میں صرف ایک تحریک ہی ہوتی ہے! اس کی کامیابی کا فیصلہ تو آنے والی نسلیں کرتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کی تحریک بھی اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے محدود ہونے کے باوجود بہت کچھ کامیاب

ہوئی۔ اور وہ بھی اتنی کہ آج ہندوستان کے ادبی رجحانات کا رُخ بدلا ہوا نظر آتا ہے
اس حقیقت سے کوئی لاکھ انکار کرے مگر حقیقت بہرحال حقیقت ہے اور تاریخ کے
کسی بھی موڑ پر ہمیں یہ تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ اگر اٹھارہویں صدی میں فورٹ ولیم کالج
کی تحریک شروع نہ ہوئی ہوتی تو آج ہندوستان غیر ملکی علوم و فنون کے ذخیرہ دل
سے اتنا مالا مال نظر نہ آتا۔ اور نہ سیاسی و اقتصادی طور پر ہم اتنے طاقتور ہو سکتے
کہ ہمارا نام دُنیا کے دوسرے متمدن ممالک کے ساتھ لیا جاتا۔
ڈاکٹر سید عبداللطیف (اُردو پر انگریزی لٹریچر کا اثر) میں تحریر فرماتے ہیں۔[1]

"فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات ہی کی بدولت ایک بڑے درجہ تک
اُردو نثر کا معیار اس بلند مقام تک پہنچا ہے جو حال کے زمانے میں اُردو
مصنفین کو میسر ہوا ہے۔"

ڈاکٹر عبداللطیف کے یہ الفاظ اس تاریخی حقیقت کا نچوڑ ہیں جو اُردو
زبان و ادبیات کے نئے موڑ نے آج پیدا کر دیا ہے "داستان تاریخ اردو" کے
مصنف پروفیسر حامد حسن قادری نے اسی بحث پر زیادہ شرح و بسط کے ساتھ تبصرہ
کیا ہے جسے اردو زبان و ادب کا ایک گہرا مطالعہ کہنا چاہیئے۔ لکھا ہے قادری نے۔

"(۱) فورٹ ولیم کالج کے قائم ہونے سے پہلے اور جاری رہنے کے زمانے
میں کالج و کلکتہ سے باہر بھی اردو تصانیف نثر کا سلسلہ جاری تھا جیسا کہ
پہلے ذکر کیا گیا اور آئندہ لکھا جائے گا لیکن کوئی باقاعدہ اور متحدہ کوشش
نہ تھی بلکہ متفرق طور پر لوگ کچھ کچھ لکھ رہے تھے۔ کالج کے منتظموں نے
سلیس نثر نگاری کا مقصد متعین کر کے کام شروع کیا۔ یہ گویا پہلا علمی اور
ادبی ادارہ یا ندوہ تھا۔

---

[1] صفحہ ۸۰ "اردو پر انگریزی لٹریچر کا اثر"

(۲) اُردو ٹائپ کا پہلا مطبع اسی کالج کی طرف سے قائم کیا گیا اور بعض
کتابیں خاص حسن و خوبی کے ساتھ شائع کی گئیں۔

(۳) کالج کی یہ خدمات کم و بیش بیس برس جاری رہیں اس عرصہ میں
اٹھارہ مصنفین نے پچاس کتابیں اُردو میں تصنیف۔ تالیف اور ترجمہ
کیں۔ اس زمانے میں (۱۸۰۱ء سے ۱۸۲۰ء تک) فورٹ ولیم کالج سے
باہر تمام ہندوستان میں اتنی کتابیں نثر اُردو کی مشکل سے لکھی گئی ہوں گی
اور جتنی لکھی گئیں ان میں سے اکثر کو آج تک چھپنا نصیب نہیں ہوا۔

(۴) بیرون کالج کی کوئی تصنیف زبان و محاورہ کی سلاست اور
اسلوب بیان کی دلکشی میں میر امن۔ حیدری۔ اکرام علی وغیرہ کی کتابوں
سے بہتر اور "داستان امیر حمزہ" و "اخوان الصفا" سے زیادہ ضخیم نہیں ہے
(۵) کالج کی تالیفات میں مختلف ضروری۔ مفید اور دلچسپ موضوع
کتابیں شامل ہیں یعنی فسانہ۔ تذکرہ۔ صرف و نحو۔ تاریخ اخلاق۔ فقہ اسلام۔
ترجمہ قرآن مجید۔ ترجمہ انجیل مقدس۔

(۶) سب سے بڑی خدمت اس کالج کی یہ ہے کہ سلیس نگاری کی
شاہراہ قائم کر دی۔ اگر یہ محکمہ جاری نہ ہوا ہوتا تو بھی ارباب علم و ادب
اس راستے پر آتے۔ لیکن دیر لگتی۔ ان کتابوں کا نمونہ موجود ہونے پر
بھی لوگوں نے اس طرف کم توجہ کی اور بہت آہستہ آہستہ اس راہ پر آئے۔"
(صفحہ ۱۳۹ لغایتہ ۱۴۱ داستان تاریخ اردو)

قادری کا یہ کہنا صحیح ہے کہ اگر فورٹ ولیم کالج قائم نہ ہوتا تب بھی بدلے
ہوئے حالات کے ساتھ اردو ادب کے رجحانات میں تبدیلی ہوتی اور ضرور ہوتی
مگر آہستہ روی کے ساتھ۔ اس کا ثبوت ان کتابوں سے ملتا ہے جو اسی دور میں

کالج سے باہر انفرادی طور پر مختلف لوگوں نے لکھی ہیں۔ اگرچہ ان کتابوں کے طرز تحریر اور کالج کے اسلوب نگارش میں کافی نمایاں فرق ہے پھر بھی ان مصنفین اور مؤلفین کے انداز بیان میں ارتقائی رجحانات کی کافی جھلک پائی جاتی ہے قادری نے ان کتابوں کی بھی ایک مختصر فہرست دی ہے جو کچھ اضافے کے ساتھ پیش ہے

۱۔ مولوی کریم الدین دہلوی۔ "ترجمہ تاریخ ابی الفدا" سنہ ۱۸۰۰ء ۱۲۱۵ھ

۲۔ مولوی حافظ احمد۔ "سراج الایمان" سنہ ۱۸۰۰ء ۱۲۱۵ھ

۳۔ مولوی محمد صفا۔ "زاد آخرت" سنہ ۱۸۰۲ء ۱۲۱۷ھ

۴۔ حافظ محمد علی۔ "راہ نجات" سنہ ۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ

۵۔ مولوی محمد حیات "سراج الحیات"۔ سنہ ۱۸۰۶ء ۱۲۲۱ھ

۶۔ مولوی عبد القادر۔ "گلشن دیں" سنہ ۱۸۱۲ء ۱۲۲۷ھ

۷۔ مولوی محمد خالق اکبرآبادی ــ "مخزن الفوائد"۔ سنہ ۱۸۱۳ء ۱۲۲۸ھ

۸۔ مولوی ولی محمد۔ "میخانہ وحدت" سنہ ۱۸۲۰ء ۱۲۳۶ھ

۹۔ مولوی قادر بخش پانی پتی "مختصر القواعد"۔ سنہ ۱۸۲۶ء ۱۲۴۲ھ

کالج کا سرگرم دور تالیف کچھ بھی رہا ہو مگر جہاں تک کالج کے زمانہ قیام کا تعلق ہے وہ مسلمہ طور پر سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۵۴ء تک رہا ہے اس لیے سنہ ۱۸۵۴ء تک کی اردو کتابوں کو اس میں شامل نہ کرنا ایک قسم کی کمی ہوگی ذیل میں ان کتابوں کا اضافہ کیا جا رہا ہے جس کی فہرست سنہ ۱۹۲۰ء میں انڈیا آفس لائبریری (لندن) سے مولانا سلیمان ندوی نے ترتیب دی تھی۔[1]

۱۔ خلاصہ علم الارض (مع انگریزی) کلکتہ سنہ ۱۸۲۲ء

۲۔ علم ہیئت۔ مترجمہ لفٹنٹ میلیس۔ لکھنؤ سنہ ۱۸۳۲ء

[1] ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جون سنہ ۱۹۲۰ء صفحات ۲۰۸ لغایتہ ۲۱۷

۳۔ "مفتاح الافلاک" (عبد السلام) کلکتہ سنہ ۱۸۳۳ء

۴۔ "مراۃ الاقالیم" کلکتہ سنہ ۱۸۳۶ء

۵۔ نظام آسمانی (انگریزی مع ترجمہ ہندوستانی) کلکتہ سنہ ۱۸۳۶ء

۶۔ مختصر احوال نظام آسمانی آگرہ سنہ ۱۸۴۰ء

۷۔ مقاصد العلوم (ترجمہ انگریزی) سید محمد میر کلکتہ سنہ ۱۸۴۱ء

۸۔ علم حکمت (میکنس) کلکتہ سنہ ۱۸۴۳ء

۹۔ ترجمہ شمیئیہ مولوی سید محمد سنہ ۱۸۴۴ء

۱۰۔ تحصیل فی جر الثقیل۔ سید احمد خاں آگرہ سنہ ۱۸۴۴ء

۱۱۔ ترجمہ معاشیات مل۔ وزیر علی دہلی سنہ ۱۸۴۴ء

۱۲۔ کھیت کرم (مصنفہ کالی رائے) تین حصے دہلی سنہ ۱۸۴۶ء، سنہ ۱۸۴۹ء، سنہ ۱۸۵۰ء۔

۱۳۔ اصول علم انتظام مدن ترجمہ انگریزی دھرم نرائن دہلی سنہ ۱۸۴۶ء

۱۴۔ بحر الحکمت (اسٹیم انجن کا بیان) ریورنڈ پارکن لکھنؤ سنہ ۱۸۴۷ء

۱۵۔ توصیف زراعت۔ کلب حسین خاں آگرہ سنہ ۱۸۴۸ء

۱۶۔ قانون الطباع (چھاپہ) سیتل سنگھ دہلی۔ سنہ ۱۸۴۸ء۔

۱۷۔ جغرافیہ ہند اور انگریزی پنڈت سیوا روپ نرائن دہلی سنہ ۱۸۴۸ء

۱۸۔ مختصر وقائع النجوم۔ بڑے صاحب گھاٹلے۔ مدراس سنہ ۱۸۴۸ء

۱۹۔ اصول علم ہیئت۔ ماسٹر رام چندر۔ دہلی سنہ ۱۸۴۸ء

۲۰۔ اصول علم طبعی ترجمہ انگریزی اجودھیا پرشاد و سیتا پرشاد دہلی سنہ ۱۸۴۹ء

۲۱۔ مراۃ العلوم۔ ہری ورمن لال۔ بنارس سنہ ۱۸۴۹ء

۲۲۔ فتح گڈھ نامہ (احوال ضلع فتح گڈھ) کالی رائے۔ دہلی سنہ ۱۸۴۹ء

۲۳۔ رسالہ مقناطیس ترجمہ از انگریزی سید کمال الدین دہلی سنہ ۱۸۵۰ء

۲۴۔ اصول قواعد مائیات ترجمہ از انگریزی اجودھیا پرشاد دہلی ۱۸۵۰ء

۲۵۔ علم جغرافیہ ترجمہ غلام علی۔ کلکتہ ۱۸۵۱ء

۲۶۔ پند نامہ کاشتکاری۔ موتی لال آگرہ ۱۸۵۲ء

۲۷۔ خلاصہ نظام آسمانی۔ پنڈت وامی دہیرا۔ آگرہ ۱۸۵۲ء

۲۸۔ جغرافیہ کا پہلا رسالہ ترجمہ از انگریزی میر غلام علی مدراس ۱۸۵۳ء

۲۹۔ ریشم کا کیڑا۔ موتی لال۔ لاہور ۱۸۵۳ء۔ جغرافیہ عالم۔ دہلی ۱۸۵۳ء

۳۰۔ چائے لگانے کی کتاب۔ مطبوعہ لاہور ۱۸۵۴ء

۳۱۔ گنگا کی نہر۔ ترجمہ از انگریزی۔ سدا سکھ لال آگرہ ۱۸۵۴ء

۳۲۔ نور النواظر۔ احمد علی۔ کانپور ۱۸۵۴ء

۳۳۔ خلاصۃ الجغرافیہ آگرہ ۱۸۵۴ء

۳۴۔ بجلی کی ڈاک۔ آگرہ ۱۸۵۴ء

۳۵۔ ہوا کا بیان۔ بنارس ۱۸۵۴ء

۳۶۔ خلاصۃ الصنائع (ترجمہ از انگریزی) بھولا ناتھ آگرہ ۱۸۵۴ء

۳۷۔ اصول جراثقیل۔ محمد احسن بنارس ۱۸۵۴ء

اس ناتمام فہرست سے گو کہ اس تفصیل پر روشنی نہیں پڑتی کہ ان کتابوں میں کتنی کتابیں ایسی ہیں جو فورٹ ولیم کالج اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اثرات سے شائع ہوئی ہیں پھر بھی کلکتہ کی مطبوعات مجموعی حیثیت سے اتنی زیادہ ہیں کہ انھیں اسی زمرہ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان مطبوعہ کتابوں کی فہرست سے ایک اور بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کا پہلا قرن ختم ہونے کے بعد اردو کے تصنیفی شعور میں کسی حد تک تیز رفتاری بھی پیدا ہو چلی تھی اگرچہ ان کتابوں میں زیادہ تر ایسی کتابیں ملتی ہیں جو انگریزی زبان سے اردو میں منتقل

کی گئی تھیں اور براہ راست یا بلا واسطہ ان کے ترجموں میں فورٹ ولیم کالج کے عہدے داروں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب اختیار کا ہاتھ تھا۔

فورٹ ولیم کالج کا ذکر نامکمل رہ جائے گا اگر ان کتابوں کا سرسری طور پر تذکرہ نہ کیا گیا جو کالج کے ابتدائی دور میں یورپین مصنفین نے اردو میں لکھی تھیں۔ یہ فہرست بھی کسی حیثیت سے مکمل نہیں کہی جاسکتی پھر بھی اس مختصر فہرست کو سامنے رکھ کر ہم ان انگریز مصنفین کے ادبی اور تصنیفی ذوق کا جائزہ ضرور لے سکتے ہیں جنھوں نے فورٹ ولیم کے مشرقی مصنفین۔ مولفین اور مترجمین کے دوش بدوش یا اسی زمانے میں اردو زبان و ادب کی اہم خدمات انجام دی تھیں۔ اس فہرست میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی کتابوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے کیونکہ ان کا تفصیلی ذکر آئندہ اوراق میں علحدہ پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) کپتان جوزف ٹیلر۔ ڈاکٹر ولیم ہنٹر کو شریک کار بنا کر اردو انگریزی لغت مرتب کی جو پہلی مرتبہ ۱۸۰۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔

(۲) گلیڈون۔ اردو فارسی لغت ترتیب دی یہ ۱۸۰۹ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔

(۳) کپتان ٹامس روبک۔ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے "ہندوستانی لغت" مرتب کرنے میں ان کے معین کار رہے اور "فرہنگ جہاز رانی" کے نام سے ایک علحدہ کتاب لکھی جو ۱۸۱۱ء میں بمقام کلکتہ چھپی۔ اس کے علاوہ انھوں نے "ترجمان ہندوستانی" کے نام سے "اردو فوائد" پر بھی ایک کتاب تالیف کی جو پہلی مرتبہ ۱۸۲۴ء میں لندن سے اور اس کے بعد ۱۸۴۱ء میں پیرس و لندن دونوں جگہ سے شائع کی گئی۔

(۴) جان شکسپیر "اردو لغت" اور "منتخبات ہندی" (دو جلدوں میں)

مرتب کیں۔ اردو لغت ۱۸۱۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی "منتخبات ہندی" پہلی بار ۱۸۱۸ء میں لندن میں چھپی۔ اس کی پہلی جلد میں میر شیر علی افسوس کی تاریخ ہند "یعنی آرائش محفل" کے دس ابواب کا انگریزی ترجمہ شامل کیا گیا۔

(۵) ولیم ئیٹ۔ تین حصوں میں "مقدمہ زبان ہندوستانی" (اردو) ترتیب دی۔ یہ کتاب ۱۸۲۷ء میں بمقام کلکتہ چھپی۔

(۶) ایس۔ ڈبلو۔ برٹین۔ ہندوستانی زبان کے قواعد لکھے جو لندن سے ۱۸۳۰ء میں شائع کیے گئے۔

(۷) اسٹیم خوردار ناٹ۔ جدید "خود آموز قواعد زبان ہندوستانی" کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی یہ بھی ۱۸۳۱ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ اس کی دوسری کتاب قواعد فارسی، عربی اور دیوناگری حروف میں ڈنکن فاربس کے حاشیوں کے ساتھ ۱۸۴۴ء میں لندن سے شائع کی گئی۔

(۹) جیمس آر بالن ٹامئن۔ ہندوستانی گرامر لکھی۔ (مطبوعہ ۱۸۴۴ء لندن)

اس فہرست سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی دور میں یوروپین مصنفین زیادہ تر اردو زبان کے اصول و قواعد سے دلچسپی لے رہے تھے اور اس کا سبب اس کے سوا کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ لوگ اردو زبان کو بنیادی طور پر حاصل کر کے آگے بڑھنا چاہتے تھے چنانچہ ان کے اس اصولی مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ انگریزوں میں مشرقی ادبیات پر عبور رکھنے والے افراد پیدا ہوتے گئے جن کی عالمانہ کتابیں آج اتنی مستند سمجھی جاتی ہیں کہ شاید عربی کے سوا یہ امتیاز کسی دوسری زبان کو حاصل نہ ہوگا۔

عنوانات

سیتا پور

سیتا پور (اودھ) راماِئنی عہد کا وہ باعظمت مشہور۔ تاریخی اور مقدس مقام ہے جس کے گرد و پیش راجہ رام چندر جی کے زمانے کے مقدس تیرتھ اور پُر جلال مندر آج بھی پائے جاتے ہیں "نیم سار" (نیماشرن) اور "مصرکھ" جیسے قدیم سنسکرت کتابوں میں "مشرتھ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے زمانہ قبل تاریخ کے وہ "پوتر" اور مقدس مقامات ہیں جہاں موحد اعظم "ست سانگ" اور "دو بیج رشی" جیسے خدا پرست اور خدا دوست برسہا برس گیان دھیان کے دیئے جلاتے رہے۔
کہتے ہیں کہ راجہ رام چندر جی کی عصمت شعار اور باوفا رانی کو جب دوسرا "بن باس" دیا گیا تو "لچھمن جی" انھیں "سیتا پور" کے راستے "نیم سار" پہنچانے گئے تھے جہاں گومتی ندی کے کنارے "والمیک جی" ایک سنسان کٹیا میں بیٹھے ہوئے "رام نام" کی مالا جپ رہے تھے۔
"راماِئنی عہد" کے علاوہ سیتا پور کا ذکر "مہابھارت" کے زمانے میں بھی ملتا ہے۔ اور سیتا پور سے پندرہ سولہ میل جانب شمال آج بھی "ہرگام" میں راجہ براٹ کی راجدھانی کے آثار کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔ مغل بادشاہوں کے زمانے میں خاص شہر سیتا پور کو تو کوئی ایسی اہمیت حاصل نہیں ہوئی لیکن خیرآباد۔ لاہرپور اور صدرپور وغیرہ اپنی تاریخی عظمت کے لحاظ سے ضرور ایک خصوصیت اور امتیاز کے حامل رہے۔
اگر ہندوستان کی تاریخ یمین السلطنت موتمن الدولہ "راجہ ٹوڈرمل" کے

قائم کیے ہوئے زرعی نظام اور ان کے اہم سیاسی کردار کو فراموش نہیں کر سکتی تو لاہرپور (ضلع سیتاپور) کا ذرہ ذرہ ہمیشہ اس پر فخر کرتا رہے گا کہ اس مٹی ہوئی بستی سے ہندوستان کا یہی جگمگاتا ہوا آفتاب نیر اقبال بن کر ابھرا تھا "آزاد" نے دربار اکبری میں لکھا ہے۔

"تعجب ہے کہ اکبر بادشاہ کا وزیر کل کشور ہند کا دیوان اور کسی مصنف نے اس کے خاندان یا وطن کا حال نہ لکھا۔ خلاصۃ التواریخ میں بھی دیکھ لیا۔ باوجودیکہ ہندو مورخ ہے اور "ٹوڈرمل" کا بھی بڑا ثنا خواں ہے مگر اس نے بھی کچھ نہ کھولا۔ البتہ پنجاب کے پرانے پرانے پنڈتوں اور خاندانی بھاٹوں سے دریافت کیا تو اتنا معلوم ہوا کہ ذات کا کھتری اور گوت کا "ٹنڈن" تھا۔ پنجاب کے لوگ اس کی ہم وطنی سے فخر کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ لاہوری تھا اور بعض کہتے ہیں کہ "چونیاں" ضلع لاہور کا تھا۔ اور وہاں اس کے بڑے بڑے عالی شان مکانات موجود ہیں۔

ایشیاٹک سوسائٹی نے بھی اس کے وطن کی تحقیقات کی مگر یہ قرار دیا کہ موضع "لاہرپور" (اودھ) کا رہنے والا تھا۔"

صفحہ ۱۵۹ دربار اکبری مطبوعہ مطبع رفاہ عام لاہور ۱۸۹۸ء

لاہرپور میں "راجہ ٹوڈرمل" کے شاہی محلات کا نام و نشان تو اب نہیں ملتا البتہ ایک قدیم تالاب ضرور "راجہ تال" کہلاتا ہے جسے دیکھ کر بے اختیار راجہ ٹوڈرمل کے پرعظمت تاریخی دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اسی طرح سیتاپور کی خاک نے بیشمار زر و جواہر اگلے ہیں جن کی تفصیلات بجائے خود ایک مستقل تذکرہ کا درجہ رکھتی ہیں اس لیے میں یہاں پر صرف ایک ادبی "استقبالیہ" کو نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں جسے ۲۹ جون ۱۹۳۶ء کو جناب

سید محمد اطہر صاحب زائر سیتاپوری نے سیتاپور کی مجلس ادب کی طرف سے ٹاؤن ہال (سیتاپور) میں پروفیسر سید مسعود حسن ادیب (سابق صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی) کی خدمت میں پیش کیا تھا

یہ "ایڈریس" اگرچہ سیتاپور کی ادبی اور علمی تاریخ کا ایک نامکمل اور سرسری خاکہ ہے پھر بھی اسے سیتاپور کی تاریخ کا ایک اہم باب ضرور کہا جا سکتا ہے جس سے ماضی کے بہت سے دھندلکے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

"سیتاپور اودھ میں تمدن۔ تہذیب۔ معاشرت اور شہریت کے اعتبار سے لکھنؤ اور فیض آباد کے بعد سب سے زیادہ نمایاں مقام ہے۔ تاریخی لحاظ سے ہمارے ضلع کے اندر ایسے مقامات موجود ہیں جن کے تذکرے ہندوستان کی قدیم ترین کتب میں موجود ہیں "نیم سار" کا "تپوبن" (صحرائے ریاضت) "دو یچ رشی" کا مسکن "مشرکھ" (مصرکھ) اور "براٹ راج" موجودہ ہرگام وغیرہ وغیرہ۔ جن کو "سرگ لوک" کہا جاتا ہے اور جہاں تمام بڑے بڑے رشی منی اور دیوتا فخر کے ساتھ آئے ہیں ہمارے ہی ضلع میں ہیں۔

اسلامی سلطنت کے زمانے میں بھی ہمارے ضلع کے بہت سے مقامات مثلاً خاص سیتاپور۔ خیرآباد۔ لاہرپور وغیرہ ایک امتیازی نشان کے حامل رہے ہیں جہاں شمس العلماء علامہ عبدالحق خیرآبادی [1] (استاد نواب صاحب رامپور) علامہ تراب علی نامی خیرآبادی (تلمیذ رشید مرزا قتیل علیہ الرحمۃ) یمین السلطنت راجہ ٹوڈرمل جیسے کاملین فن پیدا ہوئے ہیں۔ خاص سیتاپور کی ادبی تاریخ بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ "ولی دکھنی" کے زمانے میں بھی سیتاپور میں صرف شعر و شاعری کا چلن ہی نہ تھا بلکہ ریختہ گو

---

[1] علامہ فضل حق خیرآبادی کے صاحبزادے۔

حضرات یہاں موجود تھے جن میں قاضی سید عبداللہ رضوی المتخلص بہ "رضوی" کا نام یاد رکھنے کے قابل ہے۔ موصوف کا حسب ذیل شعر یہ بتا رہا ہے کہ اُردو نظم کی ابتداء کے وقت بھی سیتاپور میں اُردو شعراء موجود تھے۔

تجھ بھوان کے پاس یوں ہے چشم مست
جیسے میخانہ کنارِ آب جو۔۔۔۔

اس کے بعد مختلف زمانوں میں بہتر سے بہتر شعراء سیتاپور میں جنم لیتے رہے جن میں سے حسب ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میر محمد آصف مشہدی۔ فرزدق ہند حضرت جریح۔ میر مقرب حسین مقرب (تلمیذ رشید میر مستحسن خلیق) میر امتیاز علی محزون (اُستاد سرکار امیرالدولہ بہادر آف محمود آباد) فردوسی ہند حضرت فارغ (ارشد تلامذہ میر انیس) سلطان الشعراء میر افضال حسین نجم (استاد سر مہاراجہ صاحب محمود آباد) حکیم محمد شریف طالب۔ میر کاظم حسین وفا۔ منشی علی رضا رضا۔ میر ناظر حسین ناظر۔ منشی علی محمد نظم۔ میر ظہور الحسن فروغ۔ میر محمد نذیر آزاد۔ احمد حسن ہاتف وغیرہ۔

نظم کی طرح اُردو نثر کی تاریخ بھی ارض سیتاپور کے جواہرات سے مزین ہے۔ اُردو نثر کے سب سے ابتدائی دور میں جب مغربی ثقافت کے زیر اثر موجودہ نثر کی تشکیل ہو رہی تھی ہمارے سیتاپور کے نامور نثار مولوی شیخ اکرام علی صاحب (علامہ سیتاپوری) مترجم "اخوان الصفا" بھی دوسرے موجدین نثر کے دوش بدوش "فورٹ ولیم" میں کام کر رہے تھے اس کے بعد بھی قریب قریب ہر دور میں اردو نثار علمی ادب کے مختلف شعبہ جات میں خامہ فرسائی فرماتے رہے۔ (ہفت روزہ سرفراز لکھنؤ ۲۹ جولائی ۱۹۷۷ء)

یہ چند نقش و نگار ہیں ابھی اس مرقع میں بہت سے رنگ باقی رہ گئے ہیں جنھیں اردو ادب کی تاریخ کبھی نہ بھلا سکے گی۔ ملک الشعراء الٰہی بخش ناز بخش (دربار ٹونک کے اُستاد) مصطفیٰ حسین راسخ۔ منشی بہاری لال خاوری۔ مولوی نیاز احمد نامی۔ مظفر حسین شوخی۔ محمد جعفر زمہری۔ موہن لال گرامی۔ حافظ محمد حسین بسمل۔ افتخار الملک مضطر۔ لسان الملک ریاض۔ حکیم افتخار علی جگر۔ آقائے سخن وسیم۔ خیرآباد اور سیتاپور کے مشاہیر ہیں جانے کتنے نام باقی رہ گئے ہیں جن کے اذکار سے تذکروں کے دامن مالامال ہیں۔ اور خود ہمیں آج ان کے علمی اور ادبی کارناموں کی خبر نہیں!

کچھ خاک و خمیر کا اثر، کچھ لکھنؤ کی قربت۔ سیتاپور برسہا برس علمی اور ادبی فضاؤں میں رچا بسا رہا۔ سرسید کے ساتھی مولوی چراغ علی (نواب اعظم یار جنگ) کے علمی مشاغل کی ابتدا سیتاپور ہی سے ہوئی۔ "رسائل چراغ علی" میں "تہذیب الکلام فی حقیقۃ الاسلام" سب سے بڑا رسالہ ہے اس کی تکمیل بھی انھوں نے یہیں کی تھی۔ پروفیسر حامد حسن قادری لکھتے ہیں:۔

"تہذیب الکلام فی حقیقۃ الاسلام" سب سے بڑا رسالہ ہے ۱۲۳ صفحوں میں شائع ہوا ہے آخر میں ۲۳ اکتوبر ۱۸۷۵ء سیتاپور ملک اودھ درج ہے"
(فٹ نوٹ صفحہ ۲۷۵ داستان تاریخ اُردو)

انیسویں صدی کے آخر میں دلّی کے کئی خاندان بھی سیتاپور میں سمٹ آئے تھے جن میں مومن[1] دہلوی کے داماد مولوی عبدالغنی وکیل سرسید کے بھتیجے سید

---

[1] (دختران مومن)

نال کٹنے کے ساتھ مومن نے کہی تاریخ دخترِ مومن

یہی وہ صاحبزادی ہیں جن کی اہل اولاد کی بدولت آج یہ تذکرہ مالامال ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۰۲ پر)

محمد احمد (سب جج) اور جسٹس محمود خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جسٹس محمود کو تو سیتاپور سے کچھ ایسا عشق ہوا کہ یہیں کے ہو رہے۔ مرنے کے بعد ان کی لاش علیگڑھ بھیجی گئی۔

اس دور کے مشاہیر میں بھی "دو حق پرستوں" کی نشو و نما اور ارتقا میں سیتاپور کا گہرا ہاتھ رہا ہے۔ ایک کی "خدا دوستی" ضرب المثل بنی دوسرے کی خدا دشمنی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی اور شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی دونوں لاشعور سے شعور تک

صفحہ ۱۰۱ کا بقیہ مضمون حاشیہ

بعض غیر محقق تاریخ نویس ایسے بھی ہیں جنھوں نے رسالہ نگار لکھنؤ کے "مومن نمبر" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مومن کی لڑکی کا چار سال بعد انتقال ہو گیا تھا اور سند میں یہ مومن کا قطعہ پیش کر دیا ہے ؎

خاک بر فرق دولتِ دُنیا — من نشانم خزانہ بر سر خاک

.... بہر حال وہ دوسری صاحبزادی مومن کی تھیں جو بعالم شیر خوارگی انتقال کر گئیں اور وہ لڑکی جس کے متعلق دختر مومن والا قطعہ ہے وہ مومن کے بہت بعد غازیپور (زمانیہ) میں مولوی عبدالغنی مرحوم وکیل ضلع سیتاپور سے بیاہی گئی تھیں۔

(عبارت فٹ نوٹ) مولوی صاحب (عبدالغنی وکیل) نے خود انتقال کی تاریخ لکھی ہے جو سر مزار موجود ہے۔

اے غنی مصرعہ تاریخ سر قبر نویس — بہ سوئے ملک عدم ہم نفس و ہمدم رفت

(صفحہ ۸۸ حیات مومن مولفہ عرش گیاوی مطبوعہ تجلی پریس دہلی)

مومن دہلوی کی ان صاحبزادی کی پختہ قبر "عیدگاہ" (سیتاپور) کے قبرستان میں بنی ہوئی ہے جس پر پندرہ سولہ سال ادھر تک یہ کتبہ تاریخ بھی لگا ہوا تھا اب نہیں معلوم کہ "لوح قبر" باقی ہے یا نہیں۔

(نادم سیتاپوری)

یہیں رہے۔ یہیں پلے بڑھے اور یہیں سے اُبھرے۔ خاک و خمیر کے لحاظ سے دونوں میں کوئی بھی "سیتاپوری" نہیں۔ لیکن اصل وطن دونوں کا "سیتاپور" ہی ہے اور آج اس پیرانہ سالی میں بھی مولوی عبدالمجید[1] دریا بادی (مولانا عبدالماجد دریا بادی کے بڑے بھائی) ریاض خیرآبادی کے اس شعر میں تصرف کر کے تڑپ اُٹھتے ہیں۔

وہ گلیاں یاد آتی ہیں لڑکپن جن میں کھویا تھا
بڑی حسرت سے لب پر نام "سیتاپور" آتا ہے

ذکر نامکمل رہ جائے گا اگر محمود آباد (ضلع سیتاپور) کے سینے میں مچلی ہوئی ان یادوں کو بھلا دیا گیا جن کے دامن میں اُردو ادب کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ آج بھی ایک شاندار ماضی کی طرح جگمگا رہی ہے والیٔ محمود آباد سر امیر الدولہ بہادر جو اودھ کے دوسرے "آصف الدولہ" تھے نہ محض خود ایک صاحب دیوان شاعر تھے بلکہ سراپا بزم ادب۔ ان کے دور اقتدار میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے لٹے ہوئے لکھنؤ کی ایک اچھی خاصی "بساط سخن" محمود آباد میں سمٹ آئی تھی۔ میر انیس کا پورا خاندان گزشتہ سو سال محمود آباد کی ادب نوازیوں سے منسلک رہا۔ خواجہ آتش اور ناسخ کے سلسلہ سے بھی کئی کاملین فن اس دربار سے وابستہ رہے۔ مٹتے مٹاتے بھی اس سرکار کی ادب پروری اور قدر شناسی نے ہندوستان کے بہت سے اہل کمال اپنے دامن میں سمیٹ لئے تھے۔ لسان القوم صفی۔ لسان الہند عزیز۔ لسان الملک ریاض۔ مرزا ثاقب۔ مقبول حسین ظریف اور سید سجاد حید ریلدرم وغیرہ نہ جانے کتنے اہل کمال ایسے تھے جو آخر وقت تک محمود آباد کی بساط ادب پر جگمگایا کئے۔!

---

[1] خط مولوی عبدالمجید صاحب دریا بادی (ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر) بنام نادم سیتاپوری۔

نام ونسب۔پیدائش

اکرام علی نام۔اکرام تخلص۔سن ولادت کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔صرف خاندانی روایات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بھائی اور اُستاد علامہ تراب علی نامی خیرآبادی سے صرف چار پانچ سال چھوٹے تھے اور نامی نے اپنی کتاب "وسیط النحو" کے دیباچے میں اپنی عمر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"میں نے یہ کتاب ۱۲۲۹ھ میں چھ مہینے کے اندر مکمل کی اس وقت میری عمر صرف ۳۶ سال کی تھی اور میرا قیام کلکتہ میں تھا۔"

(دیباچہ "وسیط النحو" (عربی) مطبوعہ کالج پریس مدراس ۱۸۱۴ء)

اس حساب سے نامی کا سن پیدائش ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء نکلتا ہے اور اکرام علی کا سن ولادت ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء یا ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء ہو سکتا ہے اس خاندانی روایت کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بوقت وفات (۱۲۵۲ھ) اکرام علی کی عمر پچپن سال سے زیادہ نہیں تھی اور فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تصنیف وتالیف میں یہ اپنے تمام ساتھیو میں سب سے زیادہ کم عمر اور کمسن تھے۔

اکرام علی کا سلسلہ نسب خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے مورث اعلیٰ "شیخ کمال الدین سلیمان" سلطان شہاب الدین غوری کے عہد حکومت میں کابل سے ہندوستان آئے تھے۔شیخ کمال الدین سلیمان کے جد امجد "فرخ بخش" شاہ ملک (والیِ کابل) کے زمانے میں شہر کابل کے حاکم اعلیٰ تھے۔

شیخ کمال الدین سلیمان ملتان (پنجاب) کے قریب قصبہ "نارنول" میں آکر آباد ہوگئے تھے جہاں ۵۸۵ھ میں شہنشاہ طریقت حضرت "بابا فرید گنج شکر" ایک نور حقیقت بن کر چکے۔

بابا فرید گنج شکر

بابا فریدؒ کا شمار ہندوستان کی ان خُدا رسیدہ اور برگزیدہ ہستیوں میں ہے جنھیں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو اور سکھ بھی اپنا "پیر طریقت" مانتے ہیں۔ سکھوں کی مقدس کتاب "گرنتھ صاحب" میں جہاں "قرآن کریم" کے تیسوں پاروں کا ماخذ اور خلاصہ موجود ہے وہاں چھ حصوں میں بابا فرید کے پند ونصائح اور عرفان معرفت میں ڈوبا ہوا کلام بھی شامل ہے۔"جنم ساکھی" بھائی دیا رام میں لکھا ہے۔ ؎

تریہے حرف قرآن دے تریہے سیپارے کین
تس۔وچ نصیتان سُن سُن کرو یقین

اور جب گرو صاحب (گرو نانک جی) بیس برس کے ہوئے تو اُن کو الہام ہوا۔

"اے نانک اب تم کو ۳۶ راگ اور راگنی کا "گرنتھ" دیا جاتا ہے جس میں تیس ۳۰ سیپارے قرآن کے ہیں اور چھ سیپارے الگ صورت میں ہم نے تم کو بخشے ہیں اس پاک "گرنتھ" کو ساری دُنیا میں پھیلاؤ اور ایک ہی نام کی مہماں (تعریف) کرو۔دوسرا کوئی میرا شریک نہیں جس کی "جاپ" کی جائے۔"

رسالہ آجکل دہلی نومبر ۱۹۴۴ء

بابا فرید حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے خلیفہ اور سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے پیر ومرشد تھے۔خانوادہ چشتیہ کے فرد فرید بابا فرید

نہ محض ایک صاحب طریقت و معرفت بزرگ تھے بلکہ فارسی کے ایک مستند شاعر بھی تھے۔ اور "اردو" کے الفاظ سب سے پہلے والہانہ طور پر جس کی زبان پر آئے وہ بابا فرید ہی تھے۔ علامہ سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں۔

"اس وقت تک اس زبان (اردو) کی ابتدائی تاریخ کا جہاں تک پتہ لگ سکا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ "شیریں دہن" جس کے منہ سے مصری کی یہ ڈلیاں پہلے نکلیں "خواجہ فرید گنج شکر" ہیں چنانچہ ملفوظات اور تصوف کی کتابوں میں موصوف کے چند فقرے ملتے ہیں۔

پہلا فقرہ۔۔۔ وہ مکالمہ ہے جو حضرت خواجہ اور ان کے مرید شیخ جمال الدین ہانسوی کی بیوہ کے درمیان ہوا خواجہ نے شیخ جمال الدین کے خورد سال بچے برہان الدین کو ان کے باپ کی وفات کے بعد اپنے حلقہ بیعت میں لے لیا اس پر ان کی والدہ نے کہا۔

خواجہ برہان الدین "بالا" ہے۔۔۔!

خواجہ فرید نے فرمایا۔ پونوں کا چاند "بالا" ہوتا ہے۔

یہ "بالا" وہی لفظ ہے جو "لڑکے بالے" اور "بچہ بالا" کے ساتھ آج بھی بولا جاتا ہے۔

(صفحہ ۴۰ و ۴۱ نقوش سلیمانی مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۳۹ء)

"اردوئے قدیم" میں بھی بابا فرید کی "اردو" کے چند نمونے نظر آتے ہیں۔

"آپ (بابا فرید) کے خلیفہ "خواجہ بدرالدین الحق" نے بیان کیا کہ آپ اپنے ایک دوست کو "بھیا" کہا کرتے تھے۔

"جواہر فریدی" (صفحہ ۲۰۸ بر جہ بعہد جہانگیر ۱۰۳۳ھ میں تالیف ہوئی ہے) لکھا ہوا ہے۔

"یہ زمانہ قیام دہلی آپ کو آشوب چشم کی شکایت ہوئی اور آنکھ پر پٹی باندھ کر اپنے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پیر نے پٹی باندھنے کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔

"آنکھ آئی ہے"۔۔۔

اس کے جواب میں پیر کا ارشاد ہوا۔ اگر آنکھ آئی ہے۔ این را چرا بستہ آید" (صفحہ ۲۲ "اردوئے قدیم" مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۰ء)

"سیر الاولیا" اور "جمعات شاہی" میں یہ دو شعر بھی بابا فرید سے منسوب کئے گئے ہیں جنھیں "دوہے" کہنا بیجا نہ ہوگا۔

گفت نہوتین کارای ناکان است مانے ۔۔۔ بس کند ھے مدھن گھر ہو رہن لہائے

آسا کیری یہی سوریت ۔۔۔ جاؤں نائے کہ جاؤں میت

(صفحہ ۹ مختصر "تاریخ ادب اردو" انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۵ء)

ان چند مثالوں سے ثابت ہے کہ "اکرام علی" نے "فورٹ ولیم کالج" میں اردو کے جس پودے کی آبیاری کی تھی وہ درخت وہی تھا جسے چھ سو سال پہلے ان کے مورث اعلیٰ بابا فرید نے نصب کیا تھا۔ بابا فرید کا وصال ۵ محرم الحرام ۶۶۰ھ بروز پنجشنبہ "پٹن" میں ہوا اور وہیں سپرد خاک کئے گئے۔ "تاریخ فرشتہ" میں ان کی یہ فارسی رباعی درج کی گئی ہے۔

گیرم کہ بہ شب نماز بسیار کنی ۔۔۔ دو روز دوائے شخص بیمار کنی

تا دل نہ کنی ز غصہ و کینہ تہی ۔۔۔ صد خرمن گل بر سر یک خار کنی

(تاریخ فرشتہ صفحہ ۶۳۵ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۳ء)

شیخ محمد رئیس

دلّی سے ترک وطن کر کے بابا فرید کی جو اولاد اور اعقاب "اودھ" پہنچی ان میں شیخ محمد رئیس وہ پہلے مسلمان بزرگ ہیں جنھوں نے "سیتاپور" کو اپنا وطن بنایا۔ خیرآباد (ضلع سیتاپور) جو اس زمانے میں ہندوستان کا "مدینۃ الاولیا" کہلاتا تھا وہاں حضرت شاہ نصیرالدین چراغ دہلی کی اولاد پہلے ہی آباد ہو چکی تھی۔ یمین السلطنت راجہ ٹوڈرمل کی جنم بھومی "لاہرپور" میں "باباچرم پوش" آسودہ خواب تھے۔ صدرپور "علّامی فہامی" کے نام سے منوّر ہو چکا تھا۔ ہر گام علم و فضل کے گہوارے میں پینگ لے رہا تھا۔ قصبہ آنٹے[1] کے شاہ سید مصطفےٰ بن شاہ سید سلطان جہانگیر کی شادی افضل خاں صوبیدار بنگالہ (علّامہ ابوالفضل کے بیٹے) کی صاحبزادی "ادلیابی بی" سے ہو چکی تھی اور دلّی سیتاپور کے لئے ایک طرح سے گھر آنگن بن چکا تھا۔

شیخ محمد رئیس کو دربار دہلی سے جو جاگیر عطا ہوئی تھی چونکہ وہ سیتاپور سے قریب ہی نہیں بلکہ شہر سیتاپور کا ایک جزو تھی — اور سیتاپور اور "سرکار خیرآباد" کے درمیان صرف چھ میل کا فاصلہ تھا اسی لئے شیخ محمد رئیس نے اپنے قیام کے لئے سیتاپور کا انتخاب کیا اور یہیں اپنے نام سے محلّہ "شیخ سرائے" آباد کر کے ایک

[1] قصبہ آنٹے ضلع سیتاپور میں سید شاہ فضل اللہ آملی کی نسل آباد تھی اب یہ لوگ "آنٹے" سے ترک سکونت کر کے سیتاپور اور دوسرے مقامات پر آباد ہو گئے ہیں (شجرات طیبات)

ایک شاندار محل تعمیر کرایا اور یہیں رہ بس گئے۔ لیکن دہلی میں جو اعزّہ و احباب تھے ان سے بدستور تعلقات قائم رکھے۔

اکرام علی کا سلسلہ نسب چھ واسطوں سے شیخ محمد رئیس تک پہنچتا ہے۔

شیخ محمد رئیس
|
شیخ حبیب اللہ
|
شیخ بیکی
|
شیخ نصراللہ عرف شیخ لاحول
|
شیخ مبارک محی الدین
|
شیخ احسان علی
|
اکرام علی

شیخ محمد رئیس سیتاپور کب پہنچے؟ اس کے متعلق کوئی تحریری ثبوت دستیاب نہیں ہوا۔ البتہ معافیات و جاگیرات کے شاہی فرامین اور اسناد وغیرہ سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس خاندان کو سیتاپور سے ملے ہوئے چند مواضعات میں کچھ جاگیریں محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں عطا کی گئی تھیں ایسے ہی کچھ فرمان میری نظر سے گذرے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ "تہم جمادی الثانی سنہ جلوس والا" کو سلیم پور، متصل

شہر سیتاپور) شیخ نصر اللہ (عرف شیخ لاحول) کو دربار دہلی سے جاگیر میں عطا ہوا تھا۔ ان شاہی اسناد اور فرامین کی تصدیق وقتاً فوقتاً نوابین اودھ کی سرکار سے بھی ہوتی رہی۔ اس سلسلہ کا سب سے آخری صداقت نامہ ۱۶؍ ذی الحجہ ۱۱۸ھ میں "فوجدار سیتاپور) محمد برہان الحق کے دستخط اور قاضی سید محمد صادق (قاضی شہر) کی مہر ثبت کر کے دیا گیا تھا۔

سیتاپور پہنچ کر یہ خاندان صدیوں صاحب نوبت و نشان رہا۔ دہلی سے قرابتوں کا سلسلہ بھی بدستور جاری تھا اور دربار دہلی سے تعلقات بھی۔ شیخ بیکی (نبیرۂ سید محمد رئیس) کے دوسرے بیٹے شیخ امیر اللہ کی نسل میں شیخ مردان علی خاں اور شیخ سبحان علی خاں اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں دہلی کے ممتاز عمائدین میں شمار کیے جاتے تھے۔ صاحب "شجرات طیبات" نے لکھا ہے۔

> شیخ مردان علی خاں و شیخ سبحان علی خاں پسران غلام اولیا خاں دہلی میں باعزت ملازم شاہی تھے ان کا سلسلہ نسبی شیخ امیر اللہ بن شیخ بیکی بن شیخ حبیب اللہ بن شیخ محمد رئیس محلہ شیخ سرائے پر ختم ہوتا ہے۔"
>
> (صفحہ ۸۰۳ شجرات طیبات مطبوعہ امیر المطابع سیتاپور)

غلام اولیا خاں کی اولاد بھی سیتاپور چلی آئی تھی اس خاندان میں صرف دو لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک کی شادی اکرام علی کے ساتھ ہوئی دوسری کی سید غلام امام جعفری سیتاپوری کے ساتھ۔!

ان دونوں خاندانوں کی نسلیں انقلاب ۱۹۴۷ء سے پہلے کلیتاً سیتاپور میں تھیں اب کچھ خاندان پاکستان منتقل ہو گئے۔

تعلیم و تربیت

اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں "اکرام علی" کے حالات زندگی اور سوانح سے متعلق کوئی تاریخی یا نیم تاریخی مواد یکجائی طور پر کہیں نہیں ملتا۔ اکرام علی پر سب سے پہلا مضمون (شیخ اکرام علی صاحب فاروقی حنفی مرحوم) نومبر ۱۹۱۳ء کے ماہنامہ "الناظر" لکھنؤ میں چھپا تھا جسے نقش اول کی حیثیت سے تو اہمیت دی جا سکتی ہے لیکن ادبی اور تاریخی حیثیت سے اس کو کوئی مکمل مضمون نہیں کہا جا سکتا۔

قاضی سید الیاس حسین سیتاپوری نے اس مضمون اکرام علی کے ابتدائی حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "حکیم صاحب موصوف (اکرام علی) سیتاپور کے رئیس تھے اور محلہ شیخ سرائے میں سکونت پذیر تھے مرحوم (اکرام علی) کے والد ماجد کا نام شیخ احسان علی تھا۔ حکیم صاحب مغفور (اکرام علی) کے آبا و اجداد ارباب تصوف میں شمار ہوتے تھے لیکن خدا نے دنیوی مال و جاہ سے بھی سرفراز کیا تھا۔ دربار شاہی میں منصب جلیلہ پر ممتاز تھے۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی اور لکھنؤ کے دربار سے ان کے لئے جاگیریں اور وظائف معین تھے۔ حکیم صاحب مرحوم (اکرام علی) کا نسب نامہ حضرت خواجہ شیخ فرید الدین عطار (خواجہ فرید الدین عطار دوسرے بزرگ تھے اکرام علی کے جد اعلیٰ بابا فرید گنج شکر تھے) کے واسطے سے امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تک پہنچتا تھا۔ حکیم صاحب کا خاندان علم دوست اور با عمل تھا۔

حکیم صاحب (اکرام علی) کے والد ماجد صرف نو سال کی عمر میں باہر چلے گئے تھے آپ فطرۃً ایسے شائقِ علم تھے کہ اسی حالت میں آپ کلکتہ تحصیلِ علم کی غرض سے چلے گئے اور اپنے ذاتی شوق اور جفاکشی سے علم حاصل کیا اور کلکتہ سے مدرسہ عالیہ عربیہ میں (جو اب بھی موجود ہے اور گورنمنٹ اس کی سرپرست ہے) داخل ہوئے اور وہاں کے نصاب کو نہایت محنت اور لیاقت سے ختم کیا اور سند حاصل کر کے دہلی گئے اور وہاں کے مشہور اور مستند علماء کو امتحان دے کر سند حاصل کر کے دستارِ فضیلت سے سرفراز ہوئے۔

(صفحہ ۴۷ ماہنامہ النّاظر لکھنؤ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۱۳ء جلد ۱۳ ۱۱ء)

اکرام علی کی ابتدائی تعلیم تو اپنے والد ماجد حکیم احسان علی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی مگر جب حکیم احسان علی دماغی امراض کا شکار ہو کر بلا علم و اطلاع سیتاپور سے چلے گئے تو اکرام علی اپنے چچا شیخ مردان علی خاں کے ساتھ دہلی گئے۔ اکرام علی کی عمر اس وقت نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ کچھ دن دہلی میں تعلیم حاصل کر کے پھر سیتاپور واپس آ گئے یہاں منقولات[1] مشہور محدث علامہ سید محمد عبدالرحیم سیتاپوری کی درسگاہ علم میں حاصل کئے اور علوم معقول کی تکمیل اپنے رشتے کے بھائی علامہ ہبہ علی نامی خیرآبادی سے کی جو بلحاظ عمر اکرام علی سے صرف چار پانچ سال بڑے تھے لیکن اپنے تبحر علمی کے اعتبار سے ایک بحر بیکراں تھے۔ ان کی علمی فضیلت

[1] علامہ سید محمد عبدالرحیم سیتاپوری قاضی سید اسداللہ کے صاحبزادے تھے جن کا شمار صوبہ بہار کے ممتاز فقیہ علماء میں کیا جاتا ہے۔ قاضی سید اسداللہ مونگیر (صوبہ بہار) کی منصب قضا پر فائز تھے عظیم آباد میں انتقال ہوا وہیں سپرد خاک کئے گئے۔

کا یہ حال تھا کہ وہ افرادِ علم و فضل بھی ان کا احترام کرتے تھے جو عمر میں ان سے کہیں زیادہ بڑے تھے۔

میرے محترم پروفیسر آغا اشہد لکھنوی اپنے خسر معظم منشی علی محمد نظم (جو اکرام علی کے حقیقی پوتے تھے) کے حوالے سے اپنے ایک نجی خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ان (اکرام علی) کی تعلیم زیادہ تر خیرآباد اور قصبہ لاہرپور میں ہوئی تھی۔ فرنگی محل لکھنؤ میں ملا مبین صاحب اعلی اللہ مقامہٗ سے بھی استفادہ علم کیا تھا اور زیادہ تر علماء کی صحبت میں امتیازی حیثیت سے رہتے تھے۔"

واقعات کے تسلسل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اکرام علی نے مروجہ علوم کی تحصیل تو اپنے وطن میں کی اور تعلیمی مشاغل کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے انھیں سیتاپور، خیرآباد اور لاہرپور (ضلع سیتاپور) کے علاوہ لکھنؤ اور دہلی بھی جانا پڑا۔ لیکن تعلیم کے آخری مراحل کلکتہ کے "مدرسہ عالیہ" میں طے پائے۔ یہ مدرسہ وارن ہیسٹنگز کی کوششوں سے ۱۷۸۰ء میں قائم کیا گیا تھا اور آج تک ہندوستان میں مشرقی علوم کی ایک شاندار درسگاہ کے طور پر باقی ہے علامہ عبداللہ یوسف علی نے اس مدرسہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں علوم کے ان مختلف شعبوں کے لئے جو اسلامی مدرسوں میں پڑھائے جاتے تھے "کلکتہ کا مدرسہ" قائم کیا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کے سامنے اپنی اس کارروائی حق بجانب قرار دینے کے لئے اس نے (۲۱ فروری ۱۷۸۳ء کو) یہ لکھا کہ ہندوستان میں اس وقت اس قسم کا یہی ایک مکمل مدرسہ ہے۔"

(صفحہ ۱۰۴ "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" مطبوعات ہندوستانی اکیاڈمی الٰہ آباد ۱۹۳۶ء)

اسی مدرسہ عالیہ (کلکتہ) میں اکرام علی نے اپنے بھائی علامہ تراب علی نامیؔ کی سرپرستی میں تعلیم کمل کی۔ اپنی تعلیمی مصروفیت سے فرصت پاکر وہ اپنے اوقات نامیؔ کی خدمت میں گذارے جس سے وہ رہی سہی کمی بھی پوری ہوتی گئی جو عام طور پر مدرسوں کی تعلیم میں رہ جایا کرتی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مدرسہ عالیہ میں ان کے ہم سبق احباب میں ان کے ہم وطن مولوی خلیل الدین اشکؔ خیرآبادی (مترجم داستان امیر حمزہ) کے علاوہ مولوی حفیظ الدین احمد بھی تھے جن کے والد مولوی بلال الدین احمد اسی مدرسہ کے زمرۂ اساتذہ میں شامل تھے یہ دونوں افراد بھی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوکر اکرام علی کے ساتھ فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف سے منسلک ہوگئے تھے۔

علامہ تراب علی نامی خیرآبادی

اکرام علی کا ذکر نامکمل رہ جائے گا اگر علامہ تراب علی نامی کے حالات ان اوراق میں شامل نہ کیے گئے۔ اکرام علی کو "اکرام علی" بنانے میں جو اہم کردار نامیؔ نے پیش کیا ہے اس کی مثالیں تاریخ میں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری نے غالب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"اگر غالب کو مولانا فضل حق خیرآبادی جیسی یگانہ روزگار شخصیت نہ مل جاتی تو میر تقی میرؔ کی یہ پیشین گوئی بہت کچھ پوری ہو جاتی کہ ـــ

یہ بچہ اگر سنبھالا نہ گیا تو بھٹک جائے گا"

یہاں بھٹکنے اور بہکنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا اگر اکرام علی کو نامیؔ جیسے شفیق بھائی اور سرپرست کا سایۂ عاطفت نصیب نہ ہوتا تو شاید اکرام علی بھی اپنے دوسرے ہم وطنوں کی طرح اپنی تمام علمی صلاحیتوں سمیت سیتاپور کی خاک میں مل کر خاک ہو جاتے کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا ـــ اکرام علی کس طرح پر نامیؔ کے بھائی ہوتے تھے؛ شجرے کی اس اہم کڑی کو ملانے میں میں کامیاب نہ ہو سکا پھر بھی یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ رشتہ داری بہت ہی قریب کی رشتہ داری تھی جس کا سلسلہ خیرآباد سے اب تک قائم ہے اگرچہ وہاں نامیؔ کی نسل میں کسی ایک بچے کا بھی پتہ نہیں چلتا قیاس کیا جاتا ہے کہ ان کی نسل میں اگر کوئی رہ گیا ہوگا تو بنگال یا مدراس کے صوبوں میں ہو سکتا ہے اودھ میں کوئی نہیں ہے۔

ناامی عباسی الاصل شیخ تھے ان کے خاندان کے ایک بزرگ جو نویں یا دسویں صدی ہجری میں ہندوستان پہنچے تھے قصبہ لاہرپور (ضلع سیتاپور) میں آسودہ خاک ہیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان بزرگ سے براہ راست ناامی کا کیا رشتہ تھا۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی" نے اٹھارہویں صدی کے آخری زمانے میں جس مسلمان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کی سب سے زیادہ داد دی۔۔۔ وہ ناامی ہی تھے۔ اتنا اعزاز و احترام شاید ہی کسی دوسرے کو نصیب ہوا ہو۔ کمپنی کے اعلیٰ افسروں میں زیادہ تر انھیں کے شاگرد تھے۔ ناامی کے حالات زندگی پر اکرام علی سے کہیں زیادہ گہرا گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے چنانچہ "فورٹ ولیم کالج" کی تاریخوں میں بہت تلاش و جستجو کے بعد مشکل سے چند سطروں یا چند جملوں سے زیادہ کچھ بھی نہیں ملتا خیرآباد اور سیتاپور کے بزرگوں میں تو کوئی اتنا بھی باقی نہیں رہا جو یہ بتا سکے کہ ناامی کا خاندان کس محلے میں رہتا تھا۔! البتہ کہیں کہیں تذکروں میں کچھ مختصر حالات ضرور ملتے ہیں یا پھر خود ناامی کی لکھی ہوئی کتاب "وسیط النحو" کے دیباچے میں جو ۱۸۱۰ء میں کالج پریس مدراس میں چھپی تھی اور اب بالکل کمیاب ہے اس کا ایک نسخہ کتبخانہ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال میں محفوظ ہے۔ "وسیط النحو" کے دیباچے میں ناامی نے اپنا مختصر شجرہ بھی لکھا ہے۔

شیخ عبداللطیف شہید ہاشمی خیرآبادی
|
شیخ محمد منیف عباسی
|
شیخ نصرت اللہ عباسی
|
تراب علی ناامی

خیرآباد (ضلع سیتاپور) میں پیدا ہوئے۔ "وسیط النحو" کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"۱۲۲۹ء میں چھ مہینے کلکتہ میں رہ کر یہ کتاب لکھی اس وقت میری عمر صرف ۳۶ سال کی تھی"۔

(دیباچہ وسیط النحو مطبوعہ کالج پریس، مدراس ۱۸۱۰ء)

اس طرح پر ناامی کا سن ولادت ۱۱۹۳ھ ثابت ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم خیرآباد میں حاصل کی پھر کچھ دنوں ہرگام (ضلع سیتاپور) میں علامہ سید غلام امام رضوی کی خدمت میں علوم منقول حاصل کئے۔ علوم معقول کی تکمیل علامہ سید عبدالواجد کرمانی[1] خیرآبادی (بن ارشد تلامذہ ملا اعلم سندیلوی شاگرد رشید مولانا کمال الدین سہالوی) سے کی جن کا رشتہ درس علوم معقول میں شیخ الرئیس

---

[1] عبدالواجد کرمانی بن عبدالماجد بن قاضی صدرالدین ہرگامی کے متعلق علامہ فضل امام خیرآبادی (مجاہد ملت علامہ فضل حق خیرآبادی کے والد) اپنی قلمی کتاب "آمدنامہ" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"خوش تقریر فاضل تھے آپ کا ہر شاگرد درجہ کمال پر پہنچا ہوا تھا تقریر ایسی فرماتے تھے کہ عامی اور بازاری انسان بھی اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔ مولانا محمد اعلم سندیلوی سے تلمذ حاصل تھا اُستاد و شاگرد پر بے انتہا شفقت فرماتے تھے بلکہ بعض کتابیں ملا دہاج الدین بن قطب الدین گوپاموی سے پڑھیں۔ "صدرا" کے کچھ اسباق مولوی غلام طیب کی صحبت میں مولانا احمد اللہ خیرآبادی ابن حاجی صفت اللہ محدث (خیرآبادی) سے بھی پڑھے ۱۲۱۵ھ میں رحلت ہوئی"۔

ایک عزیز نے تاریخ وفات کہی۔

بقیہ مضمون صفحہ ۱۱۸ پر ہے

بوعلی سینا (وفات ۴۲۷ھ ۱۰۳۷ء) سے ملتا ہوا معلم ثانی ابو نصر فارابی (وفات ۳۴۳ھ ۹۵۴ء) تک پہنچتا ہے۔

خیرآباد ان دنوں ہندوستان میں علماء اور فضلا کا ایک بہت بڑا مرکز بن چکا تھا جسے عرفِ عام میں "یونانِ ہند" کہا جاتا تھا۔ نویں صدی ہجری میں مخدوم شیخ سعد الدین پھر مخدوم نظام الدین الہدیہ نے یہیں انوار و اسرارِ معرفت کی ضیاباریاں کیں "فتاوائے عالمگیری" کی مجلس تالیف کے ایک رکن ملا ابو الواعظ (اتالیق اورنگ زیب عالمگیر) اسی ارضِ معرفت سے اُبھرے۔ شیخ ارزانی بدایونی کے پوتے ملا ارشد ہرگامی نے اسے وطن بنایا۔ حاجی صفت اللہ محدث خیرآبادی اور ان کے صاحبزادے مولانا احمد اللہ محدث تمام عمر یہیں درس و تدریس کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کرتے رہے ـــ اور جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا خیرآباد کی خاک سے "گلہائے تازہ" نشو و نما پاتے رہے۔ ناسخ کے ہم سبق ساتھی علامہ فضل امام خیرآبادی۔ علامہ فضل حق خیرآبادی۔ ملک الشعراء مولوی الٰہی بخش نازش

صفحہ ۱۱۷ کا بقیہ مضمون ۴

روزِ جمعہ کہ بود چارم عید	از جہاں سوئے جنت الماوٰی
رفت آمد نوید از رضواں	رضی اللہ عنک ۔ زود بیا

(آمد نامہ)

(صفحہ ۲۸ الثورۃ الہندیہ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور)

۵ علامہ فضل حق خیرآبادی (ابن علامہ فضل امام خیرآبادی بن شیخ محمد ارشد ہرگامی بن حافظ محمد صالح بن ملا عبد الواجد) ۱۲۱۲ھ (مطابق ۱۷۹۷ء) میں بمقام خیرآباد ضلع سیتاپور پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ علوم معقول اپنے والد سے حاصل کیے۔ منقولات کی درس و تدریس حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے صاحبزادے شاہ عبد القادر سے کی۔

(بقیہ صفحہ ۱۱۹ پر)

خیرآبادی۔ متولی محمد جعفر زہری۔ مولوی مظفر حسین شوخی۔ منشی قدرت حسین۔ قدر شد منشی بہاری لال قادری۔ منشی موہن لال گرامی اور خدا جانے کتنے اہل کمال آفتاب

صفحہ ۱۱۸ کا بقیہ مضمون ۵ ابتداءً ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں رہے پھر ترک ملازمت کرکے جھجھر چلے گئے۔ کچھ دنوں الور میں رہے اس کے بعد نواب رام پور کے اُستاد کی حیثیت سے رام پور میں قیام کیا۔ ۱۸۴۷ء میں جب نواب واجد علی شاہ (آخری تاجدار اودھ) تخت نشین ہوئے تو لکھنؤ کے عہدہ صدر الصدوری (جج) کی ذمہ داریاں انھیں سونپی گئیں لیکن انگریزوں کی سازشی ریشہ دوانیوں سے تنگ آکر انھوں نے لکھنؤ کو بھی خیرباد کہا۔ الور پہنچے ہی تھے کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب شروع ہوگیا۔ علامہ الور سے دہلی پہنچے اور انقلابی تحریک کو زندہ کرنے کے لئے ایک تحریک جہاد کی تنظیم کی۔ ہندوستان کا ستارہ گردش میں آچکا تھا وطن پرستوں کی تمام جد و جہد خاک میں مل گئی اور صرف دہلی نہیں بلکہ سارا ہندوستان دیکھتے دیکھتے انگریزوں کے پنجۂ اقتدار میں پہنچ گیا۔ لاکھوں گھر اُجڑے۔ دلّی کے ہر گلی کوچے سے خونِ ناحق کے سوتے اُبلے۔ ہزاروں نے پھانسیاں پائیں۔ لاکھوں بے گناہ قتل کیے گئے جو باقی بچے اُن پر بغاوت کے جرم میں مقدمات چلائے گئے علامہ بھی ان میں سے ایک تھے جنھیں سیتاپور میں گرفتار کرکے بہ جرم بغاوت لکھنؤ میں مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمہ میں کچھ الزامات میر فضل حق شاہجہاں پوری کے ہم نام ہونے کی وجہ سے غلط طور پر ان کے سر عائد کردیے گئے تھے چنانچہ علامہ نے میر فضل حق شاہجہاں پوری کے الزامات سے تو یہ کہکر انکار کیا کہ میں فضل حق شاہجہاں پوری نہیں ہوں۔ مگر جہاں تک تحریک جہاد کی تنظیم کا سوال تھا انھوں نے کھلے الفاظ میں اقرار جرم کرلیا اور عدالت نے انھیں کالے پانی کی سزا دے دی۔ جزائر انڈمان بھیجے گئے اور وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۱ء) کو قید ہستی سے رہائی پائی۔ وہیں سپرد خاک کیے گئے۔

و ماہتاب بن کر چمکے ۔ اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی افق کی گہرائیوں میں چھپ گئے
نامی کے ہم سبق اور ہم عمر ساتھیوں میں سب سے زیادہ اہم اور نمایاں شخصیت
علامہ فضل امام خیرآبادی (علامہ فضل حق خیرآبادی کے والد) کی تھی۔ مولانا عبدالشاہد خاں
شروانی "باغی ہندوستان" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"موصوف (فضل امام) بڑے طباع و ذہین تھے۔ مولانا سید عبدالواجد
کرمانی خیرآبادی کے ارشد تلامذہ سے تھے علوم نقلیہ و عقلیہ انھیں سے حاصل
کئے اس کے بعد "صدر الصدوری" کے عہدہ جلیلہ پر دہلی جا کر فائز ہوئے۔

"تذکرہ علمائے ہند" میں ہے ۔

شاگرد رشید مولوی سید عبدالواحد خیرآبادی بہ منصب صدر الصدوری
شاہجہان آباد از سرکار انگریزی عزت و امتیاز داشت۔ بر میر زاہد رسالہ
و میر زاہد ملا جلال حواشی نوشتہ، و در علوم عقلیہ گوئے سبقت ربودہ۔
"آمد نامہ" کہ در آں قواعد فارسی بیان کردہ و نیز ترجمہ علمائے جوار لکھنؤ
تحریر فرمودہ۔ بس مفید مبتدیان است"

(صفحہ ۱۷ و ۱۸ "باغی ہندوستان")

"آثار الصنادید" میں سرسید اعظم نے بھی اپنے استاد الاستاد (علامہ
فضل امام) کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

"اکمل افراد نوع انسی۔ مہبط انوار فیوض قدسی ۔ سراب سرچشمہ
عین الیقین۔ موسس اساس ملت و دین۔ ماحی آثار جہل ہادم بنائے
اعتساف۔ محی مراسم علم بانی مبانی انصاف۔ قدوہ علمائے فحول۔
حاوی معقول و منقول سند اکابر روزگار۔ مرجع اعالی و ادانی ہر دیار۔

لے علامہ فضل امام سرسید کے استاد مفتی صدر الدین آزردہ کے استاد تھے۔

مزاج دان شخص کمال۔ جامع صفات جلال و جمال مورد فیض ازلی و ابدی۔
مطرح انظار سعادت سرمد۔ مصداق مفہوم تمام اجزاء واسطۃ العقد۔
سلسلہ حکمت اشراقی و مشائی۔ زبدہ کرام۔ اسوہ عظام۔ مقتدائے انام
مولانا مخدومنا مولوی فضل امام ادخلہ اللہ المقام فی جنۃ النعیم بلطفہ العلیم۔"

نامی اور فضل امام قریب قریب ساتھ ہی علامہ عبدالواجد کرمانی کی
درسگاہ علم سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے اور دونوں نے تقریباً ایک ہی زمانے
میں خیرآباد کو خیرباد کہا۔ نامی کلکتہ پہنچے اور فضل امام دلی۔
سراج الدولہ کو سازشوں کا شکار بنا کر ایسٹ انڈیا کمپنی بنگال میں اپنے
قدم جما چکی تھی۔ نو وارد انگریز افسروں کو مشرقی علوم کی تعلیم دینے کے لئے ہندوستانی
ارباب علم کی تلاش تھی۔ نامی بھی کمپنی کے زمرہ اساتذہ میں شامل ہو گئے۔ اس
زمانے کے اکثر بڑے بڑے انگریز افسروں نے عربی۔ فارسی اور اردو زبانیں اور
علوم مشرقی کی تکمیل انھیں سے کی۔ اپنے علمی اقتدار اور جلال کی وجہ سے اس
زمانے میں یہ کمپنی کے ارباب اقتدار پر چھائے ہوئے تھے۔ صاحب "نتائج الافکار"
نے لکھا ہے۔

"بہ فیض تعلیم و تربیتش اکثرے از طلبہ جامہ فضل و کمال بر قامت
حال دوختند و ترقیات عظیمہ کہ عبارت از خدمات قضا، و افتاء اضلاع
ممالک محروسہ مدراس است۔"

(صفحہ ۴۳۸ نتائج الافکار)

چنانچہ "معاہدہ لیک" (۱۸۰۳ء) کے بعد جب دلی کی برائے نام حکومت
بھی کمپنی کے دست اقتدار میں پہنچ گئی تو وہاں "صدر الصدور" (جج) کے تقرر کا
مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ لال قلعہ سے تعلق رکھنے والے کئی ایسے افراد بھی اس عہدے

کے لیے امیدوار تھے جنھوں نے مغل سلطنت کو انگریزوں کے پنجہ اقتدار کی گرفت میں لانے کی خاموش سازشیں کی تھیں اور اپنی اس خیر خواہی کی قیمت صدر الصدوری کا عہدہ حاصل کر کے وصول کرنا چاہتے تھے کلکتہ تو اس وقت تک انگریزی اقتدار سیاست کا دار السلطنت تھا اس قسم کے تمام حکم احکامات براہ راست "گورنر جنرل" دیتا تھا۔ ناؔمی کلکتہ ہی میں موجود تھے انھوں نے وقت اور موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے عزیز دوست و ہم سبق "فضل امام" کی سفارش کر کے انھیں دہلی کا "صدر الصدور" بنوا دیا جو ۱۲۴۴ھ تک اسی ذمہ دار عہدے سے منسلک رہے۔

علامہ فضل امام کا انتقال ۵ ذیقعد ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء کو اپنے وطن خیرآباد میں ہوا۔ مرزا غالب نے جو "ابجد ہوز" کے نام سے گھبراتے تھے زندگی میں پہلی بار ان کی وفات پر قطعہ تاریخ لکھ کر اپنے چہیتے دوست علامہ فضل حق خیرآبادی سے رسم تعزیت ادا کی۔

اے دریغا قدوۂ ارباب فضل   کرد سوئے جنت الماوی خرام

چوں ارادت از پئے کسب شرف   جست سال فوت آں عالی مقام

چہرۂ ہستی خراشیدم نخست   تا بنائے تجربہ گردد تمام

گفتم اندر سایۂ لطف نبی

باد آرامشگہ فضل امام ؎

۱۲۴۰ ہجری

علامہ فضل امام خیرآبادی تو ناؔمی کے ہم وطن اور ہم سبق ساتھی ہی تھے ان کے علاوہ ناؔمی کے معاصرانہ تعلقات اس دور کے تمام مشاہیر علماء و ادباء سے بھی ایسے ہی مساویانہ و دوستانہ تھے چنانچہ سنٹرل لائبریری بھوپال کے عربی مخطوطات میں صاحب "نفحۃ الیمن" علامہ شیخ احمد یمنی الشروانی کا ایک عربی مجموعہ مکاتیب محفوظ ہے جسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناؔمی کا

رشتہ اخوت اس دور کے تمام معاصرین سے قائم تھا اور ان لوگوں میں باہمی خط و کتابت بھی جاری تھی۔ علامہ شیخ احمد یمنی اس دور کے ان مستند علماء میں تھے جن کی لکھی ہوئی کتابیں آج تک مصر، شام، ایران، حجاز اور عراق کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے درس میں داخل ہیں۔ کلکتہ کے زمانہ قیام میں کئی سال تک یہ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے وابستہ رہے اور مدرسہ عالیہ (کلکتہ) قائم ہونے کے بعد عرصہ تک عربی زبان کے پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس دیتے رہے۔ اسی زمانے میں ناؔمی سے بھی ان کے گہرے تعلقات ہو گئے تھے جو تمام عمر باقی رہے۔ علامہ شیخ احمد یمنی کے جد امجد مرزا محمد ابراہیم خاں ہمدانی نادر شاہ درانی کے وزیر رہ چکے تھے۔ ان کے صاحبزادے متوفی الملک مرزا محمد علی خاں جب نادری قہر و عتاب کا شکار ہو گئے تو ان کی اولاد اور دوسرے اعزہ ترک وطن کر کے ہندوستان آ گئے۔ متوفی الملک کے صاحبزادے مرزا محمد تقی کچھ دنوں "شیخ محمد" کا نام بدل کر "شروان" میں روپوش رہے پھر وہاں سے نجف اشرف پہنچے۔ علامہ سید مہدی طباطبائی مجتہد العصر کی درسگاہ علم میں علوم دینی حاصل کیے اور اپنے چچا مرزا محمد احسن خاں کے پاس بنارس چلے آئے۔ عرصہ تک ہندوستان کے مختلف مقامات کی بادیہ پیمائی کر کے یہ خاندان مولانا محمد عباس رفعت شروانی (تلمیذ مرزا غالب) کے زمانے میں بھوپال میں سکونت گزیں ہو گیا۔ جناب مالک رام صاحب اپنی تصنیف تذکرہ "تلامذۂ غالب" میں علامہ شیخ احمد یمنی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"شیخ احمد کمالات علمی و عملی کی تحصیل کے بعد عنفوان شباب میں یمن سے ہندوستان آئے اور کلکتہ میں وارد ہوئے۔ یہاں حکام فرنگ کی قدر شناسی سے انھیں "مدرسہ عالیہ" (کلکتہ) میں عربی زبان و علوم

پڑھانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے "الف لیلہ" مرتب کی۔
اس کی اصل غالباً کوئی مصری نسخہ تھی یہ پوری کتاب نہیں۔ انھوں نے صرف
پہلی دو سو راتوں کو درست کیا اور انھیں دو جلدوں میں ١٨١٤ء۔ ١٨١٨ء میں
شائع کر دیا۔ یہ پہلا کلکتہ اڈیشن ہے۔ سر رچرڈ برٹن نے جب پوری "الف لیلہ"
انگریزی میں ترجمہ کی تو اپنے ترجمہ میں اس نسخہ سے بہت مدد لی تھی۔

تھوڑے دنوں بعد انھوں نے نوکری کو خیر باد کہی اور یہاں سے لکھنؤ چلے
گئے غازی الدین حیدر شاہ کا زمانہ تھا۔ ان کے خاندان کے تعلقات دربار اودھ
سے پہلے سے تھے ہی۔ چنانچہ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ رکن الدولہ سید محمد اسمٰعیل خاں
رضوی مرشد آبادی نے اپنی صاحبزادی ان کے حبالہ عقد میں دی۔ شیخ محمد عباس
رفعت اسی ازدواج کا نتیجہ تھے غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد شیخ احمد شروانی
کا دل لکھنؤ سے اچاٹ ہو گیا وہ کانپور۔ بنارس۔ حیدر آباد۔ بھوپال بمبئی وغیرہ
کی سیر و سیاحت کرتے "پونا" پہنچے اور وہیں ١٨ مئی سنہ ١٨٤٠ء (١٩ ربیع الاول
سنہ ١٢٥٦ھ) کو رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔

شیخ احمد بڑے صاحب کمال شخص تھے۔ اپنے وقت کے "متنبی اور حریری"
تسلیم کئے گئے۔ تمام تذکرہ نویس ان کے علم و فضل کی تعریف میں رطب اللسان
ہیں۔ متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں جن میں سے "انشائے عجب العجاب"
نفحۃ الیمن۔ مناقب حیدریہ۔ حدیقۃ الافراح۔ تاج الاقبال فی تاریخ
ملک بھوپال زیادہ مشہور ہیں۔

(صفحہ ١٢٦۔ ١٢٧ "تلامذہ غالب" مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی سنہ ١٩٥٨ء)

علامہ احمد یمنی کا یہ عربی مجموعہ مکاتیب "روضۃ الصبا المفتیہ عن الشمس
والسلمی" سنہ ١٢٦٣ھ میں ان کے صاحبزادے ابو الفضل مولانا محمد عباس رفعت

شروانی نے مرتب کیا تھا۔ اس مجموعہ خطوط میں ناسخ کے خط کے علاوہ حضرت
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ شاہ رفیع الدین دہلوی۔ شاہ اسمٰعیل دہلوی۔
علامہ فضل امام خیر آبادی۔ علامہ دلدار علی (غفرانمآب) مفتی صدر الدین آزردہ۔
شاہ کریم عطا سلونوی۔ شاہ اجمل الہ آبادی۔ مرزا محمد حسن قتیل۔ حکیم مہدی لکھنوی۔
مولانا عبدالحق۔ شکر اللہ خاں داماد ٹیپو سلطان) منشی رتن چند۔ منشی کندن لال
ابراہیم لوکٹ۔ ہاکنس۔ کپتان ریکی وغیرہ کے تقریباً پچاس عربی خطوط شامل ہیں
جن میں بہت سے ادبی۔ علمی اور دینی مسائل پر فاضلانہ تبادلہ خیال کیا گیا
ہے۔ ناسخ نے جو خط علامہ احمد یمنی کے نام لکھا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ
ان دونوں کے تعلقات بہت گہرے اور قدیم تھے۔ علامہ احمد نے اپنی کتاب
"نفحۃ الیمن" کا ایک نسخہ ناسخ کی خدمت میں بھیجا تھا جس پر تبصرہ کرتے ہوئے
ناسخ نے علامہ احمد کے علم و فضل کا شاندار الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ اس خط
سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ احمد اپنی دوسری تصانیف بھی وقتاً فوقتاً ناسخ
کو بھیجتے رہتے تھے۔

علامہ احمد یمنی اور ناسخ کے تعلقات کی ابتدا تو علامہ احمد کے قیام کلکتہ سے
ہوئی جبکہ وہ مدرسہ عالیہ میں ملازم تھے مگر بعد میں یہ تعلقات اس لئے بھی وسیع
ہوتے گئے کہ علامہ احمد کی کئی کتابیں (تحفۃ الاخوان الصفار و انشائے عجب العجائب
وغیرہ) اکرام علی کے ہندوستانی پریس میں چھپیں۔

اگرچہ خطوط کے اس مجموعہ میں اکرام علی کا کوئی خط شامل نہیں ہے لیکن یہ
قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ناسخ سے اتنے گہرے تعلقات ہونے کی وجہ سے اکرام علی
اور علامہ احمد یمنی کے درمیان بھی معاصرانہ روابط درستی ضرور ہوں گے خصوصاً
ان حالات میں جبکہ علامہ احمد کی کتابیں اکرام علی کے پریس میں چھپتی رہیں۔

براہم لوکرٹے۔ ہاکنس اور کپتان ریلی کے جو خطوط اس مجموعہ میں شامل ہیں ان سے بھی اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ علامہ احمد کے تعلقات اپنے تمام معاصرین سے نہایت ہی خوشگوار خصوصاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے سلسلہ ملازمت کی وجہ سے کمپنی کے دوسرے متوسلین سے اچھا خاصا ربط وضبط ہو گیا تھا۔ اور اس سے اکرام علی بھی مستثنیٰ نہیں تھے جو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے اس دور کی ایک ممتاز و نمایاں شخصیت سمجھے جاتے تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں آنے کے بعد بھی نامی مستقل طور پر کسی ایک جگہ نہ رہ سکے کلکتہ کے بعد ان کے قیام کا زیادہ زمانہ مدراس میں گزرا جہاں ”سینٹ جارج فورٹ“ (ST.GEORGE FORT) کے نام سے ایک قلعہ انگریزوں نے قائم کر لیا تھا اس قلعہ میں نو وارد انگریزوں کی تعلیم کے لئے ایک چھوٹا سا کالج قائم بھی کر دیا گیا تھا جس میں نامی ایک عرصہ تک شعبہ عربی۔ فارسی اور ہندوستانی کے صدر رہے۔ ”وسیط النحو“ کے سرورق پر۔

MOULUVEE TOORAB ALEE HEAD ARBBIC, PERSIAN AND HINDOOSTANEE - IN THE COLLEGE OF FORTST. GEORGE.

لکھا ہوا ہے ــــــ اس کالج میں نامی کے پہنچنے کی کوئی صحیح تاریخ نہیں بتائی جا سکتی لیکن ”وسیط النحو“ کے سن اشاعت (۱۸۱۰ء) سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے یہ اس زمانے میں مدراس کے اسی کالج سے وابستہ تھے۔ فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا۔ اور اس کا کوئی تاریخی ثبوت کہیں سے نہیں ملتا کہ یہ کسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج کے کسی شعبہ سے متعلق رہے ہوں پھر بھی بعض تاریخی شہادتیں اس قسم کی ضرور ملتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا

ہے کہ نامی وقتاً فوقتاً فورٹ ولیم کالج کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دلچسپی اور سرگرمیاں صرف اسی حد تک محدود ہوں جتنا تعلق ایسٹ انڈیا کمپنی اور فورٹ ولیم کالج میں تھا۔ کرنل رینکنگ (COL. REAN KINGE) نے ایک مضمون میں نامی کا ذکر بھی فورٹ ولیم کالج کی سرگرمیوں کے سلسلے میں کیا ہے۔

"THE IKHWANUS SAFA" IN URDU TRANSLATED FROM THE ARABIC BY "TOORAB, ALEE" WAS RECOMMENDED IN APRIL 1810 FOR THE SUPPORT THE COLLEGE, THE COUNCIL RECOMMENDED GOVERNMENT TO SANCTION THE USUAL SUBSCRIPTION FOR 100 COPIES. THIS WAS ACCEEDED TO THE KULLIYATI SAUDA ALSO PREPARED BY CAPTIAN TAYLOR WAS RECEIVED UPON ITS, COMPLETION IN JUNE 1810"

{"BENGAL PAST AND PRESENT"
PAGE 200 VOL(XXI)1920}

اگرچہ رینکنگ کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ ”اخوان الصفا“ کا اردو ترجمہ تراب علی نامی نے کیا ہے (اس پر تفصیلی بحث ہم آئندہ صفحات میں کریں گے) لیکن ”رینکنگ“ کے بیان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ”فورٹ ولیم کالج“ سے براہ راست متعلق نہ ہونے کے باوجود وہ کالج کی علمی اور ادبی سرگرمیوں سے کافی دلچسپی رکھتے تھے اور جہاں تک اکرام علی کی ذات کا تعلق تھا وہ ان کی ترقی کے ہر ہر قدم پر ان کے

ساتھ تھے ـــــــ

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ ملازمت میں انھیں کمپنی کے ذمہ دار افسروں کے ساتھ عربی اور فارسی کے ترجمان کی حیثیت سے قریب قریب تمام اسلامی ممالک کا دورہ کرنا پڑا۔ ایران۔ عراق اور عجم میں کافی عرصہ تک رہے جہاں اپنے وظائف منصبی کے علاوہ کافی وقت وہاں کے علماء کے ساتھ گذرنے کا موقع بھی لگا لیتے رہے۔ "تذکرہ شعرائے دکن" میں لکھا ہے۔

"تراب علی نام۔ عباسی الاصل ہیں۔ آپ کا وطن "خیرآباد" ہے سن شعور کے بعد آپ نے کتب معقول و منقول مولانا عبدالواجد و مولوی غلام امام کی خدمت میں ختم کئے اور کلام کی مشق مرزا قتیل کی خدمت میں کی۔ تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد تلاش معاش میں کلکتہ گئے۔ حکام برطانیہ کے ہمراہ ایران و عراق و عجم کی خوب سیر و سیاحت سے مراجعت کر کے مدراس میں آئے کمپنی کے مدرسہ میں مدرس ہوئے چند مدت بسر کر کے حرمین شریفین کی زیارت کو گئے۔ مراجعت کے وقت مقام "پٹن" (شریف) میں سنہ ۱۲۴۱ھ میں فردوس بریں کو روانہ ہوئے۔ آپ عالم و فاضل جامع العلوم تھے۔ نیک محضر و نیک سیرت تھے۔ خوش تحریر و خوش تقریر تھے شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے۔ جو کچھ موزوں فرماتے تھے خوب و مرغوب ہوتا تھا۔

من اشعارہ الفارسی

سحر از جنبش شمشاد بہ گلگشت چمن ۔۔ یادم آمد روش قامت دلجوئے کسے
بر زباں دست کشاں می بردم جذبۂ عشق ۔۔ از پئے سجدہ بہ طاقِ خم ابروئے کسے
لیست در بحث بدم چشم امید آنکہ بود ۔۔ دست در دست و سرم بر سر زانوئے کسے

(صفحہ ۱۱۸-۱۱۹ شعرائے دکن)

تذکرہ "نتائج الافکار" میں کچھ اس سے بھی زیادہ شرح و بسط کے ساتھ نامی کا ذکر ملتا ہے۔۔۔

"صدر نشین ایوان خوش کلامی۔ حاجی الحرمین مولوی تراب علی نامی کہ سلسلہ نسبش بہ عبداللہ ابن عباس منتہی می شود۔ ولادتش در بلدہ خیرآباد از مضافات دارالحکومت لکھنؤ است۔ جلوہ ظہور یافتہ بعد عروج معارج فہم و تمیز کتب درسی فارسی پیش اساتذہ عصر گذرانیدہ بہ مقتضائے استعداد فطری بہ کسب علوم عربیہ گرائیدہ بحلقۂ تلمذ جناب مولوی سید عبدالواجد و مولوی غلام امام رضوی خیرآبادی کہ از علمائے نامدار و فضلائے برگزیدہ روزگار بودند درآمد تحصیل کتب متداولہ معقول و منقول از ذہن وقار در کمتر حالتے از اقران و امثال فائق برآمد۔ چندے مشق سخن پیش "مرزا قتیل" کہ ملک الشعرائے عصر بودہ نمودہ بہ موزونی طبع در فکر نظم ہم از خوش کلاماں بود۔ از آنجا کہ تلاش معاش از جملہ ضروریات است قدم ثبات در وطن متزلزل دیدہ رفت بدارالحکومت کلکتہ کشیدہ و بہ رفاقت یکے از انگریزان بہ سیاحت ممالک ایران و عراق و عجم پرداخت و در اثنائے مسافرت ملاقات اہل کمال آں حدود حاصل ساخت و پس از آنکہ عمر سفر کوتاہ گردید باز بہ کلکتہ رسیدہ حسب الطلب ارباب حکومت بہ مدراس فائز گشت و بہ عہدۂ مدرسی "مدرسہ کمپنی" مامور گردید۔

بہ فیض تعلیم و تربیتش اکثرے از طلبہ جامہ فضل و کمال بر قامت حال دوختند و ترقیات عظیمہ کہ عبارت از خدمات قضا و افتاد اضلاع ممالک محروسہ مدراس است۔

چہرہ اعتبار برافروختند۔ چونکہ تمنائے زیارت حرمین شریفین از مدتے

در سنہ برداشت قدم بہ سفر حج و بعد اداے مناسک حج و حصول زیارت نبوی علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم۔

باز متوجہ مدراس گشت و در مقام "سرینگ پٹن" وارد گشتہ بعارضہ اسہال مبتلا گردیدہ ہمانجا در سنہ احدی و اربعین و مائتین والف بخلد برین خرامید از انجا کہ۔

مرد پاک طینت و نیک سیرت بودہ مادام حیات بکمال نیک نامی گذرانید و پس از شرف اندوزی حج و زیارت دامن بہ آلائش دنیوی ملوث نگردانید ایں چند است۔ از طبع متینش دریں اوراق نگارش رفت۔

از من اے ہمدم چہ پرسی باعث تاخیر اشک — خار مژگاں می شود ہر لحظہ دامن گیر اشک
نیست دل سوزے بجز شمع مزارم بعد مرگ — تا کہ سوز و ساختے سازد دمے تقطیر اشک
بر دعاے طفل ناداں را اجابت لازم است — لیک من در حیرتم یارب چہ شد تاثیر اشک

از بخت سیہ شکوہ ندارم کہ نشاید — زلف سیہ یار بدیں روز سیاہم

(صفحہ ۲۳۸ نتائج الافکار)

نامی عربی کے عالم اور فارسی کے خوشگو شاعر اور ادیب تھے میرزا قتیل سے شرف تلمذ حاصل تھا اب تک کوئی دیوان یا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا ہے لیکن تذکروں میں بکھرے ہوئے حالات سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ان کا مجموعہ کلام موجود ضرور تھا ممکن ہے یورپ کی کسی لائبریری میں ان کے شاگردوں کے ہاتھوں پہنچ گیا ہو۔

ڈاکٹر فیلن اور مولوی کریم الدین نے "تاریخ شعراے ہند" میں گمنام نامی کے دو اردو شعر بھی لکھے ہیں لیکن ان دونوں تذکرہ نویسوں کی رسائی نامی کے حالات زندگی تک نہ ہو سکی ــ بلکہ وہ نامی کا نام بھی نہ لکھ سکے۔

آتش عشق سے نامی کا جگر جلتا ہے — آپ ہنس ہنس کے یہ کہتے ہیں کوئی آ دیکھے
واہ کیا خوب مثل ٹھیک بندھی ہے اس دم — گھر کسی کا جلے اور کوئی تماشا دیکھے

(صفحہ ۲۹۹ تذکرہ تاریخ شعراے اردو مطبوعہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۸ء)

نامی کی تصانیف میں "عربی" کی ایک کتاب "وسیط النحو" مجھے ملی ہے جو ۱۸۱۰ء میں خود انھوں نے اپنے مصارف سے کالج پریس مدراس میں چھپوائی تھی ۲۸۴ صفحہ کی یہ عربی کتاب جسے نامی نے سنہ ۱۲۲۳ھ میں چھ مہینے کلکتہ قیام کر کے لکھا تھا عربی میں "صرف و نحو" کی وہ مستند اور معیاری کتاب سمجھی جاتی ہے جس میں صرف و نحو کے ان تمام دقیق مسائل کو حل کر دیا گیا ہے جو "کتاب الوافی شرح ملا جامی" اور شیخ الحاجب کی "المختصر" میں نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔

یہ کتاب نامی نے "سینٹ جارج فورٹ کالج" کے ذمہ داروں کی فرمائش پر لکھی تھی جس کا ایک معقول معاوضہ بھی انھیں دیا گیا تھا لیکن کالج کے منتظمین مالی مشکلات کی وجہ سے اس کی چھپائی میں ٹال مٹول کر رہے تھے چونکہ یہ کتاب اسی کالج کے نصاب تعلیم میں شامل کی جا چکی تھی اور اصل مسودہ برابر درس میں استعمال ہو رہا تھا جس سے نامی کو اندیشہ پیدا ہو چلا کہ کہیں یہ کتاب ضائع نہ ہو جائے اس لیے انھوں نے اس کی طباعت کا کام منشی میر غلام حسین اور محمد عمر کے سپرد کیا طباعت کے مصارف انھیں خود ہی برداشت کرنا پڑے البتہ اس سلسلہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کسی معقول رقم سے ان کی مدد ضرور کی جو "ولیم الیوز" کی کوششوں کا

نتیجہ بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۲۲۹ھ میں لکھی گئی مگر اس کی پانچ سو جلدیں ۱۲۳۵ھ میں طبع ہو کر شائع ہو سکیں۔

”وسیط النحو“ کے ابتدائی حصے میں عربی زبان کی دو تین تقریظیں بھی شامل ہیں جن میں افضل العلماء مولانا ارتضا علی گوپاموئی (قاضی شہر مدراس) اور مولانا حسن علی ماہلی نے لکھا ہے اس کتاب کے ساتھ ہی ۱۱ صفحات کا ایک فارسی رسالہ بھی شامل ہے جس میں ان تمام عربی اشعار کا فارسی ترجمہ کیا گیا ہے جنھیں ”وسیط النحو“ کی عبارتوں میں جگہ دی گئی ہے۔

زندگی کے آخری دنوں میں نامی کی تندرستی کافی خراب ہو گئی تھی انھوں نے حکام کمپنی سے درخواست کی کہ انھیں ملازمت سے سبکدوش کر کے حج و زیارت کی اجازت دی جائے۔ کمپنی کے ذمہ دار افسروں نے نہ محض ان کی یہ درخواست منظور کی بلکہ سفارش کر کے انھیں ایک کافی رقم حج و زیارت کے لئے بھی کمپنی سے دلوائی اور سفر کی دوسری آسانیوں میں کمپنی نے ان کی ہر ممکن مدد کی۔

نامی صوفی مسلک بزرگ تھے بابا فرید گنج شکر سے انھیں خاص ارادت و عقیدت تھی حج سے واپسی کے بعد پاک پٹن شریف میں سکونت اختیار کر لی۔ ایک عرصے تک ہیچش کے مہلک مرض میں مبتلا رہ کر ۱۲۴۱ھ میں وہیں آسودہ خواب ہو گئے۔

صاحب تذکرہ ”نتائج الافکار“ نے نامی کی جائے رحلت ”سر پرنگ پٹن“ غلط لکھا ہے ان کی قبر اپنے پیر طریقت حضرت بابا فرید گنج شکر کے آستانہ مبارک ”پاک پٹن“ میں ہے۔

نامی کے پسماندگان اور اولاد و اعقاب کے متعلق کوئی تفصیلات کہیں نہیں ملتیں لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ خیرآباد میں ان کے خاندان کا ایک فرد بھی موجود نہیں ہے۔

نامی کو اپنے وطن اور ہم وطنوں سے والہانہ عشق تھا اکرام علی اور فضل امام خیرآبادی کے علاوہ انھوں نے خیرآباد کے متعدد لوگوں کو اپنے پاس بلا لیا تھا جن میں سے کچھ تو اپنے وطن واپس آ گئے اور کئی خاندان بنگال و مدراس کے خاک خمیر میں رچ بس کر وہیں کے ہو رہے جن کے بارے میں کسی قسم کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ نامی کے انھیں ہم وطنوں میں ایک خلیل الدین اشک بھی تھے جنھیں ”ارباب فورٹ ولیم کالج“ میں جگہ دینے کے بعد کسی نے تو خلیل اللہ اشک لکھا ہے۔ اور کسی نے خلیل علی اشک ؟ — اور ان کے حالات کے متعلق اب تک اردو ادب کی تاریخ یہ بھی نہیں بتا سکی کہ یہ کہاں کے رہنے والے تھے ؟

خلیل الدین اشک اکرام علی کے ان ساتھیوں میں تھے جو نامی کے بلانے پر آگے پیچھے کلکتہ پہنچے۔ فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں میں انھیں ایک ممتاز مقام حاصل ہے ”اکرام علی کے معاصرین“ میں ان کے جس قدر حالات معلوم کر سکا ہوں پیش کروں گا —

فورٹ ولیم کالج میں

علامہ تراب علی نامی خیرآبادی جن کا ذکر بار بار آچکا ہے اکرام علی کے رشتے میں بھائی ہی نہیں تھے بلکہ ایک شفیق اُستاد اور ان کی زندگی بنانے والے پہلے اور آخری معمار تھے۔ انھیں کے بلانے پر اکرام علی کلکتہ پہنچے تھے اور انھیں کی سرپرستی نے انھیں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم کی سہولتیں پہنچائیں۔ یہاں تک کہ جب یہ مدرسہ عالیہ سے نکلے تو باوجود کم عمری کے نامی کی کوششوں سے انھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمرۂ ملازمین میں جگہ مل گئی۔ اس وقت تک انگلستان سے آئے ہوئے نو وارد انگریزوں کو مشرقی علوم کی تعلیم دینے کے لئے باقاعدہ طور پر کوئی اسکول قائم نہیں ہوا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے منصوبہ کا غذی دوڑ دھوپ میں مصروف تھے۔ اکرام علی کپتان براہم لوکٹ کے اُستاد مقرر ہو گئے۔ انھیں تعلیم گھر پر دی جاتی تھی لیکن تنخواہ کمپنی کے خزانے سے ملتی تھی اور یہ ملازمت ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سمجھی جاتی تھی۔

اکرام علی فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف میں کب پہنچے؟ اس کی صحیح تاریخ کا تعین کرنا بہت ہی دشوار ہے پھر بھی مجھے پروفیسر سید محمد (عثمانیہ) کی اس دریافت کا اب تک کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔

"مولوی اکرام علی ڈاکٹر گلکرائسٹ کے وطن واپس ہو جانے (سنہ ۱۸۰۶ء کے بعد فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے یہ فورٹ ولیم کے دوسرے دَور کے اہل قلم میں ہیں۔"

(صفحہ ۲۳۳ "ارباب نثر اردو)

ہو سکتا ہے کہ ۱۸۰۶ء سے پہلے یہ اپنے دوسرے ساتھی مولوی حفیظ الدین احمد کی طرح شعبہ تصنیف و تالیف میں نہ لئے گئے ہوں بلکہ کالج کے ایک ٹیچر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہوں لیکن ۱۸۰۰ء میں جب کالج قائم ہوا تو ان کی خدمات ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے کالج میں ضرور منتقل کر دی گئی تھیں اور کالج کے تمام ملازمین میں مولوی حفیظ الدین اور اکرام علی سب سے کم عمر کہے جاتے تھے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں پروفیسر سید محمد کو یہ غلط فہمی ڈاکٹر فیلن اور مولوی کریم الدین کی اس بے ربط عبارت سے پیدا ہوئی ہے۔

"مولوی اکرام علی۔ بھائی تراب علی کا۔ جو کپتان لوکٹ صاحب کی خواہش سے جو کہ فورٹ ولیم کے مدرسہ کا سکریٹری تھا۔ وہ مولوی کلکتہ میں جا کر رہا۔ اس کی سفارش سے درمیان ۱۸۱۴ء کے محافظ کتب خانہ ہوا۔ اس حال میں ٹیلر صاحب نے اس سے کہا کہ رسالہ اخوان الصفا کا عربی سے تم ترجمہ آسان عبارت میں کر دو۔

(صفحہ ۱۸۲ تاریخ شعرائے اُردو مطبوعہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۸ء)

اس گنجلک اور بے ربط عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۱۶ء میں جب اکرام علی فورٹ ولیم کالج کے کتب خانے میں بحیثیت لائبریری پہنچے تو ٹیلر صاحب کی فرمائش پر عربی اخوان الصفا کا اردو ترجمہ کیا۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے اکرام علی کا تقرر کالج لائبریری میں بحیثیت لائبریرین ۱۸۱۶ء میں ہوا۔ اور "اخوان الصفا" کا اردو ترجمہ کالج کمیٹی کے سامنے اپریل ۱۸۱۰ء میں پیش کیا گیا جو اسی سال (۱۸۱۰ء میں پہلی بار ہندوستانی پریس سے شائع بھی کر دی گئی۔

کم عمری کہئے۔ یا کوئی اور وجہ ہو؟ یہ صحیح ہے کہ اکرام علی کا عروج ڈاکٹر گلکرائسٹ کے زمانے میں نہ ہو سکا بلکہ انھیں کالج کے شعبہ تالیف و تصنیف میں

کام کرنے کا موقع اس وقت ملا جب کالج کی عنانِ اقتدار صحیح معنوں میں ان کے شاگردِ رشید کپتان براہم لوکٹ کے ہاتھ میں پہنچی۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین۔ مؤلفین اور مترجمین کے متعلق ابھی تک کوئی ایسا تفصیلی ریکارڈ سامنے نہیں آسکا ہے جس سے ان کی مدتِ ملازمت کی تفصیلات صحیح طور پر معلوم ہوسکتیں اور ان کی سرگرمیوں پر ایسی روشنی پڑتی جس سے ان افراد کی کارگذاریوں کا جائزہ لیا جاسکتا مگر اس کے باوجود بھی یہ باور کرنے کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ جو لوگ کالج قائم ہونے سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں آچکے تھے ان کی صلاحیتوں کے مطابق انھیں کالج میں سب سے پہلے جگہ دی گئی مولوی حفیظ الدین احمد کی ابتدائی ملازمت کا ذکر کرتے ہوئے مولوی محمد یحییٰ تنہا نے لکھا ہے۔

"ان کے والد شیخ جلال الدین محمد ابن شیخ محمد ذاکر صدیقی نے ملازمت اختیار کی اور کلکتہ کے مدرسہ میں جو وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل نے قائم کیا تھا مدرس ہوئے۔ وہ عربی فارسی کے اچھے عالم تھے۔ حفیظ الدین نے اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں رہ کر اسی مدرسہ میں عربی فارسی کی تکمیل کی ۔ اور بیس سال کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر فورٹ ولیم کالج میں عربی فارسی کے اُستاد مقرر ہو گئے۔

(صفحہ ۹۴ "سیر المصنفین" مطبوعہ عالمگیر الکٹرک پریس لاہور پاکستان جلد اوّل)

اکرام علی حفیظ الدین کے ساتھیوں میں تھے اور اپنی خدمات واثر و رسوخ کے لحاظ سے بھی حفیظ الدین سے کسی طرح کم نہیں تھے اگر کمپنی کے اربابِ حل و عقد کی نگاہوں میں ان کے والد مولوی جلال الدین محمد کی علمی خدمات کی اہمیت و وقعت تھی تو واقعات اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے کہ اس دور میں علامہ تراب علی نامی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نزدیک سب سے زیادہ باا‌ثر

اور بارسوخ شخصیت کے مالک تھے ۔ اور اکرام علی کمپنی کی ملازمت میں پہنچنے کے بعد کالج کی ملازمت کے لئے حفیظ الدین احمد سے زیادہ حقدار تھے ۔ پروفیسر محمد (عثمانیہ) نے "طبقات الشعراء" کے حوالے سے ان کے فورٹ ولیم کالج میں پہنچنے کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"مولف طبقات الشعراء" نے ان (اکرام علی) کا ذکر تو کیا ہے مگر حالات پر کچھ روشنی نہیں ڈالی ..... جو کچھ معلوم ہوسکا وہ یہ ہے کہ ان کے بھائی تراب علی (نامی) جو عربی اور فارسی کے اچھے عالم تھے غالباً کلکتہ میں کمپنی کے ملازم اور کسی علم دوست انگریز کے میر منشی تھے انھوں نے ان (اکرام علی) کو کلکتہ بلایا اور ایک انگریز مسٹر ابراہم لاکٹ کے توسط سے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم رکھوایا۔ اس انگریز (ابراہیم لوکٹ) نے ان کو اپنے ہاں متبنیٰ کرلیا تھا۔ کچھ دن بعد فورٹ ولیم کالج کے اردو پروفیسر کپتان جان ولیم ٹیلر نے انھیں کالج میں منتقل کیا اور ان سے "اخوان الصفاء" ہندی مرتب کرائی۔"

(صفحہ ۲۳۴ اربابِ نثر اردو)

اخوان الصفاء کا ترجمہ

اگرچہ اکرام علی فورٹ ولیم کالج قائم ہوتے ہی سنہ ۱۸۰۰ء میں کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف سے منسلک ہو گئے تھے لیکن پورے نو سال تک اکرام علی کی کوئی کتاب کالج کی طرف سے شائع نہیں کی گئی اور نہ اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں دوسری کون سی تصانیف یا ترجموں کا کام ان سے متعلق رہا۔ حالانکہ کالج کا شعبہ تصنیف و تالیف قائم ہوتے ہی تصنیف و تالیف اور ترجمے کا کام شروع ہو گیا تھا اور غالباً سنہ ۱۸۰۲ء یا سنہ ۱۸۰۳ء سے کالج پریس میں کتابوں کی طباعت کا کام بھی شروع ہو گیا تھا۔

اکرام علی کی پہلی اور آخری کتاب جو فورٹ ولیم کالج کی طرف سے ہندوستانی پریس نے شائع کی ہے وہ یہی عربی "اخوان الصفاء" کا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ ہے جو شروع سنہ ۱۸۱۰ء میں مکمل ہو کر کالج کی اس کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا جو کتابوں کی اشاعت کی منظوری دیتی تھی۔ یہ کتاب علامہ تراب علی نامی کے ذریعہ سے اس کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی تھی چنانچہ کرنل جی۔ ایس۔ اے۔ رینکنگ (COL.G.S.R.RANKIGE) نے اپنے ایک طویل مضمون میں جو سنہ ۱۹۲۰ء کے (BANGAL PAST AND PRESENT) میں بالاقساط چھپا تھا لکھا ہے۔

THE "IKHWANUS SAFA" IN URDU TRANSLATED

FROM THE ARABIC BY "TOORAB ALEE" WAS RECOMMENDED IN APRIL 1810 FOR THE SUPPORT OF THE COLLEGE, THE COUNCIL RECOMMENDED GOVRNMENT TO SANCTION THE USUAL SUBSCRIPTION FOR 100 COPIES THIS WAS ACCEEDED TO THE KULLIYATI SAUDA ALSO PREPAR-ED BY CAPTIAN TAYLOR WAS RECEIVED UPON ITS COMPLETION IN JUNE 1810"

BANGAL PAST AND PRESENT PAGE 200

VOL (XXI) 1920

جہاں تک کرنل رینکنگ کے اس بیان کا تعلق ہے کہ عربی "اخوان الصفاء" کا اردو ترجمہ علامہ تراب علی (نامی خیرآبادی) نے کیا ان کی یہ معلومات یقیناً کسی سرسری اور سطحی دریافت کا نتیجہ کہی جا سکتی ہیں اور انھوں نے غالباً فورٹ ولیم کالج کے کسی ریکارڈ میں یہ دیکھ کر کہ یہ کتاب علامہ تراب علی نامی نے کمیٹی کے سامنے منظوری کے لئے پیش کی یہ نتیجہ نکال لیا کہ یہ ترجمہ بھی انھیں کا کیا ہوا۔ کرنل رینکنگ نے یہ مضمون پوری ایک صدی کے بعد سنہ ۱۹۲۰ء میں لکھا تھا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں کرنل رینکنگ کے اس طویل مضمون کا ماخذ فورٹ ولیم کالج کا وہ نامکمل ریکارڈ ہے جسے سامنے رکھ کر "رینکنگ" نے نہ تو کالج کی مطبوعات کا جائزہ لینا ضروری سمجھا نہ دوسری تاریخی کتابوں سے کوئی مدد لی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یہ بھی نہ معلوم کر سکے کہ "اخوان الصفاء" کا ترجمہ تراب علی نے نہیں کیا بلکہ صرف منظوری کے لئے کالج کمیٹی کے سامنے پیش کیا تھا۔ لیکن رینکنگ کی اس غلط فہمی

سے اکرام علی اور علامہ تراب علی نامی کے ان گہرے تعلقات پر ایک اچھی خاصی روشنی ضرور پڑتی ہے کہ یہ دونوں اپنے تعلقات کے لحاظ سے کس قدر ایک دوسرے سے قریب تر تھے۔

"اخوان الصفا" کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۸۱۰ء یا ۱۸۱۱ء میں خود فورٹ ولیم کالج نے ہندوستانی پریس سے شائع کیا تھا۔ پھر اس کے بعد اس کے ایک درجن سے زیادہ اردو۔ فارسی۔ انگریزی اور فرانسیسی ایڈیشن شائع ہوئے اور یہ تمام ایڈیشن اور ترجمے اکرام علی ہی کے ترجمے کو اساس و بنیاد بنا کر پیش کئے گئے جن میں کہیں ایک مرتبہ بھی اس کا ذکر نہیں آیا کہ دراصل یہ ترجمہ تراب علی نامی کا کیا ہوا ہے اکرام علی کا نہیں ہے۔ "اخوان الصفا" کا پہلا ایڈیشن جو ۱۸۱۱ء میں ہندوستانی پریس نے شائع کیا ہے اس کے دیباچے میں اکرام علی کا یہ بیان نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔

"بعد اس کے عاصی پُرمعاصی اکرام علی یہ کہتا ہے کہ میں بموجب حسن ایمائے جناب صاحب نامدار عالی منزلت و اقتدار حکمت میں تمام حکمائے زمانہ سے برتر دانائی میں تمام عقلائے عالم سے برسر خداوند نعمت مسٹر برہم لاکت صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے اور موافق اخی استادی جناب بھائی صاحب قبلہ مولوی تراب علی صاحب دام ظلہٗ کے شہر کلکتہ میں آیا اور رہنمونی طالع سے بعد حصول شرف ملازمت کے مورد عنایت و مرحمت کا ہوا۔

ازبسکہ صاحب بہادر کو کمال پرورش منظور تھی سرکار کمپنی بہادر میں نوکر رکھوا کر اپنے پاس متعین کرایا۔

بعد چند روز کے باستصواب جناب صاحب عالی شان زبدۂ دانایان روزگار سر دفتر عقلائے عالی مقدار مدرس ہندی کپتان جان ولیم صاحب بہادر

دام دولتہ کے فرمایا کہ رسالہ "اخوان الصفا" انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے تو اس کا زبان اردو میں ترجمہ کر۔ لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہوں بلکہ اصطلاحات علمی اور خطبے بھی ان کے کہ تکلف سے خالی نہیں ہیں قلم انداز کر۔ صرف خلاصہ مضمون مناظرے کا چاہئے۔

راقم نے بموجب فرمانے کے صرف حاصل مطلب کو اردو میں لکھا خطبوں کو نکال ڈالا اور اکثر اصطلاحات علمی کو مناظرے سے ان کو خلاصہ تنہا ترک کیں مگر بعضے خطبے اور اصطلاحات ہند وغیرہ کہ اصل مطلب سے متعلق تھے باقی رکھے۔

فی الواقع اگر اس رسالہ کی صنعت و رنگینی پر نگاہ کیجئے تو ہر ایک خطبہ اس کا معدن فصاحت ہے اور ہر ہر فقرہ مخزن بلاغت۔ ہر چند کہ عوام الناس ظاہر عبارت سے اس کی صرف مضمون مناظرے کا پاتے ہیں مگر علمائے دقیقہ شناس ادراک معانی سے دقائق و معارف الٰہی کا حظ اٹھاتے ہیں ....

ترجمہ اس رسالہ کا خلاصہ امیران ذوالاقتدار و زبدۂ بزرگان عالی مقدار حاتم دوراں افلاطون زماں سرور سروراں بہادر بہادراں نواب گورنر جنرل لارڈ منٹو بہادر دام اقبالہ کے عہد حکومت میں کہ سن ہجری بارہ سو پچیس ۱۲۲۵ھ اور سن عیسوی اٹھارہ سو دس ۱۸۱۰ء میں مرتب ہوا۔

(دیباچہ "اخوان الصفا" مطبوعہ ہندوستانی پریس ۱۸۱۱ء)

دیباچہ کی اس عبارت سے یہ چند باتیں بالکل صاف اور واضح طور پر سامنے آجاتی ہیں۔

(۱) اکرام علی اپنے استاد معظم اور محترم بھائی (علامہ) تراب علی نامی کے بلانے پر

کلکتہ پہنچے اور سب سے پہلے "ابراہیم لوکٹ" کو پڑھانے پر متعین کیے گئے

(۲) کپتان جان ولیم کی فرمائش پر انھوں نے عربی "اخوان الصفا" کا اردو ترجمہ کیا۔

(۳) یہ ترجمہ لارڈ منٹو کے عہد حکومت (۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء) میں مکمل ہوا۔

اکرام علی کے اس بیان کے بعد بظاہر مزید کسی تردیدی ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن "رینکنگ" کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہمیں گذشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ ادب کا جائزہ ضرور لے لینا چاہیے۔ خصوصاً کپتان ٹامس روبک کا وہ بیان جو "رینکنگ" کے مضمون کی اشاعت سے پوری ایک صدی پہلے ۱۸۱۹ء میں ان کی مشہور کتاب ANVALS OF THECOLLEG OF FOR WILLIAMS (مطبوعہ ہندوستانی پریس کلکتہ ۱۸۱۹ء) میں شائع ہوا تھا۔ ٹامس روبک کی یہ کتاب اس زمانے میں شائع ہوئی تھی جب علامہ تراب علی نامی بھی زندہ تھے اور اکرام علی بھی۔ ٹامس روبک نے لکھا ہے۔

"THE "IKHVAN OOS SAFA" TRANSLATAD IN TO HINDOOSTANEE FROM THE ORIGINAL ARABIC AND PUBLISHAD UNDER THE PATRONASE OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAMS BAY MU LUVEE IKRAM IKRAM -ALEE(علی) CALCUTTA PRINTED BAY A. H. HUBBARD AT THE HINDUSTANEE PRESS IN ONE VOL."

(8 VO – 1811 – P. 26)

فورٹ ولیم کالج کے متعلق مکمل یا نامکمل جو کچھ بھی مواد ملتا ہے وہ ٹامس روبک کی یہی کتاب ہے جس کا اقتباس پیش کیا گیا ہے اور اسے سامنے رکھنے کے بعد اس قسم کی تمام غلط فہمیوں سے پردہ ہٹ جاتا ہے جنھیں کرنل رینکنگ جیسے غیر ذمہ دار

لوگوں نے ایک صدی بعد تحقیقی کارنامے کے طور پر پیش کیا ہے۔

یہی نہیں "اخوان الصفا" چھپنے کے تخمیناً چالیس سال بعد ڈاکٹر فیلن اور مولوی کریم الدین دہلوی نے جب تذکرہ "تاریخ شعرائے اردو" مرتب کی تھی وہ بھی "کرنل رینکنگ" کی اس پرواز تک نہ پہنچ سکے تھے حالانکہ یہ دونوں حضرات ارباب فورٹ ولیم کالج کے معاصرین میں شمار کیے جاتے ہیں۔

تذکرہ "تاریخ شعرائے اردو" میں لکھا ہے:۔

"مولوی اکرام علی۔ بھائی تراب علی کا۔ جو کپتان لوکٹ صاحب کی خواہش سے جو کہ فورٹ ولیم کے مدرسہ کا سکریٹری تھا۔ وہ مولوی کلکتہ میں جا کر رہا اس کی سفارش سے درمیان ۱۸۱۲ء کے محافظ کتب خانہ ہوا اس حال میں ٹیلر صاحب نے اس سے کہا کہ رسالہ اخوان الصفا کا عربی سے تم ترجمہ آسان عبارت میں کرو مگر خوبی عبارت میں کوئی کسر نہ ہو اور جو تشبیہ آسان ہو اور جلدی سمجھ میں آوے وہ بھی موقوف نہ ہو۔

اس کتاب میں درمیان آدمیوں اور جانوروں کے سامنے جنوں کے بحث کرتے ہیں۔ ہر ایک جانور اپنی قوم کی عظمت بیان کرتا ہے مگر جو لوگ عقلمند آدمی ہیں وہ اس کو پڑھ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور اپنا حال اور باریکی صنائع خدا کے دریافت کرتے ہیں اور اس کے پڑھنے سے بہت باتیں دنیا کی دریافت ہوتی ہیں اس کے درس سے خوشی ہوتی ہے۔ اصل اس کتاب کے مصنف دس آدمی ابو سلمان۔ ابو محمد۔ ابو الحسن وغیرہ میں وہ لوگ بصرے میں رہتے تھے ان کے اوقات درمیان مطالع علم اور دین کی تحقیقات میں بسر ہوتے تھے اس میں اکیاون جلدیں ہیں جس میں سے اکثر رسائل بڑے ذی قدر عقلوں کے ہیں۔

"اخوان الصفا" ان اکیاون رسالوں میں سے ایک ہے۔ یہ ترجمہ اردو درمیان ۱۲۲۵ھ کے تیار ہوا لارڈ منٹو صاحب بہادر گورنر جنرل کے وقت میں اس کتاب کی بہت قدر تھی بہ سبب صفائے عبارت اور بیان کے۔ مگر اس میں عربی لفظ بہت آئے ہیں۔ ایشیاٹک جنرل میں اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا وہ اٹھائیسویں جلد میں ہے۔ یہ ترجمہ میں نے دیکھا ہے بہت اچھا ہے۔"

{صفحہ ۱۸۲ و ۱۸۳ "تاریخ شعرائے اردو" مطبع مطبع العلوم
مدرسہ دہلی ۱۸۴۸ء}

جہاں تک "اخوان الصفا" کے اصل مترجم کا سوال ہے ڈاکٹر فیلن اور مولوی کریم الدین دونوں کے بیانات اپنی جگہ پر ایک وقیع اور قابل اعتبار شہادت کا درجہ رکھتے ہیں جنھیں اس سلسلہ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر گارساں دتاسی (۱۸۰۳ء لغایۃ ۱۸۶۹ء) کی تحقیقی جد و جہد سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ گارساں نے مشرقی علوم کا جتنا گہرا مطالعہ کیا تھا اور مشرقی و ہندوستانی ادبیات پر اسے جتنا عبور حاصل تھا شاید ہی اس دور میں کسی دوسرے غیر ملکی کو حاصل ہو۔

گارساں کا نقطۂ قلم ہمیشہ کچھ لکھنے سے پہلے کافی چھان بین کرنے کا عادی تھا لیکن جہاں تک "اخوان الصفا" کے اردو ترجمہ کا سوال ہے وہ بھی تاریخ کی اس حقیقت سے متفق ہے کہ عربی "اخوان الصفا" کا اردو ترجمہ اکرام علی نے کیا۔ گارساں نے لکھا ہے۔

اخوان الصفا اکرام علی کے پاکیزہ ترجمے کی وجہ سے ہندوستان میں بہت مقبول ہے اس میں جانور باری باری سے اپنے اپنے صفات بیان کرتے ہیں

یہ صحیح ہے کہ خداوند تعالیٰ اکثر ہمیں جانوروں میں ایسے صفات کے نمونے دکھاتا ہے جو انسان کے لئے قابل تقلید ہوتے ہیں۔

("خطبات گارساں و تاسی صفحہ ۱۶۱ مطبوعہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن ۱۹۳۵ء)

گارساں نے فورٹ ولیم کالج کی بہت سی اردو تصانیف و تراجم کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا ہے چنانچہ اکرام علی کے اس اردو ترجمہ سے "اخوان الصفا" کو بھی فرانسیسی زبان کا قالب دینے کی اہم ادبی خدمت اسی نے انجام دی ہے فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء سے پہلے تخمیناً ۱۸۵۴ء تک قائم رہا۔ اس زمانے میں اکرام علی کی ترجمہ کی ہوئی "اخوان الصفا" کا جو اڈیشن مولوی اکرام احمد ضیغم نے تصحیح کر کے ۱۸۵۲ء میں مطبع محمدی (مچھوا بازار) کلکتہ سے شائع کیا تھا اس کے خاتمے کی عبارت سے بھی اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ یہ ترجمہ دراصل مولوی اکرام علی نے کیا تھا۔ خاتمہ کی عبارت یہ ہے۔

"مخفی ضمیر منیر شائقان قمر منزلت و مشتریان مشتری مرتبت کے نہ رہے کہ یہ قصہ "اخوان الصفا" اول زبان عربی سے فارسی میں ترجمہ ہوا تھا پھر مولوی اکرام علی صاحب نے اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ اس میں بیان انسان و حیوان کے مباحثہ کا ہے روبرو بادشاہ جنوں کے۔ عبارت اس کی نہایت سلیس مرغوب خاطر خاص و عام ہے پند و نصیحت سے بھرا ہوا ہر ایک مقام ہے۔ اس واسطے چند بار قالب طبع میں آیا۔ جس نے اس کو پڑھا حظ و لطف اٹھایا۔ اب جو بندہ پر گناہ محمد فیض اللہ نے دیکھا خواہان اس کے بے حساب ہیں اور یہ نسخہ بہت کمیاب ہے۔ لہٰذا اپنے محمدی چھاپے خانے میں کہ واقع مچھوا بازار ہے بہ تصحیح حافظ اکرام احمد صاحب متخلص بہ ضیغم کے ۱۲۶۸ھ میں روح بخش قالب طبع کیا۔ اغلب ہے کہ مطبوع طبع شائقان

حکایات نادرات کے ہو۔"

("نسخہ اخوان الصفار" (ہندی) مطبوعہ مطبع محمدی کلکتہ ۱۸۵۲ء)

اس اڈیشن کے سرورق پر لکھا ہوا ہے۔

"نسخہ" اخوان الصفار" (ہندی) ترجمہ فارسی "اخوان الصفار" کا جس کو مولوی اکرام علی صاحب نے کپتان جان ٹیلر صاحب کے حکم سے ترجمہ کیا تھا۔ کالج فورٹ ولیم کے اُردو سیکھنے والے صاحبوں کے لئے اور اس کے بغیر پڑھے امتحان کسی کا پورا نہیں ہوتا۔ اور فارسی نسخہ عربی کتاب سے ترجمہ کیا گیا تھا..... اس لئے یہ کتاب کرات و مرات چھاپی گئی اور مطبوع خاطر عاطر شائقان قدر دان کے ہوئی چنانچہ مولوی غلام حیدر صاحب ساکن ہگلی نے بھی بہ ایمائے بعضے صاحبان عالی شان مثل جناب سکنر صاحب ممدوح وجناب کرنل اسٹیو ڈیوس دہلی صاحب موصوف کے پتھر کے چھاپے خانے میں طبع کیا تھا مگر اکثر صاحبان دوراندیش اس کو پسند نہیں کرتے اسی باعث جو احقر بندگان درگاہ الٰہ فیض گردستگاہ سخوران آگاہ محمد شیخ اللہ نے دیکھا یہ کتاب کمیاب ہو گئی ہے لہٰذا واسطے صاحبان پُروفا اور اخوان باصفا اپنے مطبع میں.....!"

ان عبارتوں سے اگرچہ ایک نئی غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ اکرام علی صاحب کا اردو ترجمہ فارسی ترجمے کا رہین منت ہے لیکن حقیقت کی یہ بنیادی کڑی بہر حال نہیں ٹوٹتی جس کا تعلق اخوان الصفار کے ترجمے سے ہے اس اڈیشن کی یہ دونوں عبارتیں صاف اور صریحی الفاظ میں اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ "اخوان الصفار" کا ترجمہ اکرام علی ہی نے کیا تھا کسی اور نے نہیں۔۔!

جہاں تک اس اڈیشن کی اس غلط فہمی کا تعلق ہے کہ اکرام علی کے ترجمہ کا

ORIGAN عربی نہیں فارسی "اخوان الصفار" ہے یہ ایسی ہی ایک عامیانہ غلطی ہے جس کا ارتکاب "کرنل رینکنگ" سے سرزد ہوا۔ اور دوسری شہادتوں کو چھوڑ کر اگر صرف اکرام علی کا دیباچہ (اخوان الصفار) ہی پڑھ لیا جائے تو یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ انھوں نے یہ اُردو ترجمہ فارسی سے نہیں بلکہ عربی "اخوان الصفار" سے کیا ہے۔

اس ایڈیشن کی اس غلطی سے قطع نظر کرتے ہوئے ہمیں ان بیانات سے "اخوان الصفار" کے بارے میں کئی نئی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جنھیں اس سلسلہ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اخوان الصفار کے پہلے ایڈیشن ۱۸۱۱ء اور اس ایڈیشن (۱۸۵۲ء) کے درمیانی وقفہ میں اُردو اخوان الصفار کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے مگر بار بار چھپنے کے باوجود اس کتاب کی کمیابی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ اس زمانے میں اخوان الصفار کا یہ اردو ایڈیشن فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں شامل تھا اور جیسا کہ اس ایڈیشن کے سرورق کی عبارت سے ظاہر ہے "اخوان الصفار" کا پرچہ فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں اتنا اہم سمجھا جاتا تھا کہ اس میں ناکام ہونے کے بعد کوئی طالب علم کالج کی ڈگری حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ فورٹ ولیم کالج ختم ہو جانے کے بعد جب ہندوستان پر برطانوی شہنشاہیت کا تسلط ہوا تو بھی اخوان الصفار" کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آیا اور یہ کتاب بدستور انڈین سول سروس (I.C.S) کے نصاب میں داخل رہی۔

ان دونوں عبارتوں سے ایک دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ ۱۸۱۱ء اور ۱۸۵۲ء کے درمیان "اخوان الصفار" کے کئی ایڈیشن لیتھو (پتھر کے چھاپے) میں بھی چھپے لیکن انھیں وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو ٹائپ ایڈیشنوں کو حاصل تھی ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ اردو چھاپہ خانوں کا آغاز ٹائپ حروف کے مطابع سے

ہوا لیتھو پریس اس کے بہت دنوں بعد رائج ہوئے۔

اب میں اردو ادب کی تاریخ سے اس تابناک حقیقت سے متعلق اُردو زبان کے مسلم الثبوت مصنفین کے وہ بیانات بھی سامنے لانا چاہتا ہوں جس میں یہ تاریخی حقیقت اپنے صحیح خد و خال میں جگمگاتی نظر آتی ہے۔

مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) نے کرنل رینکنگ کے اس قیاس مفروضہ سے تقریباً پندرہ برس پہلے ۱۹۱۰ء میں تذکرہ "گلشن ہند" (میرزا علی لطف) کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"اکرام علی نے ۱۸۱۰ء میں رسائل "اخوان الصفا" میں سے ایک رسالہ کا ترجمہ عربی سے اُردو میں کیا جس میں شاہ اجنہ کے سامنے انسان و حیوانوں کا جھگڑا پیش ہوا کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے۔ یہ منجملہ اور رسائل کے ہے جو بغداد کی مشہور سوسائٹی "اخوان الصفا" کے اہتمام سے لکھے گئے تھے۔

(صفحہ ۶ تذکرہ گلشن ہند مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور ۱۹۰۶ء)

پروفیسر سید محمد لکچرار گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد دکن اپنے تذکرہ "ارباب نثر اُردو" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"مولوی اکرام علی ڈاکٹر گلکرائسٹ کے وطن واپس ہو جانے کے بعد فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے، یہ فورٹ ولیم کالج کے دوسرے دور کے اہل قلم میں ہیں انھوں نے کپتان جان ولیم ٹیلر کے ایماء سے رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالہ کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ رسائل بصرہ کی ایک علمی انجمن موسوم بہ "اخوان الصفا" کی یادگار ہیں اور دس مختلف آدمیوں کی تحقیقات اور موشگافیوں کا ماحصل ہیں۔

(صفحہ ۲۲۳ ارباب نثر اردو)

پھر آگے چل کر "طبقات الشعرائے ہند" کے حوالے سے لکھا ہے۔

اسی تذکرے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "اخوان الصفا" کا ترجمہ کرنے کے بعد بھی وہ کالج کے متوسل رہے اور ۱۸۱۴ء میں کالج کے محافظ کتب خانہ تھے۔ مولوی اکرام علی نے اس رسالہ کے علاوہ اور کوئی کتاب تالیف یا ترجمہ نہیں کی اور "اخوان الصفا" ہی ان کا واحد یادگار کارنامہ ہے۔"

(صفحہ ۲۲۶ ارباب نثر اردو مطبوعہ ابراہیمیہ پریس حیدرآباد دکن)

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں جگہ جگہ اکرام علی کا ذکر آیا ہے اور محققین ادب نے اس ڈیڑھ سو سال کے اندر تاریخ کی اس حقیقت کو جھٹلانے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ "اخوان الصفا" کا ترجمہ اکرام علی نے نہیں کیا۔ "تاریخ نظم و نثر اردو" میں آغا محمد باقر نے فورٹ ولیم کالج کے ارباب نثر کا تذکرہ کرتے ہوئے اکرام علی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

مولوی اکرام علی۔ انھوں نے عربی کی مشہور کتاب "اخوان الصفا" کا صرف وہاں تک اردو میں ترجمہ کیا ہے جہاں حیوانوں اور انسان کی برتری کا سوال جنوں کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا ہے اس میں تمام جانور انسان کے ظلموں کے خلاف مقدمہ پیش کرتے ہیں ہر جانور اپنا اپنا بیان دیتا ہے جو نہایت دلچسپ ہے اس پوری کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر ڈابرس نے انگریزی میں) کیا تھا کپتان ٹیلر کی فرمائش سے مولوی صاحب نے اس کا کچھ حصہ سلیس اُردو میں لکھا تھا جو ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۱۴ء میں کپتان لوکٹ کی سفارش سے جو اس وقت فورٹ ولیم کالج کے اعلیٰ افسر تھے مولوی صاحب فورٹ ولیم کالج میں محافظ دفتر مقرر ہو گئے تھے۔

(صفحہ ۲۱۷ "تاریخ نظم و نثر اُردو" مطبوعات شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۳۸ء)

مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے اپنی مشہور کتاب "سیر المصنفین" میں لکھتے ہیں۔

"مولوی اکرام علی نے ۱۸۱۰ء میں رسالہ "اخوان الصفاء" میں سے ایک رسالہ کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ جس میں شاہ اجنہ کے سامنے انسان اور حیوانوں کا جھگڑا درپیش ہے کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے؟ یہ منجملہ ان رسائل کے ہے جو بصرہ کی مشہور سوسائٹی "اخوان الصفاء" کے اہتمام سے لکھے گئے تھے آپ کلکتہ مولوی تراب علی صاحب (نامی خیر آبادی) اپنے بھائی کی طلبی پر گئے تھے اور وہاں مسٹر ابراہیم لاکٹ نے فورٹ ولیم کالج میں ملازم کرا دیا تھا چنانچہ کپتان جان ولیم ٹیلر کے ایما سے رسالہ مذکور "اخوان الصفاء" کا ترجمہ کیا۔"

{صفحہ ۱۶۴ "سیر المصنفین" جلد اول مطبوعات شیخ مبارک علی لاہور دوسرا ایڈیشن}

"بنگال میں اردو" کے مصنف وفا راشدی کا بیان بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

"اکرام علی۔ عربی زبان سے بھی متعدد کتابیں اردو میں منتقل ہوئیں ان میں خاص طور پر قابل ذکر وہ ترجمہ ہے جسے اکرام علی نے ۱۸۱۰ء میں بغداد کے شہرہ آفاق رسائل اخوان الصفاء میں سے ایک رسالہ کا ترجمہ اخوان الصفاء کے نام سے کیا۔ یہ انسانیت اور حیوانیت کے موازنے کا اصلی نمونہ ہے۔"

(صفحہ ۲۱ و ۲۲ "بنگال میں اردو" مکتبہ اشاعت اردو حیدر آباد پاکستان)

تاریخ کی ان تمام حقیقتوں کو سامنے رکھ کر کرنل رینکنگ کے اس بیان کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں کہ "اخوان الصفاء" کا اردو ترجمہ (علامہ) تراب علی نامی نے کیا تو ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ "رینکنگ" کا یہ بیان از سر تا پا

ایک شدید قسم کی غیر تاریخی غلط فہمی سے کم نہیں ہے اور "رینکنگ" کی اس تحقیق کو حقیقت سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے۔

"رینکنگ" کی تحریر سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اپریل ۱۸۱۰ء میں کالج کاؤنسل نے اس ترجمہ کی اشاعت کے لئے گورنمنٹ سے سفارش کی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ مترجم کو بھی اس کی ایک سو جلدیں دی جائیں۔

چھپنے کے بعد یہ سو جلدیں اکرام علی کو دی گئیں جس میں سے چند جلدیں انھوں نے اپنے وطن سیتاپور بھی بھیجی تھیں۔ اکرام علی کے پرپوتے منشی رضا ادیب نے "اخوان الصفاء" (سیتاپور ایڈیشن) کی تمہید میں لکھا ہے۔

"چونکہ وہ زمانہ ایسا نہ تھا جیسا کہ اس وقت کتابوں کی تجارت اور مضامین تحریری سے حصول زر کیا جاتا ہے اور نہ اس وقت میں پتھر کی چھپائی اس قدر کثرت سے سہل الحصول تھی لہذا لوہے کے چھاپے اور انگریزی حروف کے سانچے میں یہ کتاب شائع ہوئی اور بدستور زمانہ مذکور بلا معاوضہ تقسیم ہو گئی۔ جس کی چند جلدیں جناب مترجم شیخ اکرام علی صاحب مرحوم نے جو میرے جد امجد تھے اپنے وطن سیتاپور میں روانہ فرما دیں۔"

(صفحہ ۱ و ۲ اخوان الصفاء سیتاپور ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۱۶ء)

فورٹ ولیم کالج نے یہ کتابیں بہ قیمت فروخت کی ہوں چاہے مفت تقسیم کی ہوں۔ مگر سیتاپور میں اس ایڈیشن کے چند نسخے جو آج بھی موجود ہیں وہ یقیناً تحفتہً پیش کئے گئے تھے۔ خود میرے پاس دو جلدیں تھیں ایک جلد تو میں نے مولوی عبدالحق صاحب (سکریٹری انجمن ترقی اردو) کو بھیج دی تھی دوسری اب تک میرے پاس محفوظ ہے مگر حد درجہ شکستہ حالت میں ابتدائی اور آخری صفحات قطعاً ضائع ہو گئے ہیں۔

اکرام علی کی ایک اور تصنیف

جیسا کہ پروفیسر سید محمد نے "ارباب نثر اردو" میں لکھا ہے۔

"مولوی اکرام علی نے اس رسالے کے علاوہ اور کوئی کتاب تالیف یا ترجمہ نہیں کی اور "اخوان الصفا" ہی ان کا واحد یادگار کارنامہ ہے۔"

(صفحہ ۲۳۶ ارباب نثر اردو)

عام طور پہ یہی رائے قائم کرنا پڑتی ہے کیونکہ "اخوان الصفا" کے علاوہ ان کی کسی اور مطبوعہ یا قلمی کتاب اب تک سامنے نہ آسکی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اکرام علی کی یادگار یہی ایک "اخوان الصفا" نہیں ہے بلکہ اردو فارسی اور عربی کی کئی کتابیں ان کے خاندان میں موجود تھیں جو قریب قریب سب تلف ہوگئیں اور جو دو ایک باقی ہوں گی وہ ایسے نااہل افراد کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہیں جن کا ضائع کر دینا ہی وہ سعادت سمجھتے ہیں۔

جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے اکرام علی کا جو سامان کلکتہ اور اجمیر سے سیتاپور آیا تھا اس میں فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات کے علاوہ ایک اچھا خاصا ذخیرہ قلمی کتابوں کا بھی تھا۔ اور اس میں اکرام علی کی تصنیف و تالیف کی ہوئی متعدد کتابیں درجنوں بیاضیں اور کئی کشکول تھے۔ ان کی تصانیف میں کئی کتابیں فن طب و حکمت میں بھی بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ کتب خانہ منشی حسن رضا ادیب اور منشی علی محمد ناظم کے مرنے کے بعد اس بری طرح تباہ و برباد ہوا کہ تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

انھیں کتابوں میں "اکرام علی" کی وہ معرکۃ الآرا تالیف "مصنفین اسلام" بھی شامل تھی جو مشہور عربی کتاب "الفہرست ابن ندیم" کے طرز پر اردو زبان کی پہلی کتاب کہی جاتی ہے جس میں بارہ سو سال کے تمام مصنفین اسلام کے تحقیقی حالات اور علمی کارناموں کی ایسی تصویر پیش کی گئی تھی جس کی کوئی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ قاضی الیاس حسین نے اپنے ایک مضمون (مصنفین سیتاپور کی تصانیف) میں اس کتاب کا ذکر بھی کیا ہے۔

"مصنفین اسلام (قلمی) مولوی اکرام علی تاریخ مولوی حکیم شیخ اکرام علی فاروقی حنفی فریدی مفتی اجمیر شریف کی کتاب تھی اولاد کی غفلت سے یہ کتاب ان کی اولاد سے جاتی رہی۔"

(صفحہ ۴۹ سہ ماہی مصنف علی گڑھ بابتہ اکتوبر ۱۹۴۲ء و جنوری ۱۹۴۳ء)

صرف ایک شعر

پروفیسر سید محمد (عثمانیہ) نے "ارباب نثر اردو" میں لکھا ہے۔

"مؤلف طبقات الشرائے ہند" نے لکھا ہے کہ مولوی اکرام علی شاعر بھی تھے اور "اکرام" تخلص کرتے تھے۔ مگر ان کا کوئی شعر نقل نہیں کیا اسی تذکرہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "اخوان الصفار" کا ترجمہ کرنے کے بعد وہ کالج کے متوسل رہے اور ۱۸۴۳ء میں کالج کے محافظ کتب خانہ تھے۔

مولوی اکرام علی نے اس رسالہ کے علاوہ اور کوئی کتاب تالیف یا ترجمہ نہیں کی اور "اخوان الصفار" ہی ان کا واحد یادگار کارنامہ ہے۔"

(صفحہ ۲۳۶ - "ارباب نثر اردو" مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۷ء)

مولف "طبقات الشرائے ہند" کا بیان غلط نہیں ہے "اکرام علی" فارسی کے ایک نہایت ہی خوش فکر اور اچھے شاعر تھے "اکرام" تخلص کرتے تھے لیکن ان کے کلام کا تمام حصہ جو غزلیات کے علاوہ قصائد، منقبت اور مثنویات پر مشتمل تھا اب کہیں نظر نہیں آیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ "اکرام علی" کی کچھ قلمی بیاضیں جامع مسجد (شیخ سرائے سیتاپور) کے کسی دیوانی کے مقدمہ میں داخل کی گئی تھیں پھر واپس نہیں لی گئیں اور اسی مقدمہ کی مسل کے ساتھ محفوظ ہیں۔ لیکن نہ تو اب تک مجھے اس دیوانی کے مقدمہ کا پتہ و نشان معلوم ہو سکا نہ اس بات کی تصدیق ہو سکی کہ اس قسم کا ریکارڈ کہیں محفوظ بھی ہے یا نہیں؟

اکرام علی نے فارسی اور عربی کے دوسرے علوم کی طرح علامہ تراب علی نامی ہی سے فن شعر بھی حاصل کیا تھا۔ نامی کے علاوہ اگر کسی اور کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہو تو کسی تذکرے سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ محترم پروفیسر آغا اشہر لکھنوی کے توسط سے ہم تک اکرام علی کا صرف ایک شعر پہنچ سکا ہے جو پروفیسر اشہر نے اپنے خسر منشی علی محمد نظم (نبیرۂ اکرام علی) کی زبان سے سُنا تھا۔ وہ شعر یہ ہے۔

اکرام بہ ہجر تو چناں اشک فشاند
چوں آب کثیر ابر گہربار بریزد

ہندوستانی پریس

ہندوستان میں چھاپہ خانوں کی ابتدا سولھویں صدی عیسوی میں ہوئی اور اسے تسلیم کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کرنا چاہئے کہ اب سے پورے چار سو سال پہلے ۱۵۵۶ء میں "سینٹ فرانسس زیویئر" (ST. FRANCIS ZAVIER) کی طرف سے جو "کاٹی کزم آف دی کرسچین ڈاکٹرن" (CAHOLICISM OF THE CHRISTIAN DOCTIRINE) (مسیحی تعلیمات کا سوالنامہ مع جواب) "گوا" کی زبان میں شائع کی گئی تھی وہ یہیں ہندوستان میں چھپی تھی۔ پیارے لال شاکر میرٹھی اپنے ایک مضمون (ہندوستان میں چھاپہ خانوں کا پہلا دور) میں تحریر فرماتے ہیں۔

"جیسوئیت پادریوں نے گوا میں آنے کے کچھ عرصہ بعد یورپ سے دو پریس منگائے اور ان کو اپنے دو کالجوں میں نصب کیا۔ پریس ۱۵۵۰ء میں آئے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ چند سال تک واقعی ان سے کام نہیں لیا گیا۔ ۱۵۵۷ء میں "سینٹ فرانسس زیویئر" نے "کاٹی کزم آف دی کرسچین ڈاکٹرن" مدون کی۔ جو چھاپ کر شائع کی گئی یہ سب سے پہلی کتاب تھی جو گوا (پرتگیزی دور میں۔ گوا ہندوستان سے الگ نہ تھا) میں طبع ہوئی جس کتاب سے یہ معلومات حاصل کی گئی ہیں اس کا بیان ہے کہ ——

"بچوں کی صحیح تعلیم کی غرض سے "زیویئر" نے ایک "کاٹی کزم" تیار کی جو

گوا میں ۱۵۵۷ء میں طبع ہوئی۔

اوریئنٹل کانگریسٹ مطبوعہ لزبن ۱۸۸۰ء جلد اول

(صفحہ ۳۶ ماہنامہ زمانہ کانپور بابتہ ماہ جنوری ۱۹۳۹ء)

اس کے بعد ۱۵۷۷ء میں جان "گنسالوس" نے کوچین میں ایک "کاٹی کزم" چھاپی جو تامل زبان میں تھی چنانچہ پیارے لال شاکر میرٹھی نے لاطینی زبان کی دو کتابوں کے حوالے سے (جو ۱۶۹۴ء اور ۱۶۹۶ء میں روم میں شائع ہوئی ہیں) لکھا ہے:۔

ا۔ "سب سے پہلی کتاب جو ٹائپ سے طبع ہوئی جان گنسالوس" کی طبع کردہ "مسیحی تعلیمات" ہے ہمارے علم میں جان گنسالوس وہ پہلا شخص ہے جس نے اول بار تامل حروف کندہ کئے۔

۲۔ ۱۵۷۷ء میں کوچین میں "جان گنسالوس" نے پہلی مرتبہ مالاباری تامل حروف لکڑی پر کندہ کئے جن کے ذریعہ سے "مسیحی مذہب کی ابتدائی تعلیم" ہندوستان میں اول کتاب کی حیثیت سے طبع ہوئی۔"

(صفحہ ۳۸ ماہنامہ زمانہ کانپور جنوری ۱۹۳۹ء)

پھر ۱۵۷۸ء میں ایک چھاپہ خانہ موضع "پنی کیل" ضلع تناولی میں قائم کیا گیا جو موضع "کیپ کامرن" سے میں میل کے فاصلے پر تھا اور اس زمانے میں موتیوں کی پیداوار کی وجہ سے ایک بہت بڑا تجارتی مرکز بن گیا تھا یہ پریس مسیحی فادر "جان ڈی فیریا" نے قائم کیا تھا اور اپنے پریس کے لئے تامل زبان کے حروف خود کاٹ کر انھیں ڈھالا تھا۔ اس پریس میں تامل زبان کا قاعدہ اور ایسی ہی دو چار کتابیں تامل زبان میں شائع کی گئی تھیں۔

سترھویں صدی عیسوی میں مسیحی پادریوں کے شائع کردہ کئی چھاپے خانوں کا

پتہ ملتا ہے جن میں سے سنہ ۱۶۰۲ء میں "سینٹ ٹامس کلیسیا" کا پریس بھی تھا جسے
جیسویٹ پادریوں نے کرنگانور کے قریب "وپی کوٹہ" (چینامنگلم) میں شائع کیا تھا۔
اس کے بعد سنہ ۱۶۷۹ء میں تریچور سے بیس میل کے فاصلے پر موضع "امبلاکاڑ" میں
بھی انھیں پادریوں نے اپنے مشن کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ایک مطبع قائم
کیا جس میں تامل زبان کی ڈکشنری کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں چھپتی رہیں۔ کوچین
اور "وپی کوٹہ" کے مطابع کے مقابلہ میں اس پریس نے نمایاں ترقی کی تھی۔

اس پریس میں تامل حروف کے ٹائپ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے لکڑی
کے ٹھپے استعمال کئے جاتے تھے اور یوروپین زبانوں کے "ٹائپ" سیسے کے استعمال
ہوتے تھے جو اس زمانے میں آسانی سے مل جایا کرتے تھے لیکن کچھ دنوں کے بعد اس
پریس نے "تامل" حروف کا بھی ایک ٹائپ تیار کرلیا جو "سیسے میں" ڈھالا گیا تھا۔

زمانہ اب کچھ اور آگے بڑھ چکا تھا اٹھارہویں صدی کے آغاز میں ہندوستان
ایشیا کا تنہا وہ ملک بن چکا تھا جہاں قریب قریب ہندوستان کی تمام زبانوں میں
ٹائپ تیار ہونے لگے تھے۔ شاکر میرٹھی نے لکھا ہے۔

"اٹھارہویں صدی میں اس کام میں پراٹسٹنٹ مشنریوں نے نمایاں ترقی کی
تھی منجملہ ان کے ڈاکٹر "ولیم کیری" کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جنھوں نے
ہندوستان کی دس بارہ زبانوں مثلاً بنگالی۔ ہندوستانی (ناگری) سنسکرت۔
تلیگو۔ پشتو۔ برمی۔ تامل۔ سنگالی ملائی وغیرہ میں انجیل مقدس کا ترجمہ چھاپ کر
شائع کیا تھا۔ حتیٰ کہ چینی زبان میں انجیل مقدس شائع کی۔ جس کی طباعت
کے لئے سیسے کے حروف تیار کئے گئے تھے حالانکہ خود چین میں چوبی حروف یا
ٹھپے استعمال ہوتے تھے۔ ڈاکٹر کیری کے مطبع (واقع سیرام پور نزد کلکتہ) کی مصروفیات
و ترقی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے

"ٹائپ فاؤنڈری" اور کاغذ سازی کا کارخانہ قائم کیا تھا۔ وہاں کا کاغذ
آج تک "سیرامپوری" کے نام سے مشہور ہے۔ ٹائپ کا کارخانہ سنہ ۱۸۶۰ء تک
اور کاغذ سازی کا سنہ ۱۸۶۵ء تک قائم و جاری رہا۔"

(صفحہ ۴۰ ماہنامہ زمانہ کانپور جنوری سنہ ۱۹۳۹ء)

ان تاریخی حقائق اور شواہد سے ثابت ہے کہ ہندوستان میں چھاپہ خانوں کی
ابتدا تو سولھویں صدی میں ہوگئی تھی لیکن یہ تمام پریس دکھنی ہندوستان کی مقامی
زبانوں میں صرف مسیحی مشن کی کتابیں چھاپتے تھے ان میں ایک پریس بھی اردو
رسم الخط کا نہ تھا۔ شاکر میرٹھی کے بیان سے بھی یہ بات صاف ہو جاتی ہے "سیرام پور
میں جو مطبع ڈاکٹر کیری نے قائم کیا تھا اس میں بھی فارسی اور اردو رسم الخط کے
ٹائپ نہیں تھے اور نہ اس پریس سے اردو فارسی میں "انجیل مقدس" کے کوئی
ایڈیشن شائع کئے گئے۔

اردو فارسی رسم الخط کا ٹائپ سب سے پہلے وارن ہیسٹنگز (WARREN
HASTINGS) کے زمانے میں بنایا گیا جس کی ایجاد کا سہرا سر چارلس
ولکنس" (SIR CHARLES WILKINS) کے سر ہے جو ایک مشہور برطانوی
عالم تھے سر چارلس (۱۷۵۰ء لغایۃ ۱۸۳۶ء) تقریباً سنہ ۱۷۶۸ء میں ہندوستان
پہنچے اور یہیں سب سے پہلے کمپنی کی مالوہ فیکٹری میں فارسی زبان سیکھی اس کے بعد
بنگالی اور سنسکرت وغیرہ بھی پڑھ لیں۔ عرصہ تک بنگال کی سول سروس میں رہے اور
یہیں وارن ہیسٹنگز کی فرمائش پر بنگالی ٹائپ کا سیٹ تیار کیا۔ انھیں ہندوستان
کے فن طباعت کی ارتقائی سرگرمیوں کا بانی سمجھا جاتا ہے علامہ عبداللہ یوسف علی
نے تحریر فرمایا ہے۔

"(سر چارلس) ولکنس ہندوستان میں فن طباعت کی ترقی یافتہ صورت کے

بانی تھے کیونکہ انھوں نے فارسی اور بنگلہ زبانوں کے حروف کے ٹائپ تیار کر کے سانچے میں ڈھالے یہ غالباً ۱۷۷۸ء سے پہلے کا واقعہ ہوگا کیونکہ "ہیلہڈ" کی سنسکرت گرامر اس سال اسی ٹائپ میں بمقام ہگلی چھاپی گئی۔ "ہیلہڈ" اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

مسٹر ولکنس جنھیں بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سول سروس میں کام کرتے کئی سال گذر چکے ہیں ایک علم دوست شخص ہیں جنھوں نے گورنر جنرل (وارن ہیسٹنگز) کے مشورے بلکہ فرمائش سے بنگلہ حروف کا سیٹ تیار کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ انھوں نے یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچایا جس میں انھیں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ ایک ایسے ملک میں جو اس وقت یورپین صناعوں سے اس قدر بے تعلق رہا ہو مسٹر ولکنس کو ان تمام مختلف کاموں کا بار خود اٹھانا پڑا جن کا تعلق دھات کے گلانے اور صاف کرنے۔ کھودنے۔ ڈھالنے اور چھاپنے سے ہے۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ مسٹر ولکنس نے صرف ایجاد ہی کا کام نہیں کیا بلکہ اس کی تکمیل خود اپنے ہاتھ سے کی۔ وہ اس معاملے میں ایسی عجلت سے جو یورپ میں نہیں پائی جاتی ان تمام رکاوٹوں اور دقتوں پر غالب آئے جو لازمی طور پر ایک مشکل فن کی ابتدائی مراحل کے سدِ راہ ہوتی ہیں اس کے علاوہ مسٹر ولکنس کو اپنے اس تجربے میں اکیلے ہونے کے باعث دقت پیش آئی۔"

پھر عبداللہ یوسف علی نے فارسی اُردو ٹائپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ولکنس کا فارسی ٹائپ اور اُردو زبان کے اس ٹائپ کا پہلا نمونہ تھا جو ہندوستان میں اٹھارہویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز میں دورِ اول میں استعمال کیا گیا۔ یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان زبانوں کے لئے ٹائپ کی چھپائی کا سلسلہ لیتھو کی چھپائی سے پہلے شروع ہوگیا تھا۔ یہی ٹائپ

یا ایسے ٹائپ جو بعد میں اس کے نمونے پر بنائے گئے کئی سال تک کلکتہ اور بنگال میں استعمال ہوتے رہے۔ نہ صرف سرکاری قوانین و ضوابط اس ٹائپ میں چھاپے گئے بلکہ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج (قائم شدہ ۱۸۰۰ء) اور انگلستان کے "ہیلی بری کالج" (قائم شدہ ۱۸۰۶ء) کی کتابیں اس ٹائپ سے چھاپی گئیں نیز تقریباً ۱۸۰۰ء سے ۱۸۳۷ء تک کے زمانے میں جو مطبوعات کا ذخیرہ اردو زبان میں اس فرقہ کا چھپا ہے جس کو وہابی کہتے ہیں وہ بھی اسی ٹائپ میں شائع ہوا۔"

(صفحہ ۱۶ لغایۃ ۴۰ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ)

ولکنس کا یہ ٹائپ وارن ہیسٹنگز کی فرمائش پر تیار ہوا تھا اور یہ سب سے پہلے سرکاری ضرورتوں کے استعمال میں لے لیا گیا۔ اگرچہ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ "فورٹ ولیم کالج" میں جو ٹائپ مشین لگائی گئی تھی وہ اُردو کا پہلا سرکاری پریس تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے "ولکنس ٹائپ" ایجاد ہونے کے بعد یہ سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سرکاری چھاپے خانے میں استعمال کیا گیا اور اس زمانے میں فارسی یا اردو کا جو کچھ بھی سرکاری کام چھپا ہے وہ کمپنی کے اسی ذاتی مطبع میں چھاپا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نیم سرکاری اخبار "کلکتہ گزٹ" جس کا پہلا پرچہ ۴ مارچ ۱۷۸۴ء کو نکلا تھا اس کے بارے میں جدید تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس میں پہلی اشاعت ہی سے فارسی کا ایک کالم شامل تھا۔ ۴ مارچ ۱۷۸۴ء کے پہلے شمارے میں جو فارسی کالم شائع ہوا تھا اس کا عنوان خلاصہ اخبار دربار معلی بہ دارالخلافت شاہ جہاں آباد تھا۔

یقینی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ فورٹ ولیم کالج میں جو پریس مشین نصب کی گئی تھی وہ کمپنی کی یہی سرکاری مشین تھی یا کوئی دوسری! یا اُردو فارسی ٹائپ حروف کے جو سٹ کالج پریس میں پہلے پہلے استعمال کئے گئے وہ کمپنی کے سرکاری پریس سے حاصل کئے گئے تھے یا دوسرے تھے! لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج

کے ابتدائی چند سال تک اُردو فارسی کا جو ٹائپ سٹ کالج پریس میں استعمال ہوتا رہا وہ یہی ہوگا جسے ولکنس نے کمپنی کے لئے بنایا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس قسم کے کئی ٹائپ سٹ ڈھالے گئے ہوں جن میں سے ایک یا دو سٹ کمپنی نے کالج کو دے دئے ہوں۔ بہر حال اٹھارہویں صدی کے خاتمے اور انیسویں صدی کے چند ابتدائی برسوں تک اُردو فارسی ٹائپ کے انھیں دو سرکاری مطابع کا پتہ چلتا ہے البتہ انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں "ہندوستانی پریس" (کلکتہ) کے آثار و شواہد ضرور پائے جاتے ہیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تعاون سے اکرام علی نے قائم کیا تھا چنانچہ قاضی عبد الغفار (سکریٹری انجمن ترقی ہند) نے اپنی ایک ریڈیائی تقریر میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جہاں تک میری رسائی ہوسکی ہے اُردو زبان کا پہلا مطبع (غالباً ٹائپ) ۱۸۰۱ء میں بمقام کلکتہ قائم ہوا۔ پریس کا نام ہندوستانی پریس تھا اور اس کے مالک اکرام علی صاحب تھے۔"

(صفحہ ۱۰ ماہنامہ نگار لکھنؤ سنہ ۱۹۴۰ء)

اکرام علی کے اس پریس کا تذکرہ اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف نے اپنی کتاب "اختر شہنشاہی" میں کیا ہے جو ہندوستانی پریس اور صحافت کی تاریخ پر پہلی ہندوستانی کتاب ہے۔ اختر الدولہ مشہور فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر گارساں دتاسی کے معاصرین میں تھے۔ جس زمانے میں گارساں پیرس میں بیٹھ کر ہندوستانی ادبیات کے گہرے مطالعے میں مصروف تھا "اختر الدولہ" ہندوستان کے ہر ہر شہر اور قصبہ کی خاک چھان کر ہندوستانی پریس اور اخبارات کی یہ تاریخ مرتب کر رہے تھے۔

"اختر الدولہ" نے اکرام علی کے اس ہندوستانی پریس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"ہندوستانی پریس۔ کلکتہ۔ مالک مولوی اکرام علی مہتمم مولوی خلیل الدین (اشک) تاریخ اجرا یکم جنوری ۱۸۰۱ء" (صفحہ ۳۴۲ اختر شہنشاہی مطبوعہ اختر پریس لکھنؤ سنہ ۱۸۸۸ء)

تاریخی حیثیت سے اس کا کوئی ثبوت ابھی تک فراہم نہیں ہو سکا کہ یہ پریس مشین کہاں سے کس قیمت پر حاصل کی گئی تھی البتہ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس مطبع کے قیام اور ضروری سامان کی فراہمی میں اکرام علی کے چہیتے شاگرد "براہم لوکٹ" کا ہاتھ ضرور تھا جو اس زمانے میں فورٹ ولیم کالج کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے ہوسکتا ہے یہ مشین کالج ہی کی کوئی زائد مشین ہو جسے اکرام علی کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہو۔

میری نظر سے اس پریس میں چھپی ہوئی جس قدر کتابیں اب تک گذری ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مطبع میں اُردو فارسی ٹائپ کے علاوہ عربی اور انگریزی کا ٹائپ بھی موجود تھا۔ مطبع کے مہتمم کی حیثیت سے مولوی خلیل الدین اشک کے وجود کا بھی پتہ چلتا ہے مگر پریس قائم ہونے کے ابتدائی زمانے میں دو اور نام بھی ملتے ہیں ایک تو اے۔ ایچ۔ ہابرڈ (A.H.HUBBARD) کا دوسرا پی پیریرا (P.PEREIRA) کا۔ یہ دونوں غالباً پریس کے کام سے واقف ہونے کی حیثیت سے مطبع میں ملازم رکھے گئے تھے ان دونوں کے نام مختلف کتابوں پر پرنٹر کی حیثیت سے چھپے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "اخوان الصفا" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۱۰ء میں ہابرڈ کے زیر اہتمام چھپا تھا اور ہندوستان میں پریس اس وقت بالکل نئی چیز تھا اکرام علی اس مشینی کام کو خود سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ بغیر چند عمل کاروں کے ان کے لئے یہ کام چلانا دشوار ہی نہیں محال تھا۔ خصوصاً اس دور کے عربی اور فارسی ٹائپ میں خوشنما بڑے حروف بھی نہیں ڈھلے تھے اس لئے ہر کتاب کا سرورق عام طور پر انگریزی حروف میں چھاپا جاتا تھا اور اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اردو یا عربی ٹائپ کے علاوہ انگریزی ٹائپ کا ہونا بھی ضروری تھا۔ اس وقت تک ہندوستان میں پریس کا کام جاننا تو درکنار کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا "ہابرڈ" اور پی پیریرا (P.PEREIRA)

کو ایک خاص "عمل کار" کی حیثیت سے نوکر رکھ لیا گیا جو اس سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مطبع میں کام کر چکا تھا۔

"اخوان الصفا" کا اُردو ترجمہ چونکہ کالج کے لئے کیا گیا تھا اس لئے ۱۸۱۱ء میں اسے کالج کی طرف سے ہندوستانی پریس میں چھپوایا گیا۔ اور "اخوان الصفا" کا عربی ایڈیشن بھی ۱۸۱۲ء میں "ہندوستانی پریس" ہی میں چھپا۔ اس عربی ایڈیشن سے یہ تو نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کتاب "فورٹ ولیم کالج" نے چھپوائی تھی لیکن اس کتاب پر کتب خانہ فورٹ ولیم کالج کی جو مہر چھپی ہوئی ہے اس سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس کی اشاعت میں فورٹ ولیم کالج یا ٹی۔ ٹی۔ ٹامسن (T. T. THOMASON) کا ہاتھ ضرور تھا جنھوں نے انگریزی زبان میں کئی صفحے کا ایک مقدمہ بھی لکھ کر شامل کیا ہے۔ اس کتاب کو علامہ احمد یمنی نے ترتیب دیا تھا۔

"اخوان الصفا" کے اس عربی ایڈیشن کی چھپائی میں عربی ٹائپ کے جو حروف استعمال کئے گئے ہیں وہ بالکل اسی نمونے کے ہیں جس قسم کا ٹائپ اس زمانے میں "کالج پریس" میں استعمال کیا جا رہا تھا اسی طرح انگریزی کا ٹائپ میں بھی کوئی فرق نہیں ہے اور "کمپوزنگ" (COMPOSING) کا انداز بھی اسی مخصوص طرز کا ہے۔ سرورق انگریزی حروف میں ہے جس میں "اخوان الصفا" کے (SPEL) اس طرح پر چھپے ہیں۔ (ICHWAN-OOS-SUFFA)

اس کتاب پر "ہندوستانی پریس کلکتہ" کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔

"PRINTED BY P. PEREIRA"

اکرام علی کے ہندوستانی پریس میں چھپی ہوئی جن کتابوں کا پتہ چلتا ہے ان میں کپتان ٹامس روبک کی مشہور کتاب "ANVRLS OF THE COLLEGE OF WILLIM" بھی ہے جس میں فورٹ ولیم کالج کے اٹھارہ سالہ دورِ حیات

(مئی ۱۸۰۰ء لغایتہ دسمبر ۱۸۱۸ء) کی ایک مستند تاریخ پیش کی گئی ہے یہ کتاب ۱۸۱۹ء میں ہندوستانی پریس سے چھپ کر شائع ہوئی اور "کلکتہ گزٹ" (اپریل ۱۸۱۹ء) میں پہلی بار اس کا اشتہار شائع ہوا۔ یہ کتاب کمیاب ہے جس قدر تفصیلات سامنے آسکی ہیں ان سے اتنا اور پتہ چلتا ہے کہ جس زمانے میں کپتان روبک کی یہ کتاب چھپی ہے ہندوستانی پریس کلکتہ میں اکرام علی کی جائے سکونت "بہو بازار" میں نصب تھا۔

ان دو کتابوں کے علاوہ اس وقت عربی کی تین کتابیں اور بھی میرے سامنے ہیں جو ۱۸۱۲ء ۱۸۱۳ء میں "ہندوستانی پریس" نے چھاپی تھیں۔ (۱) علامہ شیخ احمد یمنی کی ترتیب دی ہوئی "اخوان الصفا" جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ (۲) احمد ابن محمد یمنی شروانی کی "العجائب فی مغیب الکتاب" (۳) شہاب الدین احمد (یا من عبداللہ آفندی کی "العقد الفرید"۔ ! عربی کی یہ دونوں کتابیں بھی اس ٹائپ میں چھپی ہیں جن حروف کے ٹائپ میں "اخوان الصفا" کا عربی ایڈیشن چھاپا گیا ہے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق مولوی خلیل الدین اشک کی حیثیت اس مطبع میں "اعزازی مہتمم" کی تھی کیونکہ اکرام علی سے ان کے جو عزیزانہ اور برادرانہ تعلقات تھے ان کا تقاضا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی خدمات کا کوئی معاوضہ لیتے۔ اشک نے ۱۸۰۹ء میں کپتان ولیم ٹیلر کی فرمائش پر علامہ ابوالفضل کے "اکبر نامہ" کا ترجمہ "واقعات اکبر" کے نام سے مکمل کر کے ان کے سپرد کر دیا۔ یہ ان کی سب سے آخری کتاب تھی ان کی وفات کا زمانہ علامہ تراب علی نامی کی وفات سے دو چار سال پہلے بتایا جاتا ہے یعنی تخمیناً ۱۲۳۶ھ۔ اگر آخر زمانے تک کالج کی ملازمت سے منسلک رہنے کے باوجود "ہندوستانی پریس" کے کاموں سے خاص دلچسپی لیتے رہے۔ مشہور ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی اکثر مطبوعات کے "پروف" آخری طور پر انھیں کے دستخط سے پاس کئے جاتے تھے اور ان کی یہ خصوصیت بیان کی جاتی ہے کہ ان کی دیکھی ہوئی عربی۔ فارسی یا اردو کتابوں

میں تلاش کرنے پر بھی کوئی غلطی نہیں ملتی تھی۔ "ہندوستانی پریس" کی چھپی ہوئی کتابیں بھی
اپنی اس خصوصیت کے اعتبار سے آج بھی طباعت کا مستند ترین نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔

اگر میری یاد غلطی نہیں کر رہی ہے تو اس پریس کی چھپی ہوئی کئی ایسی کتابیں اب
بھی موجود ہیں جن کا سن طباعت ۱۸۲۵ء یا اس کے گرد و پیش ہے۔ اسی لحاظ سے یہ
قیاس غلط نہ ہوگا کہ یہ پریس ۱۸۲۵ء تک اکرام علی کی ملکیت میں جاری رہا۔

میرے دوست جناب محمد عتیق صدیقی نے اپنی تصنیف کتاب "ہندوستانی
اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)" میں "ہندوستانی پریس" کا زمانہ قیام ۱۸۰۱ء بتایا
ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے میر بہادر علی حسینی کی "اخلاق ہندی" کے پہلے اڈیشن
کا ذکر کیا ہے جو ۱۸۰۳ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ میں چھپی تھی جس کے مہتمم "مولوی
خلیل اللہ (اشک) نہ تھے۔ صدیقی صاحب نے لکھا ہے۔

"کلکتہ کے انگریزی اخباروں کے ان چھاپے خانوں کو ہم لوگ نظر انداز
کر دیں جہاں فارسی رسم الخط کے ٹائپ موجود تھے تو فارسی رسم الخط کا پہلا
باضابطہ تجارتی چھاپہ خانہ ۱۸۰۱ء کے اواخر یا ۱۸۰۲ء کے اوائل میں قائم
ہوا۔ اس کا نام ہندوستانی پریس تھا۔ ۱۸۰۲ء میں اس چھاپے خانے سے
فورٹ ولیم کالج کی کم از کم ایک کتاب ضرور شائع ہوئی اس کتاب کا نام تھا
THE STRANGERS EAST INDIA GUIDE TO THE
HINDUSTANI ہندوستانی پریس کی دوسری چھپی ہوئی کتاب جو ہم کو ملتی
ہے وہ "اخلاق ہندی" ہے جو ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی اس کے سرورق کی
تصویر اس کتاب میں بھی پیش کی جا رہی ہے بعض محققین نے ہندوستانی پریس
کا سن اجرا ۱۸۱۰ء بتلایا ہے جو یقیناً صحیح نہیں ہے اور یہ غلطی سب نے
مؤلف "اختر شہنشاہی" (۱۸۸۸ء) سے مستعار لی ہے جنھوں نے اس مطبع کا

سن اجرا یکم جنوری ۱۸۰۱ء بتلایا ہے۔ اختر شہنشاہی کے بیان کے مطابق
اس مطبع کے مالک "مولوی اکرام علی" اور مہتمم "مولوی خلیل اللہ" تھے لیکن "اخلاق ہندی"
(۱۸۰۳ء) پر نہ تو مولوی "اکرام علی" کا نام درج ہے اور نہ مولوی خلیل اللہ کا۔
ان دونوں ناموں کے بجائے ہم کو ایک تیسرا نام ملتا ہے۔

"ہندوستانی چھاپے خانے میں چھاپا گیا ہوا مولوی غلام نبی کا"۔
ممکن ہے کہ ۱۸۱۰ء میں ہندوستانی پریس کے مالک "مولوی اکرام علی"
اور اس کے مہتمم مولوی خلیل اللہ ہی رہے ہوں"۔

(صفحہ ۴۳-۴۴۔ ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) مطبوعات
انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ دسمبر ۱۹۵۷ء)

صدیقی صاحب کی اس تحقیق سے یقیناً یہ بات ثابت ہے کہ ہندوستانی پریس
اور فورٹ ولیم کالج پریس دونوں قریب قریب ایک ہی زمانے میں قائم ہوئے اور
ان دونوں چھاپے خانوں میں طباعت کا کام بھی شروع ہو گیا تھا اب رہا یہ سوال
کہ ہندوستانی پریس اکرام علی کی ملکیت تھا یا نہیں؟ اس کے متعلق یہ استدلال کوئی
وزن نہیں رکھتا کہ ان کتابوں پر مالک مطبع کی حیثیت سے "اکرام علی" کا نہیں ہے۔
اسی طرح "اخلاق ہندی" کے سرورق پر مولوی خلیل الدین اشک کا نام نہ ہونا
بھی اس بات کا ثبوت نہیں کہ ہندوستانی پریس کے مالک اکرام علی "نہیں تھے اس
گتھی کو سلجھانے کے لئے ہمیں وہ زمانہ بھی اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے جب ہندوستان
میں غیر سرکاری چھاپے خانوں کا آغاز ہوا تھا۔ ہندوستان کے لئے اس وقت پریس
بالکل ایک انوکھی اور نئی چیز تھی۔ ضابطہ اور قانون بھی اسی حد تک کام کر رہا تھا جہاں تک
کمپنی کی سیاسی ضرورتوں کا تعلق تھا۔ ان حالات میں اگر ان کتابوں پر اکرام علی کا
نام بحیثیت مالک مطبع نہ ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہی نہیں اس کے بعد بھی

اب تک مجھے ہندوستانی پریس کی چھپی ہوئی کوئی ایسی کتاب نہیں ملی جس پر "اکرام علی" کا نام بحیثیت مالک یا پرنٹر کے چھپا ہو۔

مولوی غلام نبی کون بزرگ تھے؟ ان کے بارے میں کسی قسم کی تفصیلات کہیں نہیں ملتیں۔ قیاس یہی ہے کہ ہارڈ اور "بی۔ پریرا" کی طرح یہ بھی اس پریس کے کوئی "عمل کار" ہونگے۔ اگر صدیقی صاحب کے بیان کے مطابق اس بات کو تسلیم کرلیا جائے کہ ہندوستانی پریس سنہ ۱۸۰۱ء یا اس کے کچھ دنوں بعد قائم ہوا تو "اخلاق ہندی" کے سرورق پر بحیثیت مہتمم مطبع مولوی خلیل الدین اشک کا نام نہ ہونے کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ مولوی خلیل الدین اشک کی ترجمہ کی ہوئی "داستان امیر حمزہ" کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔ اور اس کے بعد ان کی دوسری کتاب "واقعات اکبری" سنہ ۱۸۰۹ء میں اختتام کو پہنچی۔ یہ آٹھ دس سال کا زمانہ اشک کی ملازمت کا وہ زمانہ کہا جاسکتا ہے جب انھیں فورٹ ولیم کالج کے فرائض منصبی کی ادائی ہی سے فرصت نہیں تھی۔ "ہندوستانی پریس" کا کام وہ کیا کر سکتے۔ اسی لئے "اخلاق ہندی" کے سرورق پر نہ ان کا نام ہے نہ وہ سنہ ۱۸۰۳ء میں اس پریس کے کاموں سے کوئی خاص دلچسپی لے رہے ہوں گے

ہندوستانی پریس کے ابتدائی زمانے میں زیادہ تر ایسی ہی کتابیں ملتی ہیں جو فورٹ ولیم کالج یا ارباب ایسٹ انڈیا کمپنی نے چھپوائی تھیں اس لئے قیاس یہی کہتا ہے کہ ہندوستانی پریس کا قیام اور اجرا ایسٹ انڈیا کمپنی اور فورٹ ولیم کالج کی ضرورتوں کا رہین منت ہو سکتا ہے ممکن ہے کہ اکرام علی اور کمپنی یا کالج کے مابین کوئی ایسا معاہدہ بھی ہو کہ اس پریس میں کالج اور کمپنی کے کام کو دوسروں کے کام پر ترجیح دی جائے گی۔

اس پریس سے مولوی غلام نبی۔ ہارڈ۔ بی پریرا اور مولوی خلیل الدین اشک

کے انتظامی تعلق سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے پہلی بات تو یہ کہ یہ پریس اردو، انگریزی اور عربی کے شعبوں میں تقسیم تھا جس کی علٰحدہ علٰحدہ ذمہ داریاں مختلف کارکنوں کے سر عائد تھیں یا پھر ایسا ہوتا رہا کہ ان کارکنوں کی علٰحدگی کے بعد علی الترتیب دوسرے لوگوں کو جگہ دی گئی۔ ملازمین اور کارکنوں کی اس جلد جلد تبدیلی سے پریس کی ملکیت کے بارے میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی اگر ان چاروں افراد میں سے کسی ایک کا تعلق پریس کی ملکیت سے ہوتا تو پرنٹر کے ساتھ "اپنے پریس میں طبع کیا" کے الفاظ ضرور لکھے جاتے جو اس زمانے کے خاص دستوری الفاظ تھے

اُردو اخبار کلکتہ

"ہندوستانی پریس" قائم کرنے کے بعد اکرام علی کا دوسرا ادبی کارنامہ کلکتہ سے "اُردو اخبار" کا اجراء تھا۔ اُردو اخبار ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے اکرام علی کی ادارت میں نکلا ـــ اور یہی اُردو کا پہلا اور سب سے پہلا اخبار تھا۔ پروفیسر سید حامد حسن قادری نے "داستان تاریخ اُردو" میں اردو زبان کے اس پہلے اخبار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

مولوی محمد باقر (مولانا محمد حسین آزاد (صاحب آب حیات) کے والد) نے دہلی سے اُردو اخبار جاری کیا۔ اردو زبان کا یہ دوسرا اخبار تھا ـــ پہلا "اردو اخبار" مولوی اکرام علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا۔"

(صفحہ ۷۶ داستان تاریخ اُردو مطبوعہ آگرہ اخبار پریس آگرہ)

اور قادری صاحب کے اس خیال کی تائید مشہور مصنف و صحافی سید رئیس احمد جعفری سیتاپوری کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔

"۱۸۳۵ء میں دہلی میں سنگی مطبع قائم ہوا اور ۱۸۳۶ء میں دہلی سے مولوی محمد باقر (مولانا محمد حسین آزاد کے والد) نے دہلی سے "اُردو اخبار" جاری کیا۔ یہ اردو کا دوسرا اخبار تھا پہلا "اُردو اخبار" مولوی اکرام علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا۔"

(صفحہ ۸۰-۷۹ بہادر شاہ ظفر مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس لاہور)

اب تک اُردو صحافت کی تاریخی چھان بین کرنے والے مصنف "آب حیات" کے اسی دعوے کے اردگرد گھومتے رہے جس سے مولوی محمد باقر کے "اُردو اخبار" (دہلی) کو اولیت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ بعض محققین کا دست جستجو کچھ اور آگے بڑھا انھوں نے فارسی اخبار "جام جہاں نما" (جو تقریباً مئی ۱۸۲۲ء میں جاری ہوا تھا) کے متعلق یہ معلومات فراہم کیں کہ اس کا ایک اردو ضمیمہ بھی شائع ہوتا تھا جسے اردو زبان کے پہلے اخبار کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ راجہ رام موہن رائے کے فارسی اخبار "مراۃ الاخبار" کا بھی اس سلسلہ میں نام لیا گیا ہے جو "جام جہاں نما" سے تقریباً ایک سال پہلے ۱۸۲۱ء میں جاری ہوا تھا۔ مولانا امداد صابری نے "تاریخ صحافت اردو" میں یوسف کاظم عارف (صدر بنگال اردو کانفرنس ۱۹۳۶ء) کے حوالے سے لکھا ہے۔

"اُردو کا پہلا اخبار کلکتہ سے ۱۸۲۱ء میں جاری ہوا جس کا نام "مراۃ الاخبار" تھا اور اس کو راجہ رام موہن رائے نے جاری کیا تھا۔"

(صفحہ ۱۵ تاریخ صحافت اردو)

"مراۃ الاخبار" کے اُردو اخبار ہونے کا ذکر سب سے پہلے ۱۹۱۶ء کی اُردو کانفرنس (منعقدہ قیصر باغ لکھنؤ) میں کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس کے صدر نواب نصیر حسین خیال نے اپنے خطبہ صدارت میں (جو داستان اُردو کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے) راجہ رام موہن رائے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"راجہ رام موہن رائے بانی فرقہ برہمو سماج اٹھارویں صدی کے مجددین میں سے ہیں (عظیم آباد (پٹنہ) میں انھوں نے تعلیم پائی۔ یہ وہی راجہ رام موہن رائے ہیں جو آخری شاہ ہند (بہادر شاہ ظفر) کے ایلچی بن کر اس کی داد رسی کے لئے ولایت گئے۔ اردو میں بھی ان کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ موسیو گارساں دتاسی پیرس میں ان سے ملا تھا وہ کہتا ہے کہ راجہ ہم سے

اُردو میں بھی خط و کتابت کرتے تھے انھوں نے کلکتہ میں ایک اردو اخبار بھی نکالا اور عرصہ تک اس کے ایڈیٹر رہے۔

(صفحہ ۱۸۲-۱۸۳ ماہنامہ "العصر" لکھنؤ بابتہ اپریل ۱۹۱۷ء)

مراۃ الاخبار اور "جام جہاں نما" کے بعد لکھا کر متی رام کے فارسی اخبار "شمس الاخبار" کا نام بھی اسی سلسلہ میں لیا گیا ہے لیکن یہ اخبار اول تو ان دونوں اخبارات کے بعد جاری ہوا دوسرے اس اخبار کے جتنے پرچے میری نظر سے اب تک گذرے ہیں ان میں کہیں سطر بھی اُردو کی نظر نہیں آتی۔

یہ صحیح ہے کہ "اُردو اخبار" (کلکتہ) کا ایک پرچہ بھی فراہم کرنے میں اب تک میں ناکام رہا ہوں لیکن میں اپنے حافظے پر بھروسہ کرتے ہوئے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں "اُردو اخبار" کے کچھ پرچے بچپن میں میری نظر سے گذرے ہیں جو فل سکیپ سائز کے دبیز "سیرام پوری" کاغذ پر ٹائپ حروف میں چھپا ہوا تھا یہ پرچے اکرام علی کے پرپوتے منشی حسن رضا ادیب سیتاپوری (ایڈیٹر ماہنامہ تہذیب سیتاپور) کے پاس تھے جو آخری زمانے میں سخت قسم کے دماغی امراض میں مبتلا ہو گئے تھے اور اسی عالم جنوں میں انھوں نے سیکڑوں کتابیں رسائل اور اخبارات چاک کر کے پھینک دیے انھیں ان کی وفات کے بعد بوروں میں بھر کر دریا میں بہا دیا گیا۔

اکرام علی کے "اردو اخبار" کی نایابی کا سہارا لے کر یہ یقین کر لینا مناسب نہیں ہے کہ اس نام کا کوئی اخبار انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں نکلا ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ چل کر "اُردو اخبار" (کلکتہ) کے شمارے سامنے آجائیں۔ ریسرچ اور تحقیق کا دامن بہت ہی وسیع ہے اور ہم علامہ عبداللہ یوسف علی کے ان الفاظ کو کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

"جو لوگ اُردو اخبارات کی ابتدائی تاریخ کی چھان بین میں مصروف

ہیں وہ اب تک سوائے مولوی محمد باقر کے "اُردو اخبار" کے کسی ایسے اخبار کی تلاش نہ کر سکے جو اس سے قبل جاری ہوا ہو۔ اور صحیح معنوں میں اخبار کہلائے جانے کا مستحق ہو ــــ حالانکہ اس زمانے میں خاص کر کلکتہ وغیرہ میں اسباب کچھ ایسے مہیا تھے جن سے گمان یہ ہوتا ہے کہ "اردو اخبار" سے قبل کا بھی کوئی نہ کوئی اخبار رہنا چاہیے۔"

(بحوالہ معارف اعظم گڑھ جلد ۶۷ [illegible])

نوٹ۔ ابھی جب یہ کاپیاں پریس جا رہی تھیں محترمی ناظر عالم صاحب (سکریٹری اُردو سبھا حیدرآباد دکن) نے مطلع فرمایا کہ اکرام علی کے اس "اردو اخبار" کا ذکر مولانا عبدالرزاق راشد نے اپنے مضمون "تاریخ صحافت پر ایک سرسری نظر" (مطبوعہ ماہنامہ نگار لکھنؤ اگست ۱۹۳۶ء) میں بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ سنہ ۱۸۱۰ء میں یہ اخبار اکرام علی نے کلکتہ سے جاری کیا تھا۔ افسوس کہ "نگار" کا یہ شمارہ میرے سامنے نہیں ہے ورنہ مولانا راشد کی عبارت نقل کر دیتا۔

نادم سیتاپوری

۲۵ اگست [illegible]ء

فورٹ ولیم کالج لائبریری

اکرام علی کی خدمات، اکتوبر ۱۸۱۲ء میں کالج کے شعبۂ تالیف و ترجمہ سے کالج لائبریری میں منتقل کر دی گئیں۔ یہ لائبریری دراصل انڈیا آفس لائبریری کا وہ نقش اول ہے جس کی تدوین ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے بعد ہی شروع ہو گئی تھی اور کمپنی کے آدمی صرف کلکتہ ہی میں نہیں بلکہ دہلی۔ حیدر آباد۔ لکھنؤ اور مرشد آباد وغیرہ میں قلمی کتابیں اور نوادرات تلاش کر رہے تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریکارڈ سے جگہ جگہ اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کی آخری نصف حصے میں کمپنی نے ہندوستانی نوادرات اور کتابوں کی خریداری پر کافی رقم خرچ کی تھی اس کے علاوہ اپنے طور پر کمپنی کے عہدے دار بھی اس کام کو کرتے تھے۔ جن کے قائم کئے ہوئے کتب خانے بعد میں انڈیا آفس لائبریری کے لئے خرید لئے گئے۔

بنگال کے بعد مجموعی حیثیت سے "سلطنت خداداد" میسور کا تمام سرکاری کتب خانہ بھی انگریزوں کے ہاتھ آ گیا جس میں عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کا ایک گراں مایہ ذخیرہ محفوظ تھا۔ ٹیپو سلطان کی یہ شاندار لائبریری "سرنگاپٹم" کی مشہور علمی یونیورسٹی "جمیع الامور" کی ایک جز تھی جس میں دینی علوم اور فقہ وغیرہ کے علاوہ فلسفہ الٰہیات۔ اخلاق۔ نجوم۔ ہیئت۔ آرٹ۔ علم اللسان۔ فرہنگ و لغات۔ قصص و حکایات اور ہندی زبان کی بے شمار قلمی کتابیں محفوظ تھیں۔ "تاریخ سلطنت خداداد" کے مصنف کا بیان ہے:۔

"یہ کتب خانہ سوائے چند کتب کے تمام کا تمام ولایت بھیج دیا گیا چند کتب کلکتہ کو بھی بھیجی گئیں۔"

(صفحہ ۴۹۴ سلطنت خداداد مطبوعہ کوثر پریس بنگلور ۱۹۳۹ء)

۱۷۹۹ء میں "سرنگاپٹم" تسخیر ہوا۔ اس کے بعد تقریباً چھ سات برس تک یہ کتب خانہ ایک کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہا۔ اور حکمراں طبقے کے ذمہ دار افراد میں جو کتاب جسے پسند آئی لے بھاگا۔ چنانچہ "اندسر کیسل" کی لائبریری میں قرآن مجید کا جو نسخہ موجود ہے۔ وہ!

"شہنشاہ اورنگ زیب کا تھا اور سلطان ٹیپو کے خزانے میں دستیاب ہوا یہ قرآن شریف نو ہزار (۹۰۰۰) روپیہ کا قیمتی کہا گیا ہے اور نہایت ہی نفیس خط نسخ میں لکھا ہوا عمدہ نقش و نگار سے مزین ہے۔"

(صفحہ ۴۹۴ سلطنت خداداد)

ہندوستان کا یہ علمی اور ادبی ذخیرہ فورٹ ولیم کالج قائم ہونے کے بعد کمپنی نے وہیں منتقل کر دیا اور پھر وہیں سے یہ تمام قلمی کتابیں رفتہ رفتہ انڈیا آفس لائبریری روانہ ہوتی رہیں۔ کمپنی نے بہت سی کتابیں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کو بھی دیدی تھیں۔

فورٹ ولیم کالج کی لائبریری نے تقریباً ۱۸۰۰ء یا ۱۸۰۱ء تک ہندوستانی مخطوطات کے ایک عظیم کتب خانے کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور اس کی کتابیں ایک طرف انڈیا آفس لائبریری کو برابر منتقل کی جا رہی تھیں تو دوسری طرف نئی کتابیں جو فراہم کی جا رہی تھیں وہ ان کی خانہ پری کرتی جا رہی تھیں۔

فورٹ ولیم کالج لائبریری اپنے قیمتی نوادرات کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں اس وقت اپنے قسم کا منفرد اور واحد کتب خانہ تھا چنانچہ اس ذمہ دارانہ فرض کی ادائی کے لئے سب سے پہلے منشی غلام حیدر کا انتخاب ستمبر ۱۸۰۱ء میں کیا گیا اس کے بعد منشی

موہن پرشاد ٹھاکر اور پھر اکتوبر سنہ ۱۸۱۶ء میں اس جگہ پر اکرام علی کا تقرر کیا گیا۔

ڈاکٹر فیلن اور منشی کریم الدین نے تذکرہ "تاریخ شعرائے اردو" میں اکرام علی کے لائبریری میں پہنچنے کا زمانہ تخمیناً سنہ ۱۸۱۴ء قرار دیا ہے۔

مولوی اکرام علی۔ بھائی تراب علی کا جو کپتان لوکٹ صاحب کی خواہش سے جو کہ فورٹ ولیم کے مدرسے کا سکریٹری تھا وہ کلکتہ میں جا کر رہا اور اس کی سفارش سے درمیان سنہ ۱۸۱۴ء کے محافظ خانہ (لائبریری ہوا۔"

(صفحہ ۱۸۲ "تاریخ شعرائے اردو" مطبوعہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی سنہ ۱۸۴۸ء)

لیکن ٹامس روبک نے اپنی مشہور کتاب (ANUAL COLLEGE OF FORT WILLIMS) مطبوعہ ہندوستانی پریس کلکتہ سنہ ۱۸۱۹ء میں کالج لائبریرین کی جو فہرست دی ہے اس سے اس بیان کی تردید ہوتی ہے اور اکرام علی کے کتب خانہ میں پہنچنے کا زمانہ سنہ ۱۸۱۴ء کے بجائے سنہ ۱۸۱۶ء ثابت ہے۔ ٹامس روبک کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہے کہ سنہ ۱۸۱۹ء میں جب یہ کتاب شائع ہوئی اکرام علی فورٹ ولیم کالج کی لائبریری میں بحیثیت لائبریرین کام کر رہے تھے۔ ٹامس روبک نے لکھا ہے۔

۱۔ منشی غلام حیدر ستمبر سنہ ۱۸۰۱ء میں پہلے لائبریرین مقرر کئے گئے۔

۲۔ ان کے بعد اکتوبر سنہ ۱۸۰۸ء میں منشی موہن پرشاد ٹھاکر کا تقرر منشی غلام حیدر کی جگہ پر کیا گیا۔

۳۔ منشی موہن پرشاد ٹھاکر کے ہٹنے کے بعد اکتوبر سنہ ۱۸۱۶ء میں اکرام علی لائبریرین مقرر کئے گئے۔

کلکتہ کے صدر الصدور

لارڈ ولزلی کے زور دینے پر کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز نے فورٹ ولیم کالج قائم کرنے کی منظوری تو دے دی تھی مگر کمپنی کے کرتا دھرتا ہندوستان میں مشرقی علوم پر ایک پیسہ بھی صرف کرنا اپنے لئے گناہ سمجھتے تھے ان کے نزدیک ایسٹ انڈیا کمپنی صرف ایسے تجارتی اغراض کے لئے قائم کی گئی تھی جس کا مقصد محض ہندوستان کی رگ رگ سے روپیہ کھینچنا تھا؛ کوئی ایسا کام جس سے کسی قسم کا ہندوستانی مفاد وابستہ ہو ان کے نزدیک اس پر روپیہ خرچ کرنا کمپنی کے لئے بدترین قسم کا اسراف بیجا تھا۔

کالج قائم ہوئے ابھی ڈیڑھ سال ہی ہوا ہوگا کہ سنہ ۱۸۰۲ء میں اس پر سخت قسم کے اعتراضات کئے گئے اور بورڈ آف ڈائرکٹرز نے حکم دیا کہ یہ کالج فوراً توڑ دیا جائے۔ لارڈ ولزلی اپنی بات پر جمے ہوئے تھے اور ڈائرکٹرز اپنی ہٹ پر۔ چند سال تک معاملہ یوں ہی چلتا رہا اور جب بورڈ آف ڈائرکٹرز کی پالسی کامیاب نہ ہوئی تو انھوں نے سنہ ۱۸۰۵ء میں انھیں اغراض کو پورا کرنے کے لئے ایک دوسرا کالج ہیلی بری کالج (HAILEY BURY COLLEGE) کے نام سے انگلستان ہی میں قائم کر دیا۔

یہ ایک مستقل کشمکش تھی جو فورٹ ولیم کالج کی زندگی کے اول دن شروع ہو گئی تھی اور برابر بڑھتی جا رہی تھی آئے دن کمپنی کے ڈائرکٹرز کالج کے اخراجات پر اعتراض کیا کرتے تھے اور جان توڑ کوشش میں مصروف تھے کہ کسی طرح یہ کالج جلد سے جلد بند کر دیا جائے یہ کشمکش تقریباً پندرہ سولہ سال سے جاری تھی

اور کلکتہ ریویو (جلد ۱۳ صفحات ۱۴۴ لغایتہ ۱۴۷) کے بیان کے مطابق اس کشمکش کا
یہ نتیجہ نکلا کہ سن ۱۸۰۱ء اور ۱۸۱۹ء کے درمیان فورٹ ولیم کالج مشرقی زبانوں کی صرف
۴۱ کتابیں شائع کر سکا دوسرے مصنفین اور مترجمین کی طرح اکرام علی بھی کالج کے
اس نزاعی دور سے دوچار رہے۔ کچھ لوگ ہٹا دئے گئے کچھ خود سے چلے گئے۔ سید
حیدربخش حیدری ملازمت سے سبک دوش ہو کر (۱۸۲۹ء سے پہلے) بنارس واپس گئے
شیخ حفیظ الدین احمد کے والد کی خدمات پرانی تھیں وہ ۱۸۱۵ء سے قبل دہلی پہنچ گئے
اور وہیں ریذیڈنٹ، دہلی، کے میر منشی ہو گئے۔ اسی طرح میرزا علی لطف بھی نہ جم پائے۔
تذکرہ "گلشن ہند" لکھ کر پیش کر دیا لیکن غالباً مستقل طور پر ملازم نہ ہو سکے حیدرآباد
چلے گئے۔ اکرام علی شعبہ تصنیف و ترجمہ سے نکل کر ۱۸۱۶ء میں فورٹ ولیم کالج کی لائبریری
پہنچ گئے لیکن اس ملازمت کا تعلق بھی براہ راست کالج کے مالی نظام سے تھا جو ہر لحظہ موت کی ہچکیاں
لے رہا تھا۔ کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز نے ۱۸۱۸ء میں اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کا سنگ بنیاد رکھ دیا
اکرام علی کے شفیق بھائی اور استاد محترم ان دنوں کلکتہ ہی میں مقیم تھے انھیں بھی احساس ہوا کہ
کالج کی ملازمت ایک غیر مستقل ذریعہ ہے اس لئے اکرام علی کا مستقبل بنانے کے لئے انھیں
ایسٹ انڈیا کمپنی کی سابقہ خدمات پر واپس بھیج دینا ہی مناسب ہے۔

نامی اس سے پہلے بھی کمپنی میں اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر چکے تھے اپنے ہم سبق اور
ہم وطن دوست علامہ فضل امام خیرآبادی کو دہلی کے عہدہ صدر الصدوری تک لے جانا انھی کا
کام تھا اکرام علی کے لئے بھی انھوں نے کوشش کی اور تخمیناً ۱۸۲۰ء تک ان کی خدمات
ایسٹ انڈیا کمپنی میں منتقل کرا کے انھیں کلکتہ کے عہدہ صدر الصدوری کا چارج دلا دیا۔
صدر الصدور کا عہدہ اس زمانے میں "جج اعلیٰ" کے عہدے کے برابر تھا۔ اکرام علی نے اس
عہدے کے فرائض کئی سال تک نہایت دیانتداری کے ساتھ انجام دئے جس سے عوام
بھی مطمئن رہے اور کمپنی بھی۔

اکرام علی کی زندگی کا سب سے المناک حادثہ

اکرام علی کی زندگی کے بکھرے ہوئے اوراق ایک "مسلسل جد و جہد" کے باوجود
ایسی داستان غم کہے جا سکتے ہیں جس میں قلبی سکون و اطمینان کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔
ایک آسودہ حال خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ننہال اور ددھیال دونوں صاحب ثروت
و نشان۔ چچا کے یہاں شادی ہوئی ان کا شمار بھی اکابر دہلی میں تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ
اس پہلے خاندان نے جب سیتاپور کو اپنا وطن بنایا تو اپنے رہنے سہنے کے لئے جو عمارت تعمیر
کرائی تھیں ان کے دروازے اور چوکھٹ صندل کی لکڑی سے بنائے گئے تھے۔ زمانہ بدلا۔
انقلابات آئے۔ آبادیاں ویران ہوگئیں اور ویرانے آبادیوں کے نقش و نگار میں تبدیل
ہو گئے۔ اس خاندان کی عمارتیں بھی منہدم ہو گئیں یہاں تک کہ ایک زمانہ وہ آیا جب
"ایسٹ انڈیا کمپنی" کے اس محسن کی اولاد کو کمپنی کی قائم مقام حکومت نے ان شہری حقوق
سے بھی محروم کر دیا جن کے وہ صدیوں سے مالک چلے آرہے تھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد
جب انگریزوں نے اودھ کی زمینداریوں کا بندوبست کیا تو یہی محلہ "شیخ سرائے" جسے
اکرام علی کے جد اعلیٰ شیخ محمد رئیس نے آباد کیا تھا اور اس محلے کا چپہ چپہ اسی
خاندان کی ملکیت تھا حاکم بندوبست کے ایک فیصلے کی رو سے ان لوگوں کی
ملکیت بن گیا جو اس خاندان کی چوکھٹ چومنا اپنے لئے باعث عزت و افتخار سمجھتے
اکرام علی کے والد مولوی احسان علی تو "دماغی امراض" میں مبتلا ہو کر اس وقت
ہی کہیں چلے گئے تھے جب اکرام علی کی عمر نو سال سے زیادہ نہ تھی۔ پھر اسکے بعد

برسہا برس ان کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ احسان علی اپنے زمانے کے ایک صاحب کمال طبیب اور کامل فن حکیم تھے۔ سیتاپور سے نکل کر یہ حیدرآباد دکن پہنچے اور وہاں چند ہی سال میں اپنے کمال فن کی بدولت اچھی شہرت حاصل کر لی۔ ان کے دست شفا کی برکت نے انھیں شہرت اور مقبولیت کے علاوہ دولت دنیوی سے بھی مالامال کر دیا۔ مشہور ہے کہ انھوں نے حیدرآباد میں ایک نکاح کر لیا تھا جن سے ایک لڑکا بھی تھا لیکن اس واقعہ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ یہی روایت صحیح ہے کہ انھوں نے وہیں کے کسی لڑکے کو متبنیٰ کر لیا تھا۔

جس زمانے میں اکرام علی کلکتہ کے "صدر الصدور (جج)" مقرر ہوئے تو ان کا ربط ضبط حیدرآباد کے ان افراد سے زیادہ بڑھ گیا جو کلکتہ میں "نظام" کے سیاسی امور کی وکالت کا کام انجام دیتے تھے۔ یہ زمانہ وہی ہے جب ایسٹ انڈیا کمپنی اور نظام کے درمیان متعدد سیاسی معاہدے ہو چکے تھے۔ اور نظام ہندوستان میں کمپنی کے سب سے بڑے حلیف کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔

حیدرآباد اور کلکتہ کے بڑھتے ہوئے تعلقات کے ساتھ ساتھ اکرام علی کی شہرت پر لگا کر حیدرآباد پہنچی۔ بچھڑے ہوئے باپ نے جب اپنے ہونہار۔ لائق اور سعید فرزند کے اس عروج کی کہانیاں سنیں تو شفقت پدری کی دبی ہوئی چنگاری اچانک بھڑک اٹھی۔ وفور مسرت میں انھوں نے بیٹے کو کلکتہ خط لکھا۔ اور غالباً یہ بھی لکھا کہ یا تو میں خود ہی کلکتہ آؤں گا یا پھر تمھیں لکھوں گا کہ تم حیدرآباد چلے آنا۔

اکرام علی کے ذہن و شعور پہ باپ کا تصور ایک موہوم سی یاد بن کر کبھی کبھی جھلملایا کرتا تھا۔ احسان علی کا خط پاتے ہی بیقرار ہو گئے۔ حیدرآباد جانے کی تیاریاں شروع کر دیں مگر کمپنی کے ذمہ دار افراد نے اچانک چھٹی نہیں دی اور ان کی رخصت کا مسئلہ کچھ دنوں کے لئے التوا میں پڑ گیا۔

ادھر احسان علی اپنے اکلوتے بیٹے سے ملنے کے لئے خود بھی بے قرار تھے اور جلد ہی کلکتہ پہنچنا چاہتے تھے مگر جس لڑکے کو انھوں نے متبنیٰ کیا تھا وہ برابر ٹال مٹول کر رہا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ اگر یہ باپ بیٹے آپس میں مل گئے تو احسان علی کی کمائی ہوئی یہ دولت جو حیدرآباد میں ہے میرے قبضے سے نکل جائے گی اور میں اس میں سے کچھ بھی نہ پا سکوں گا۔ چنانچہ یہی سب کچھ سوچ کر اس نے "احسان علی" کو زہر دے دیا۔ اور وہ اپنے اکلوتے بیٹے اکرام علی کی حسرت دید لئے ہوئے حیدرآباد ہی میں راہیٔ بقا ہو گئے۔

اس واقعہ کا مجملاً تذکرہ قاضی سید الیاس حسین جعفری نے اپنے اس مضمون میں کیا ہے جو "اکرام علی" کے حالات زندگی پر پہلا اور سب سے پہلا مضمون ہے۔

آپ (اکرام علی) کے والد جو باہر چلے گئے تھے اور مفقود الخبر تھے ان کو اپنے لائق فرزند کے حالات کی اطلاع ہوئی۔ مگر قبل اس کے آپ (اکرام علی) کے والد نے کسی اور شخص کو متبنیٰ کر لیا تھا اور اس متبنیٰ کو یقین ہو گیا کہ اب ان بچھڑے ہوئے باپ اور لڑکے کے ملنے سے میری قدر نہ ہوگی۔ اس کمبخت نے ان کو (اکرام علی کے والد) کو زہر دے کر مار ڈالا اور سب مال لے کر چل دیا۔ حکیم صاحب (اکرام علی) اپنے والد کے بلانے کے منتظر تھے لیکن نیرنگیٔ زمانہ نے ان کو اس جگر خراش سانحہ کی خبر سنائی۔ حکیم صاحب (اکرام علی) کو اس خبر وحشت اثر سے حد درجہ رنج و ملال ہوا۔ مگر بجز صبر کے کیا چارہ تھا۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

(صفحہ ۴۷-۴۸ ماہنامہ الناظر لکھنؤ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۱۳ء)

اکرام علی کی زندگی کا یہ "ڈرامائی المیہ" دراصل ایک ایسا اندوہناک حادثہ ہے جس کی مثال کم ہی کہیں ملے گی جو بچہ نو سال کی عمر میں باپ سے بچھڑ گیا ہو

اور ساری عمر غریب الوطنی کی زندگی گذر رہی ہو۔ اسے بچھڑے ہوئے باپ کے زندہ ہونے کی خوشخبری اگر شادی مرگ نہ ہو جاتی تو تعجب تھا۔ باپ سے ملنے کی کیسی کیسی آرزوؤں نے اسے تڑپایا ہوگا۔ حیدرآباد پہنچنے کی کیسی کیسی تمناؤں نے اس کی راتوں کی نیند حرام کی ہوگی۔ اور وہ گھڑیاں گن گن کر اپنے بچھڑے ہوئے باپ کے اس خط کا کتنا منتظر رہا ہوگا جس میں اس کی نگاہیں دو لفظ دیکھنے کے لئے بیتاب تھیں ـــــ "کہ تم حیدرآباد چلے آؤ"؟

لیکن ـــــ حیدرآباد سے کوئی خط نہ آیا! ایک "سنانی" آئی کہ تمھارے باپ کے متبنّی نے تمھارے والد کو زہر دے کر ہلاک کر دیا ـــــ!

چند سال کے اندر اکرام علی کی زندگی کا یہ دوسرا المناک حادثہ تھا پہلی موت علامہ تراب علی نامی جیسے شفیق بھائی اور استاد کا سانحہ تھا جن کی آغوش تربیت نے اکرام علی کی زندگی کو ہر پہلو سے مکمل کر دیا تھا۔ کم عمری میں باپ کے مفقود الخبر ہو جانے کے بعد اس دنیا میں اکرام علی نے آنکھ کھول کر اگر کسی کو دیکھا تو وہ نامی ہی تھے جنھیں بیک نظر انھوں نے اپنا شفیق استاد بھی سمجھا اور باپ بھی!

جامع مسجد کی تعمیر

شفیق استاد اور عمر بھر کے بچھڑے ہوئے باپ کی حسرت دید سے بھری ہوئی دائمی جدائی نے اکرام علی میں ایک یاس انگیزی اور قنوطیت پیدا کر دی تھی انھوں نے قطعی طور پر یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ کلکتہ کی صدر الصدوری سے استعفا دے کر اپنے پیر طریقت حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے آستانہ مبارک پر بقیہ زندگی "جاروب کشی" میں بسر کریں گے چنانچہ انھوں نے کمپنی کے ذمہ دار افراد کو جب اپنے ارادہ سے مطلع کیا تو کمپنی کے ہر حلقہ سے اس کے خلاف مخلصانہ اظہار مخالفت کیا گیا اور با اثر لوگوں نے انھیں سمجھانے بجھانے کا ہر ممکن طریقہ استعمال کیا۔ لیکن یہ اپنے مصمم ارادہ سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹے چنانچہ کمپنی کے ارباب حل و عقد اور ان کے درمیان یہ مفاہمت ہوئی کہ اگر وہ اجمیر شریف ہی میں رہنا چاہتے ہیں تو اس شرط پر وہاں رہ سکتے ہیں کہ اجمیر شریف کے "مفتی اعظم" کا عہدہ انھیں قبول کرنا ہوگا۔ اس وقت تک اجمیر میں کمپنی کی طرف سے کوئی "دار الافتا" قائم نہیں تھا۔ اکرام علی کی وجہ سے کمپنی نے یہاں ایک نیا "دار الافتا" قائم کیا اور اکرام علی کا تقرر بحیثیت "مفتی اعظم" اجمیر کر دیا گیا۔

قاضی سید الیاس حسینی نے لکھا ہے۔

"بعد چندے سرکار انگلشیہ کو اپنی طرف سے (اجمیر میں) "دار الافتا" قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ آپ (اکرام علی) کا انتخاب بحیثیت مفتی اجمیر شریف تین سو روپیہ ماہوار پر ہوا اور آپ نے اس نازک کام اور اہم

کام کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔

(صفحہ ۴۸، ۴۹ ماہنامہ الناظر لکھنؤ نومبر ۱۹۱۳ء)

کلکتہ کی صدر الصدوری کے عہدے سے دستبردار ہونے کے بعد اکرام علی اپنے وطن سیتاپور پہنچے اور اپنے مکان سے ملی ہوئی اس قدیم مسجد کو از سر نو تعمیر کرایا جو ان کے بزرگوں نے سیتاپور میں آباد ہوتے وقت بنوائی تھی — اور یہ مسجد سیتاپور کی پہلی مسجد تھی۔

میں نے اپنے پچھلے مضمون (علامہ سیتاپوری) میں لکھا تھا کہ یہ مسجد اکرام علی کی تعمیر کردہ ہے لیکن اس وقت تک میری معلومات میری کوئی ایسی رہنمائی و رہبری نہ کر سکی تھیں جس سے یہ ثابت ہوتا کہ یہ نئی جامع مسجد جسے اکرام علی نے تعمیر کیا تھا اس قدیم مسجد کی بنیادوں پر تعمیر کی گئی جس کا وجود ان کے پردادا بندگی نصر اللہ عرف شیخ لاحول کے زمانے میں پایا جاتا تھا۔

اسی مسجد کے جانب شرق ایک چھوٹا سا گوشہ محل بنا ہوا ہے جس میں اکرام علی کے بزرگوں کی تین قبریں بنی ہوئی ہیں جن پر ہر سال عرس ہوتا ہے۔ ان قبروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قبریں اکرام علی کے مورث اعلیٰ شیخ محمد رئیس اور ان کے صاحبزادے (شیخ حبیب اللہ) اور پوتے "شیخ بیکی" کی ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ بیکی نے سیتاپور سے بغداد شریف تک پیادہ پا سفر کر کے "حضرت غوث الاعظم" کے آستانہ مبارک پر شرف قدمبوسی حاصل کیا تھا اور واپسی پر وہاں سے کچھ ایسے تبرکات بھی اپنے ساتھ لائے تھے جو اسی گوشہ محل میں مدفون ہیں۔"

اس مسجد کے متعلق میری نظر سے ایک شاہی فرمان گذرا ہے جو ۲۴ جمادی الثانی سنہ ۲ جلوس والا، کو مغل دربار سے جاری کیا گیا تھا جس میں اکرام علی کے پردادا نصر اللہ عرف شیخ لاحول کو دو سو بیگھہ آراضی موضع سلیم پور (متصل سیتاپور) میں بطور جاگیر دی گئی تھی۔ اس شاہی فرمان سے ثابت ہے کہ یہ جاگیر درگاہ بندگی شیخ حبیب اللہ (ابن شیخ محمد رئیس) اور ان کی بنائی ہوئی مسجد کے سلسلہ میں عطا کی گئی تھی۔

سیتاپور پہنچ کر اکرام علی نے اپنے بزرگوں کی بنائی ہوئی اس مسجد کو وسعت دے کر "جامع مسجد" کی شکل دینے کا کام شروع کرا دیا۔ لیکن وہ خود زیادہ دنوں تک سیتاپور نہ ٹھہر سکے کیونکہ انھیں جلد ہی اجمیر پہنچ کر مفتی اعظم کے عہدے کا چارج لینا تھا۔ مسجد کی تعمیر کا کام اپنے اکلوتے صاحبزادے حاجی اکبر علی کے سپرد کر کے وہ اجمیر روانہ ہو گئے۔

یہ مسجد ۱۲۵۲ھ میں بن کر تیار ہوئی۔ مسجد کے صدر دروازہ پر جو کتبہ لگا ہے اس پر یہ عبارت درج ہے۔

"تاریخ تعمیر مسجد ۱۲۵۲ھ بانی مسجد مولوی شیخ اکرام علی فاروقی۔ فریدی۔ حنفی۔ قادری۔ رئیس سیتاپور محلہ شیخ سرائے مفتی اجمیر شریف"

اکرام علی کی اسی مسجد سے متعلق ایک حیرت انگیز واقعہ آج تک میرے ذہن و شعور پر مرتسم ہے جو متعدد معتبر بزرگوں کی زبانی بارہا سن چکا ہوں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جس دن اور جس وقت اکرام علی کا انتقال اجمیر میں ہوا اس مسجد کا ایک مینار عین اسی وقت خود بخود زمین پر آ رہا۔ عقیدے کی بات کہئے یا توہم کہئے اس واقعہ سے ان کے خاندان بھر میں ایک فکر و تشویش سی پیدا ہو گئی چند روز کے بعد اجمیر سے خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ جس وقت مسجد کا یہ "مینار" بلا کسی حادثے کے گر کر شہید ہوا تھا ٹھیک اسی وقت اجمیر میں اکرام علی نے زندگی کی آخری سانس لے کر اس دار فنا کو خیر باد کہا تھا۔

یہ واقعہ جس کی سچائی اور صداقت پر میں کوئی شبہ نہیں کر سکتا اپنی نوعیت کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے جس سے یہ ثابت ہے کہ بعض ذی مرتبہ انسانوں کی موت صرف انسانوں ہی کو نہیں بلکہ موجودات عالم کی ان بہت سی چیزوں کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہتیں جن سے مرنے والے کو کوئی روحی تعلق ہوتا ہے۔

مسجد کے اس مینار کو دوبارہ اکرام علی کے صاحبزادے حاجی اکبر علی نے از سر نو تعمیر کرا دیا تھا جو اس حیرت انگیز واقعہ کی شہادت دینے کے لئے آج بھی موجود ہے۔

زندگی کے آخری ایام اور وفات

زندگی کے چند مسلسل حادثات نے اکرام علی کا دل دُنیا کی طرف سے کچھ ایسا پھیر دیا تھا کہ اجمیر جانے کے بعد وہ پھر کبھی اپنے وطن سیتاپور واپس نہیں آئے۔ اجمیر میں انکے مشاغل کیا تھے اس کے متعلق بھی اس سے زیادہ کچھ کہنا دشوار ہے کہ "دارالقضا" کے فرائض کی ادائی کے بعد انھیں جو وقت ملتا تھا وہ زیادہ تر حضرت خواجہ کے آستانہ مبارک پر "یادالٰہی" میں بسر کرتے تھے۔ اجمیر میں رہ کر انھوں نے اپنی حیثیت کبھی ایک "جاروب کش" سے زیادہ نہیں سمجھی حالانکہ سارا شہر "مفتی اعظم" ہونے کی وجہ سے ان کی عزت واحترام کرتا تھا۔

اکرام علی اپنے باپ کی طرح ایک ماہر فن طبیب بھی تھے اور خدا نے ان کے ہاتھ میں ایسی شفا دی تھی کہ ہزارہا مریض ان کے چٹکلوں سے صحت یاب ہوتے رہتے تھے لیکن انھوں نے حکمت کو کبھی کسب معاش اور حصول زر کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اجمیر کے زمانۂ قیام میں بھی ان کا مطب ہر خاص وعام کی بلامعاوضہ خدمت کے لئے وقف تھا۔

قاضی الیاس حسین کا بیان ہے۔

"حکیم صاحب (اکرام علی) کو اپنی خدمت مفوضہ (دارالقضا) کے انجام دینے کے بعد جو وقت ملتا وہ مریضوں کی دیکھ بھال اور ہدایات طبی میں صرف کرتے اور آپکے دست شفا اور تشخیص کامل سے بیماروں کو صحت حاصل ہوتی۔"

(ماہنامہ الناظر لکھنؤ ماہ نومبر سنہ ۱۹۱۳ء)

اکرام علی نے سنہ ۱۲۵۲ھ میں بمقام اجمیر شریف انتقال کیا اور وہیں حدود درگاہ حضرت خواجہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

"حکیم صاحب (اکرام علی) نے سنہ ۱۲۵۲ھ میں بمقام اجمیر انتقال کیا آپ کا مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ اور ہر سال عرس ہوتا ہے" (ماہنامہ الناظر لکھنؤ ماہ نومبر سنہ ۱۹۱۳ء)

"اولاد اور اخلاف"

اکرام علی بن حکیم احسان علی

- حاجی اکبر علی
  - منشی علی رضا
    - دختر
    - دختر
    - منشی حسن رضا ادیب
      - عابد رضا وکیل
      - اصغر رضا
  - منشی علی محمد نظم
    - دختر — زوجہ پروفیسر آغا اشہر لکھنوی
    - آفتاب حسین
    - اختر حسین مرحوم — لاولد
    - محمد نظیر مرحوم — دختر
- سکینہ بیگم زوجہ مہدی حسن
  - مدنی بیگم

"اکرام علی" تمام عمر پردیس میں رہنے کے باوجود زندگی کے آخری لمحات تک اپنے وطن سیتاپور سے منسلک رہے جتنے دنوں کلکتہ میں قیام رہا اس وقت بھی اور اس کے بعد زندگی کے بقیہ ایام جو اجمیر شریف میں گذرے۔ اس وقت بھی انکے اعقاب ومتعلقین سیتاپور ہی میں رہے چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اکرام علی کے صاحبزادے

حاجی اکبر علی اپنے باپ کی تجہیز و تکفین میں شریک نہیں ہو سکے تھے کیونکہ اکرام علی کا انتقال اجمیر شریف میں ہوا تھا۔ اور ان کی خبر وفات ہفتوں کے بعد سیتاپور پہنچی تھی۔

اکرام علی کی تمام اولاد اب بھی سیتاپور میں اپنے آبائی مکانات میں سکونت گزیں ہے اور اب بھی یہ خاندان سیتاپور کے ممتاز خاندانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس خاندان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی نسلی غیرت اور بے پناہ شعوری خودداری تھا جس نے دنیوی حیثیت سے اس کی شایان شان ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ اکرام علی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی وجہ سے انگریزی دور حکومت کے ایک ممتاز فرد رہ چکے تھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد مسٹر ٹامسن (جن کی شان میں غالب نے قصیدہ کہا ہے۔ اور سیتاپور کا مشہور بازار ٹامسن گنج جن کے نام سے موسوم ہے) کمشنر ہو کر سیتاپور پہنچے۔ اکرام علی کے صاحبزادے حاجی اکبر علی کو بلایا اور ان کے باپ کی خدمات کے صلے میں انھیں اعزاز و اکرام پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی جسے حاجی اکبر علی نے حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حاجی صاحب کے دل و دماغ پر اودھ کی تباہی کا اتنا گہرا اثر پڑا تھا کہ انگریزوں کی ملازمت تو درکنار انھیں ان کی حکومت میں رہنا گوارا نہ تھا چنانچہ اسی زمانے میں حج کے لئے چلے گئے اور تقریباً آٹھ دس سال تک مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک میں پھرتے رہے۔ ۱۸۹۸ء میں ہندوستان واپس آئے لیکن انگریزی مقبوضات میں نہیں بلکہ بھوپال پہنچ کر وہیں ملازمت کر لی۔ نواب شاہجہاں بیگم کے دور حکومت میں عرصہ تک "جیلر" کے عہدے پر فائز رہے۔

حاجی صاحب کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس عرصے میں ان کی آبائی جائداد بری طرح تباہ ہو گئی۔ آخر زمانے میں وطن واپس گئے اور وہیں ۶ فروری ۱۹۰۲ء کو راہی دار بقا ہوئے۔

حاجی صاحب کا تعمیر کردہ ایک امام باڑہ اور ایک کربلا متصل سٹی اسٹیشن سیتاپور سا آج بھی ان کی یادگار کے طور پر موجود ہے۔

منشی علی رضا۔ رضا

علی رضا نام۔ رضا تخلص۔ حاجی اکبر علی کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے ۱۲۵۵ھ میں بمقام سیتاپور محلہ تشنیراے پیدا ہوئے دولت و امارت میں آنکھ کھولی تھی جوان ہوتے ہوتے اس پر زوال آنا شروع ہو گیا۔ راجہ کاظم حسین خاں تعلقدار "بھٹواموَ" کے یہاں ملازمت کر لی۔ چند سال کے بعد امیر الدولہ سر راجہ امیر حسن خاں (تعلقدار محمود آباد) نے بلا لیا۔ یہاں ایک عرصہ تک تحصیلداری کے عہدے پر فائز رہے۔

اس زمانے میں سیتاپور شعر و ادب کی سرگرمیوں کا گہوارہ تھا۔ سلطان الشعراء میر اقبال حسین نجم۔ فردوسی ہند میر محمد افضل فارغ (تلمیذ میر انیس) حکیم محمد شریف طالب۔ ناظر حسین ناظر اور کاظم حسین وفا ان میں سے ہر فرد اپنی مثال آپ تھا اور اس ادبی قافلے کے میر کارواں استاد تجمل مرحوم تھے جنھیں محمد عباس سلیم (تلمیذ رشید خواجہ آتش) سے شرف تلمذ حاصل رضا نے بھی فن شعر استاد تجمل کی بارگاہ فن میں حاصل کیا۔ مکمل دیوان اور کئی مرثیے یادگار چھوڑے مگر اب بہت تلاش کرنے پر بھی ایک مکمل غزل کہیں نہیں ملتی۔

تذکرہ خمخانہ جاوید (صفحہ ۴۹۹) میں صرف ایک شعر ملتا ہے۔

لے اڑی طرز فغاں بلبل نالاں ہم سے
گل نے سیکھی روش چاک گریباں ہم سے

تذکرہ "یادگار ضیغم" (مطبوعہ مطبع قادری حیدرآباد دکن ۱۳۲۰ھ) میں مختصر حالات بھی درج کئے گئے ہیں۔

رضا۔ تخلص۔ علی رضا نام ولد حاجی اکبر علی۔ سیتاپور ملک اودھ کے باشندے ہیں۔ راجہ کاظم حسین خاں تعلقدار بھٹوامؤ (ضلع بارہ بنکی) کے یہاں ملازم ہیں۔ جو کام کچہری کا ضلع سیتاپور میں ہوتا ہے بطور کارندہ گری کرتے ہیں۔

ان کے والد کی موروثی جائداد تلف ہوگئی اب بھی کچھ قلیل باقی ہے۔ علم بقدر ضرورت ہے سید تجمل حسین تجمل کے شاگرد ہیں۔ عمر قریب چالیس برس کے ہے یہ کلام ہے۔

میری کیا طاقت جو کھینچوں دل سے پیکاں تیر کا
کھینچنا مشکل ہے مجھ کو آہ بے تاثیر کا

معرکہ میں عشق کے ہرگز نہ خوف آیا مجھے
آنکھ دکھلاتا رہا جوہر تری شمشیر کا

فرقتِ دلبر میں رہتی ہے کھٹک سی رات دن
ہے دلِ درد آشنا پہلو میں پیکاں تیر کا

یاد چشمِ یار جب دیوانگی میں ہم نے کی
دیدۂ آہو ہوا حلقہ مری زنجیر کا

خط شوقیہ لکھا تھا یار کو ہم نے رضا
واں رقیبوں نے پڑھا۔ یہ بھی لکھا تقدیر کا

سرو قد نے تری صورت جو ذری دکھلائی
آنکھ نے شکل عقیق شجری دکھلائی

(صفحہ ۴۱۳ ، ۴۱۴ تذکرہ یادگار ضیغم)

اگست ۱۹۱۶ء (مطابق ۱۳۳۴ھ) میں بمقام سیتاپور وفات پائی۔ اپنے باپ کی قائم کی ہوئی کربلا میں سپرد خاک کیے گئے۔ میر ظہور الحسن فروغ نے اس مصرعہ سے تاریخ وفات نکالی۔

"چمن نظم ہوگیا برباد"
۱۳۳۴ھ

منشی علی محمد "نظم"

علی محمد نام۔ نظم تخلص۔ حاجی اکبر علی کے چھوٹے صاحبزادے اور رضا کے چھوٹے بھائی تھے۔ خوشگو شاعر باکمال انشاپرداز۔ اور عالم و فاضل۔ ابتدائی دور حیات نہایت شاندار بسر کیا جب کچھ جائداد تلف ہوگئی ریاست محمود آباد میں ملازم ہوگئے۔ مگر زیادہ دنوں تک یہ بھی نہ نبھی۔ مزاج میں قناعت کوٹ کوٹ کر بھری تھی گوشہ نشین ہوگئے۔ سیتاپور میں علوم مشرقی کی جتنی نایاب لائبریری اس گھر میں تھی اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی لائبریری میں کئی کئی سو سال کے نوادرات و مخطوطات محفوظ تھے۔ میں نے اپنے بچپن میں اس لائبریری کو دیکھا ہے آٹھ دس ہزار سے کم کتابیں نہ ہوں گی۔

کثرت مطالعہ سے آخر زمانے میں بصارت جاتی رہی تھی پھر بھی حافظہ اتنا قوی تھا کہ اشارے سے بتادیا کرتے تھے کہ فلاں الماری میں فلاں نمبر پر یہ کتاب رکھی ہوئی ہے۔ اور اس کتاب کے فلاں صفحے پر اس موضوع کا ذکر آیا ہے۔ ہزارہا فارسی اور اردو اشعار زبانی یاد تھے۔ سیتاپور میں جو ادیب یا شاعر آتا وہ ان کی قدم بوسی کے لئے ضرور حاضر ہوتا۔ اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی کو میں نے غالباً ۲۵ء یا ۲۶ء میں پہلی بار نظم ہی کے آستانہ ادب پر دیکھا تھا۔

ان کی غیر مطبوعہ تصانیف میں نثر کے علاوہ کئی مرثئے۔ متعدد مثنویاں اور تقریباً پانچ ہزار رباعیوں کا اتھاہ ذخیرہ آج بھی موجود ہے جو غالباً اپنے لمحات فنا سے پہلے ہی فنا ہوجانے کا منتظر ہے۔

۷ر جون ۱۹۲۹ء کو سیتاپور میں انتقال کیا۔ حاجی صاحب کے امام باڑے میں دفن کیے گئے مجھے اس وقت ایک ہی شعر یاد آرہا ہے۔

نئی بے رحمیاں دیکھو مرے ترک ستمگر کی — ارادہ قتل کا ہے کند کی ہے باڑھ خنجر کی

منشی حسن رضا ادیبؔ

حسن رضا نام۔ ادیبؔ تخلص۔ منشی علی رضا۔ رضا کے اکلوتے فرزند۔ تعلیم و تربیت باپ اور چچا کے دامنِ علم میں حاصل کی۔ علمی اور ادبی شعور خاندانی ورثہ تھا۔ شعر و سخن سے تو بس اسی حد تک دلچسپی تھی کہ ایک اُستادِ فن باپ کے ہونہار بیٹے تھے فطری ذوق و لگاؤ نثر اور صرف نثر تھا۔ اکرام علی کے خاندان کے یہ آخری چشم و چراغ تھے اگر عمر وفا کرتی اور زمانہ ساتھ دیتا تو یہ اپنے پردادا اکرام علی کی صحیح معنوں میں یادگار ثابت ہوتے۔ صحافتی صلاحیتیں اتنی بلند تھیں کہ اس صدی کے اوائل میں ان کا شمار چوٹی کے لکھنے والوں میں کیا جاتا تھا۔ ادبی رسائل کے علاوہ اس زمانے کے ممتاز اخبارات ان کے شگفتہ طرزِ نگارش کے لئے نظر براہ رہتے تھے۔ مرحوم "اودھ پنچ" کے مخصوص لکھنے والوں میں ان کا نام آج تک عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اگرچہ ان کی فطری متانت "طنز و مزاح" سے ہمیشہ کتراتی رہی۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں جب اودھ کی صحافتی دُنیا میں لسان الملک ریاض خیرآبادی "تار برقی" اور "ریاض الاخبار" کی جلوہ سامانیوں کے ساتھ چمکے تھے قریب قریب اس زمانے میں "ادیب" نے سیتاپور سے ایک ماہنامہ "تہذیب" کے نام سے نکالا تھا۔ "تہذیب" کا پہلا پرچہ جون ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا تھا جس میں اکثر و بیشتر مضامین خود "ادیب" کے لکھے ہوئے تھے۔ افسوس کہ یہ ماہنامہ چند شماروں سے زیادہ عمر نہ پا سکا۔

ادیب کا دوسرا کارنامہ "اخوان الصفا" کا سیتاپور ایڈیشن ہے جو انھوں نے "اخوان الصفا" کمیاب محسوس کر کے ۱۹۱۶ء میں نکالا تھا۔

میں نے اپنے بچپن میں ادیب کو دیکھا ہے۔ اور ان کا وہ عالمِ جنون بھی۔ جس میں سیکڑوں کتابیں اور نوادرات انھوں نے چاک کر کے پھینک دیے تھے۔ ان کی نثری تصانیف کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ صرف ساٹھ بند کا ایک مرثیہ موجود ہے جس کا مطلع ہے

"میداں میں جب حسینؑ کے یاور ہوئے شہید"

۱۹۱۷ء میں راہیِ خلد بریں ہوئے اپنے دادا کی کربلا میں آسودہ خواب ہیں۔

"اخوان الصفاء" کا تاریخی پس منظر

چوتھی صدی ہجری کی یہ نیم الہامی کتب اس دور کے مشرقی علوم کا ایک ایسا رازِ سربستہ ہیں جس کے مصنف کی تلاش و جستجو میں آج ایک ہزار سال سے ماہرینِ علم و فن سرگرداں ہیں اور ہزار برس گزرنے کے باوجود اب تک قطعی طور پر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکا کہ یہ رسائل کسی ایک شخص کی تصنیف ہیں یا ان متعدد افرادِ علم کی بصیرت افروزی کا نتیجہ جنھیں "اخوان الصفاء" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

"اخوان الصفاء" جو مختلف علوم و فنون پر مشتمل اکیاون ۵۱ یا ترپن ۵۳ رسالوں کی ایک "انسائیکلوپیڈیا" ہے اس کے تمام رسائل علم و ادب کے مختلف موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ادب۔ اخلاق۔ علم الکلام۔ فلسفہ۔ نجوم۔ طب۔ علم ہیئت۔ علم ہندسہ۔ موسیقی۔ سیاست۔ مدنیت۔ علم الافلاک۔ الٰہیات۔ غرضیکہ اس زمانے کے مروجہ علوم و فنون میں کوئی ایسا علم و فن نہیں ہے جس پر ان رسائل میں عالمانہ بحث نہ کی گئی ہو۔ اور علم الاخلاق کا یہ رسالہ جو انسان و بہائم کے مناظرے پر مشتمل ہے انھیں رسائل میں سے ایک رسالہ ہے جس کا اُردو ترجمہ اکرام علی نے کیا تھا۔ یہ رسالہ "اخوان الصفاء" کے تمام رسائل میں سب سے زیادہ مقبول تسلیم کیا گیا ہے اور اسی مقبولیت کی وجہ سے یہ رسالہ اپنی منفرد حیثیت سے "اخوان الصفاء" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

گذشتہ کئی سو سال سے "اخوان الصفاء" کے علمی مسائل کا جو جائزہ لیا جا رہا ہے اس نے ایشیا۔ یورپ اور امریکہ میں اسے ایک خاص موضوع کا درجہ دے دیا ہے۔ عربی

اور فارسی ہی میں نہیں انگریزی۔ جرمنی اور فرنچ زبانوں میں "اخوان الصفاء" کی تشریحات پر اب تک سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اب تک یہ تحقیقی سرگرمیاں جاری ہیں کہ ان رسائل کا اصل مصنف کون تھا۔؟ چنانچہ اس فلسفہ کی ایک اہم کتاب "الرسائل المسمات بالاصل الصفاء فی تحقیق رسم مصنف رسائل اخوان الصفاء" (مطبوعہ بمبئی ۱۹۲۹ء) بھی ہے جس میں اس موضوع پر کافی تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مستشرقین یورپ نے بھی اس موضوع کو بنائے بحث بنا کر درجنوں کتابیں لکھی ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسائل "اخوان الصفاء" کے مصنف کا مسئلہ ایک ایسی الجھی ہوئی بحث ہے جس پر آج تک کوئی فیصلہ کن رائے قائم نہیں کی جا سکی۔

عام طور پر ان رسائل کے مصنفین کے متعلق یہی مشہور ہے کہ یہ بصرے کی اس علمی انجمن سے تعلق رکھتے تھے جس کا نام ہی "اخوان الصفاء" تھا۔ مگر جدید تحقیق کی روشنی میں اس قسم کے تمام نظریات ایک حکایت و افسانے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اب سے دو سو سال ادھر تک ہم نظریہ کے گرد و پیش سوچ سکتے تھے مگر آج "جدید تحقیق" کے دور میں ہمیں نئے نظریات کی بنائی ہوئی نئی راہوں پر چلنا ہوگا۔

"اخوان الصفاء" کے اس قدیم افسانوی پس منظر کو اساس بنا کر مولانا نیاز فتحپوری (ایڈیٹر نگار لکھنؤ) نے لکھا ہے۔

"اخوان الصفاء" چوتھی صدی ہجری کے آخری نصف حصہ میں ایک مذہبی جماعت اہل تشیع کی پائی جاتی تھی جنہیں ان کے عقائد کے لحاظ سے اسمٰعیلی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ جماعت جس کا مرکز بصرہ تھا اپنے تئیں "اخوان الصفاء" کہتی تھی کیونکہ اس کا مقصد تصفیہ روح تھا۔ ان کے سیاسی تحریکات و تدابیر کا حال تو کچھ معلوم نہیں البتہ ان کے علمی کارنامے ضرور ہم تک پہنچے ہیں (چنانچہ ان کے ۵۲ مضامین کا مجموعہ جو بمبئی میں شائع ہوا تھا بہت مشہور چیز ہے) ان رسائل میں زیادہ تر

وہ فلسفیانہ مباحث ہیں جو فیثاغورس۔ سقراط اور افلاطون کے اقوال سے مستنبط ہیں خاص اصول ان کا یہ تھا کہ دنیا کا وجود خدا سے بالکل اسی طرح تعلق رکھتا ہے جس طرح لفظ کا بولنے والے سے۔ اور روح کو پھر خدا کے پاس واپس جانا ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت انھوں نے مختلف رسائل شائع کئے تھے۔ اس جماعت (اخوان الصفاء) میں خاص خاص لوگ یہ تھے۔ (۱) ابو سفیان محمد بن مشیر البستی المقدسی (۲) ابو الحسن علی بن ہارون الزنجانی (۳) محمد بن نہر جوری العوفی (۴) زید بن رفاع۔

(ماہنامہ نگار لکھنؤ سالنامہ ۱۹۵۸ء معلومات نمبر)

لیکن اسمٰعیلی فرقے کی تاریخوں نے اس کی تاریخی نوعیت کو اس طرح پر تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ رسائل (امام) حضرت عبداللہ وفی احمد کی الہامی تصنیف ہیں جو اسمٰعیلی فرقے کے پہلے امام حضرت اسمٰعیل (بن حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام) کے صاحبزادے تھے حضرت عبداللہ وفی احمد کا زمانہ ۱۹۷ھ سے لے کر ۲۱۲ھ تک بیان کیا جاتا ہے۔

اسمٰعیلی فرقے کے مشہور مورخ "علی محمد چنارا" لکھتے ہیں۔

"خلیفہ مامون (عباسی) نے مذہب میں جن اصلاحی امور کا ارادہ کیا تھا ان سے درحقیقت اسلام کے اصول میں رخنہ پڑنے کا اندیشہ تھا اس وقت اسلامی دنیا میں مذہب کی طرف سے جو بے رخی پیدا ہو گئی تھی اس کے تدارک کے لئے معقول تدابیر کی اشد ضرورت تھی مذہب اور فلسفہ میں کیا فرق ہے؟ اس بات کی تمیز کرنے کے لئے عوام الناس نہایت بیتاب تھے۔ جس وقت اسلامی دنیا میں یہ تلاطم برپا تھا اس وقت حضرت امام وفی احمد کے دعات اسلامی دنیا میں دعوت کر رہے تھے انھوں نے اس بات کو سنا۔ اور حضرت امام سے جو اس زمانے میں باب علوم

تھے درخواست کی کہ ان مسائل کی وجہ سے اسلامی دُنیا میں ہل چل مچی ہوئی ہے اور لوگ حقیقت سے واقف ہونا چاہتے ہیں اس لئے آپ ان مسائل متنازعہ فیہ کو حل کر دیں۔

حضرت امام نے اس کو بخوشی تمام منظور کیا اور آپ خود اس کو انجام دینے کے لئے مستعد ہوئے اور اسلام و فلسفہ پر ایک عظیم الشان کتاب تصنیف فرمائی جو باون ۵۲ رسالوں پر مشتمل ہے اور ہر ایک رسالے میں مختلف علوم سے بحث کی گئی ہے اور مختلف علوم کے اکیاون ۵۱ مختلف رسالے ہیں اور آخری باونویں ۵۲ رسالے میں ان تمام علوم کا لب لباب ہے اس آخری رسالے کا نام "الجامعیہ" ہے یہ تمام کتاب کلیتاً "اخوان الصفاء" کے نام سے مشہور ہے اور اپنی خوبی کے باعث اسلامی دُنیا کے علاوہ دوسرے تمام مہذب مشرقی اور مغربی ممالک میں بھی مشہور ہے سلطنت کے سیاسی امور کے سبب سے آپ نے اپنا نام مخفی کر دیا اور "ہمایوں" کے نام سے اس کتاب کو شائع کیا اس نام میں ایک خوبی اور باریکی یہ ہے کہ ابجد کے حساب سے "ہمایوں" کے اعداد اور حضرت امام کے نام کے اعداد برابر ہیں۔ علم الٰہیات۔ علم حکمت۔ ہیئت۔ ہندسہ وغیرہ تمام علوم سے "اخوان الصفاء" میں بالتفصیل بحث کی گئی ہے الغرض دنیا کا کوئی علم نہیں ہے جس کا اس میں ذکر نہ ہو۔ اس کتاب کے تیار ہوتے ہی ایک ایک نسخہ خلیفہ کے پایۂ تخت بغداد کی ہر مسجد کے محراب میں ایک ہی دن میں رات کے وقت رکھ دیا گیا علی الصباح جب پیش اماموں کی اور نمازیوں کی نظر اس رسالے پر پڑی تو باہم چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور آخر یہ تمام رسالے "خلیفہ مامون" کے پاس پہنچائے گئے انکو دیکھتے ہی خلیفہ کے ہوش و حواس گم ہو گئے اور کچھ نہ سمجھ سکا اس لئے اس نے علماء کو طلب کیا مگر ان کی عقل بھی گم ہو گئی خلیفہ نے کہا کہ یہ کتاب کسی معمولی عالم کی

تصنیف نہیں ہے۔ میرے خیال میں حضرت امام کے سوا دوسرے کی ہو ہی نہیں سکتی اب اس کو یقین کامل ہو گیا کہ "بنو فاطمہ" کے نور چشم اور وارث پاک حضرت امام کی ذات اس دُنیا میں موجود ہے اور سلطنت کے تمام اصول کی اصلاح کے لئے ان کو ضرور تلاش کرنا چاہیے۔

"اخوان الصفاء" میں لکھا ہے کہ فلسفہ اور مذہب آپس میں مختلف نہیں ہیں بلکہ دونوں آپس میں ایک دوسرے سے نسبت رکھتے ہیں اس مسئلہ کے متعلق اس زمانے میں اختلاف تھا اس کو دور کرنے کے لئے اس کتاب نے زبردست اثر دکھایا جس سے خلیفہ کو اپنی مطلب برآری کا موقع مل گیا اور حضرت امام کو ڈھونڈھنے کے لئے خلیفہ کے خیال کو مزید تقویت پہنچی۔"

(صفحہ ۲۴۶ تا ۲۴۸ "نور مبین حبل اللہ المتین" مطبوعہ سندھی پرنٹنگ پریس بمبئی ۹ء)

کچھ اسی سے ملتا جلتا خیال علامہ داعی "ادریس" (وفات ۸۷۲ھ) مصنف "عیون الاخبار" کا ہے۔

"یہ رسائل ائمہ مستورین کے دوسرے امام احمد بن عبداللہ کی تصنیف ہیں یہ امام خلیفہ مامون (متوفی ۲۱۸ھ) کے ہمعصر تھے انھوں نے جب دیکھا کہ فلسفے کے شائع ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے عقیدوں میں لغزش پیدا ہو گئی ہے تو انھوں نے ایسے رسائل شائع کئے ہیں جن میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ شریعت اور فلسفہ آپس میں متفق ہیں۔"

(صفحہ ۵۱۸ تاریخ فاطمین مصر مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

لیکن وزیر جمال الدین بن حسن القفطی المصری (وفات ۶۴۶ھ) جو ساتویں صدی ہجری کا ایک مشہور عالم اور محقق گذرا ہے اپنی کتاب "تراجم الحکماء" میں "ابو حیان

توحیدی" کے حوالے سے ایک دوسری بات کہتا ہے۔ "قفطی المصری" نے لکھا ہے۔

"حکمت اولیٰ کے مختلف انواع پر "اخوان الصفار" نے اکاون رسالے لکھے ہیں جن میں اکاون (۵۱) واں رسالہ چند امور و مقاصد پر مشتمل ہے اس آخری رسالے کا نام انھوں نے جامعہ رکھا۔

(قفطی نے رسالوں کی تعداد بشمول رسالہ "جامعہ" اکاون بتائی ہے حالانکہ کل رسائل ترپن ہیں جن میں رسالہ جامعہ ترپن واں رسالہ ہے)

یہ رسالہ مشوقات ہیں۔ سقصات نہیں۔ ان کی دلیلیں اور حجتیں غیر واضح ہیں گویا ان کا مقصد اور غرض اصل کی طرف اشارہ ہے جب ان کے لکھنے والوں نے اپنے نام چھپائے تو ان کے متعلق لوگوں میں اختلاف ہوا۔ کسی نے کہا کہ یہ امام کا کلام ہے جو حضرت علی کی نسل سے ہے بعض لوگوں کی یہ رائے ہے کہ معتزلیوں کی تصنیف ہے۔ تحقیق کے دوران مجھے "ابوحیان توحیدی" کا وہ جواب ملا جو تقریباً سنہ ۳۷۳ھ میں وزیر صمصام الدولہ بن عضدالدولہ کے سوال پر دیا گیا۔

اس طولانی جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ـــ "رفاعہ" چوتھی صدی کے نصف آخر میں ایک فاضل گذرا ہے جسے اکثر علوم و فنون میں بڑی درسگاہ حاصل تھی یہ اکثر حروف ہجا کی شکلوں اور لفظوں پر بحث کرتا تھا ایک عرصہ تک یہ بصرہ میں رہا جہاں اسے مختلف علوم و فنون کے فضلا سے ملنے کا اتفاق ہوا جس میں ابوسلمان محمد بن معشر البیوستی معروف بہ مقدسی۔ ابوالحسن علی بن ہارون الزنجانی۔ ابومحمد المہرجانی۔ العوفی وغیرہ شامل تھے ان لوگوں نے ایک انجمن بنائی تھی اور آپس میں معاہدہ کیا تھا کہ وہ صداقت اور نصیحت کی زندگی بسر کریں گے انھوں نے ایک مذہب ایجاد کیا جو ان کے زعم کے مطابق خدا کی قربت اور خوشنودی کا ذریعہ تھا وہ کہتے ہیں کہ شریعت کو جاہلوں نے ناپاک کر دیا ہے اسے فلسفہ ہی پاک کر سکتا ہے جب یونانی

اجتہادی فلسفہ اور عربی شریعت یہ دونوں آپس میں مل جائیں گے تو کمال حاصل ہوگا۔ انھوں نے اپنے رسائل کو دینی حکموں اور شرعی مثالوں سے بھر دیا ہے۔ یہ رسالے کتب فروشوں اور دوسرے لوگوں میں نشر کئے گئے ہیں (یعنی ابوحیان) نے یہ رسالے دیکھے ان میں ہر فن کے مسائل بیان کئے گئے ہیں لیکن اس قدر اختصار سے کہ پڑھنے والوں کو تشفی نہیں ہوتی۔

(صفحہ ۵۱۵ لغایتہ ۵۱۷ تاریخ فاطمین مصر مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

رسائل "اخوان الصفار" کے معرض وجود میں آنے کی تاریخ گذشتہ کئی صدی تک ایک دلچسپ معمہ بنی رہی۔ جس چیز کو جتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے اتنی ہی اس کی حقیقت و اہمیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ یہی حال ان رسائل کا ہوا یہاں تک کہ مصری علماء ایک عرصہ تک "اخوان الصفا" کے رسائل مرکز بحث بنے رہے۔ نعمان خیرالدین مشہور بہ ابن الالوسی البغدادی نے اپنی کتاب "جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمد" (مطبوعہ بولاق مصر سنہ ۱۲۹۸ھ) میں "کشف الظنون" کے حوالے "اخوان الصفار" کے تاریخی پس منظر کی ایک بالکل دوسری تصویر پیش کی۔

"اخوان الصفار" کے رسائل اصل میں قرامطہ کے مذہب پر مبنی ہیں۔ تیسری صدی کے بعد "بنی بویہ" کی دولت میں تصنیف کئے گئے۔ بعض لوگ انھیں حضرت جعفر الصادق کی طرف منسوب کرتے ہیں جو درست نہیں ہے صحیح یہ ہے کہ ان کا مولف سلمہ بن قاسم الاندلسی المجریطی (وفات سنہ ۳۵۳ھ) ہے ان رسالوں میں تصوف اور فلسفہ دونوں ملے ہوئے ہیں۔"

آلوسی کے اس نظریے پر احمد زکی پاشا نے مختلف پہلوؤں سے کافی بحث کی ہے اور واضح طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ "مجریطی" نے جو رسائل لکھے تھے ان کا تعلق "اخوان الصفار" کے رسائل سے نہیں ہے۔ احمد زکی پاشا کہتے ہیں۔

"یہ رسالے "مجریطی" کی تالیف نہیں ہو سکتے کیونکہ مجریطی کہتا ہے کہ میں نے تمام مسائل شرح وبسط سے بیان کئے ہیں اور "اخوان الصفا" کہتے ہیں کہ ہم نے مسائل بیان کرنے میں "شبہ المداخل والمقدمات" یعنی اختصار کو مدنظر رکھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجریطی وہ پہلا شخص ہے جس نے "اخوان الصفا" کو بلاد اندلس میں رائج کیا۔ "کشف الظنون" کی روائت سے صاف واضح ہے کہ "مجریطی" کے رسائل اور ہیں اور "اخوان الصفا" کے رسائل اور۔۔۔ "مجریطی" نے صرف اخوان الصفا کا رنگ اختیار کیا ہے۔

(صفحہ ۵۱۸ تاریخ فاطمین مصر مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

تاریخی نظریات کی ان چند متضاد مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "اخوان الصفا" کی جس اُلجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کی ایک ہزار برس سے کوشش کی جا رہی ہے وہ آج بھی ایک لاینحل مسئلہ بنا ہوا ہے مختلف عقیدے اور خیال کے لوگوں نے اپنی روایات کے مطابق اس معمہ کو حل کر لیا ہے مگر ان کا بنیادی تصور تاریخی اعتبار سے اتنا ہلکا پھلکا ہے جس پر کوئی آزادانہ رائے قائم کرنا دشوار ہی نہیں محال ہے پھر بھی جہاں تک ان رسائل کے افادی پہلو کا تعلق ہے اس حقیقت کو متفقہ طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ چند اختلافی مسائل کو چھوڑ کر ان رسائل میں علمی۔ ادبی۔ فنی مسائل پر جو عالمانہ مباحثے کئے گئے ہیں وہ ایسا انمول ذخیرہ ہے جو اس سے پہلے اتنی جامعیت کے ساتھ یکجائی طور پر کبھی پیش نہیں کیا گیا۔

"اخوان الصفا" کا وہ رسالہ جس کا اُردو ترجمہ اکرام علی نے کیا ہے۔ "علم الاخلاق" جیسے خشک موضوع پر ایک ایسی کہانی ہے جس میں انسان کو انسانی تفوق و برتری کے سبق آموز معنی سمجھائے گئے ہیں۔ جس طرح ایک کمسن بچہ ماں کی آغوش تربیت میں کائنات کو سوچنے اور سمجھنے کا شعور ان قصے کہانیوں سے پیدا کرتا ہے جو میٹھی میٹھی لوریوں میں اسے سنائے

جاتے ہیں اسی طرح اس دُنیا نے بھی اپنے بچپن میں "افسانوی ادب" کو اپنا کر انسانی ذہن و شعور کو اُجاگر کیا تھا ـــ اور یہ دیو۔ پری اور جنوں کی کہانیاں جن کا مقصد انسان کو یہ ذہن نشین کرانا ہوتا تھا کہ تم دُنیا کی تمام کائنات چرند و پرند۔ شجر و حجر۔ ساگر و سمندر اور چاند سورج میں سب سے برتر و افضل ہو انسانیت کا وہ پہلا سبق تھا جس سے انسانی ذہن کی گہرائیوں میں انسانیت اور بشریت کی صحیح قدروں نے جنم لیا تھا۔ انھیں کہانیوں نے پہلی بار انسان کو یہ محسوس کرایا کہ وہ اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کے لحاظ سے بھی کائنات عالم کا سب سے نمایاں اور اہم کردار ہے جس کی ایک معمولی سی معمولی لغزش انسانیت کے اہم مقصد کو نیست و نابود کر سکتی ہے۔

"اخوان الصفا" کا یہ اخلاقی افسانہ بھی اس اساس و بنیاد کی ایک اہم کڑی ہے جسے دوسرے رسائل کے مقابلے میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ـــ اور دنیا کی تمام زبانوں میں اس رسالے کے جس قدر ترجمے کئے گئے وہ اس مقبولیت کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

اخوان الصفاء کے مختلف رنگ روپ

تیسری چوتھی صدی ہجری کی یہ مشہور کتاب اس دور کی عربی زبان میں لکھی گئی تھی جسے مختلف زمانوں میں عربی زبان کی بدلی ہوئی شکلوں میں مختلف لوگ اپنے طور پر عربی زبان میں لکھتے رہے لیکن ان ترین یا اکاون رسالوں میں جو مقبولیت علم اخلاق کے اس رسالے کو نصیب ہوئی کسی دوسرے حصے کو نصیب نہیں ہوئی۔ عربی زبان میں اخوان الصفار کے صرف اسی حصے کے صدہا قلمی نسخے آج دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں میں نے ساتویں صدی ہجری سے بلکہ نویں صدی ہجری تک کے لکھے ہوئے کئی قلمی نسخے دیکھے ہیں جو انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستان کے مختلف پبلک اور نجی کتب خانوں میں موجود تھے۔

"اخوان الصفار" کے ان تمام رسائل پر مجموعی حیثیت سے انگریزی کے بعد جرمنی زبان میں کام کیا گیا ہے ۱۸۳۸ء میں جرمن مستشرق "نو فورک" نے سب سے پہلے ان رسائل عربی کا ایک خلاصہ شائع کیا اس کے بعد ۱۸۵۸ء اور ۱۸۷۶ء کے درمیان المانوی پروفیسر "فریدرخ" نے اس کا خلاصہ آٹھ جزو میں کر کے شائع کیا۔ "فریدرخ" انیسویں صدی عیسوی کا ایک ماہر "اخوان الصفار" تسلیم کیا گیا ہے جس نے اپنے اس کام کی تکمیل ۱۸۸۶ء میں اخوان الصفار کے تمام رسائل کا خلاصہ شائع کر کے کی اس کی اس کتاب کا نام "خلاصۃ الوفاقی اختصار رسائل اخوان الصفار" ہے۔

لیکن "اخوان الصفار" کے اس مخصوص رسالے سے زیادہ جس کا ترجمہ اکرام علی نے

(فورٹ ولیم کالج)

نے کیا ہے کوئی دوسرا رسالہ مقبول نہیں ہوا" سر جارج ابراہم گیریرسن" نے لنگوسٹک سروے آف انڈیا میں اس کے مختلف ایڈیشنوں کی جو تفصیل دی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد (عثمانیہ) نے لکھا ہے۔

یہ کتاب عرصہ دراز تک مقبول خاص و عام رہی چنانچہ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ ۱۸۱۳ء یعنی تالیف کے ایک سال بعد ہی شائع ہوا اس کے بعد سے ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے بڑے شہروں میں اس کے متعدد ایڈیشن نکلے۔ منشی سید حسین اور ٹی۔ ایچ (میانوال) نے اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا ہے مگر آجکل اس کے نسخے بہت کمیاب ہیں اُردو کی دوسری قدیم کتابوں کی طرح ان دنوں یہ بھی خاص و عام کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور کوئی شخص اس کو مطالعہ کرتا نظر نہیں آتا۔ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں اس کے دو نہایت قدیم گر مطبوعہ نسخے محفوظ ہیں ہمارے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ بھی بہت قدیم اور بمبئی کے مطبع حیدری کا مطبوعہ ۱۲۸۷ء ہے

(صفحہ ۲۳۶ ارباب نثر اردو مطبوعہ حیدر آباد دکن)

"اخوان الصفار" کی زیادہ شہرت اکرام علی کے ترجمے (۱۸۱۰ء) کے بعد ہوئی چنانچہ اکرام علی کے اسی اُردو ترجمے سے انگریزی۔ فارسی اور فرانسیسی زبانوں میں اس کے بیشمار ترجمے کئے گئے اور انیسویں صدی کے آخری دور میں جب یہ آئی۔سی۔ایس (I. C. S) کے نصاب میں داخل کر دی گئی تو اُردو ترجمہ کی مانگ اور بھی بہت بڑھ گئی۔ دہلی۔ بمبئی۔ لکھنؤ اور کانپور وغیرہ میں اردو اخوان الصفار کے بہت سے ایڈیشن شائع کئے گئے مگر بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں اکرام علی کی اردو اخوان الصفار کمیاب ہو گئی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں جب اکرام علی کے پوتے منشی حسن رضا ادیب نے اسے تلاش کیا تو وہ کہیں بھی دستیاب نہ ہوئی۔ اس واقعہ کو ادیب نے اخوان الصفار کے "سیتاپور ایڈیشن" میں

کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

"جب عالم دور میں گونہ تغیر ہوا تو پھر وہی لوگ جن کے دماغ عقل و شعور کے مرجع ہیں اور جن کو ہمیشہ ازدیاد حشمت کی فکر رہتی ہے انھیں نے غور کرکے اس زمانے میں کتاب اخوان الصفا اپنی زبان انگریزی میں ترجمہ کرکے اپنے ملک کے واسطے باعث استفادہ ہوئے۔ چونکہ اب ہندوستان میں بھی کثرت سے زبان ہندوستانی جاری ہے اس واسطے "اخوان الصفا" کا انگریزی ترجمہ یہاں بھی آیا جو درجہ مرغوب ہوا اور یہ حال جب انگریزی داں حضرات کو معلوم ہوا تو انھوں نے کوشش کی کہ اُردو اخوان الصفا مل سکے۔ اور اس امر کے دریافت کے لئے اخبارات میں اشتہار دئے گئے کہ اُردو اخوان الصفا کہاں سے کس قیمت پر دستیاب ہوسکتی ہے چونکہ اس وقت تک اُردو اخوان الصفا نایاب تھی لہٰذا کسی کو کوئی جواب نہ ملا۔ مگر لاہور کے "شیخ گلزار محمد و احمد علی مالکان مطبع گلزار محمدی جنرل لائبریری ایجنسی" نے اپنی مطبوعہ فہرست (کتب رعایتی) میں صفحہ ۱۲ کے آخری تیسرے کالم میں "اخوان الصفا" قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔ نہیں معلوم کس مصلحت سے جبکہ وہ کتاب نایاب تھی تحریر کردیا اگرچہ یہ کتاب عرصہ دراز سے بطور وراثت میرے پاس موجود تھی مگر اس خیال سے کہ اس کا دوسرا اڈیشن لامحالہ پتھر کے چھاپے میں طبع ہوا ہوگا اور ممکن ہے کہ اس دوسری اشاعت میں مضامین سابقہ میں کچھ کمی بیشی یا تغیر و تبدل ہوا ہو۔ منجملہ دیگر کتب وغیرہ کے اخوان الصفا کا آرڈر دے دیا۔ اگرچہ زیادہ غرض اسی کتاب کی تھی مگر مالک مطبع نے قبل اس کے کہ اس کتاب کی عدم موجودگی سے اطلاع کرے چند کتابوں وغیرہ کا پیکٹ جن میں بعض کو میں نے طلب بھی نہیں کیا تھا بذریعہ ویلو روانہ کردیا۔

ویلو کو میں نے ایک اشتیاق سے وصول کیا مگر دیکھنے کے بعد اس مجموعہ میں

کتاب اخوان الصفا نہ ملی اور اسی ویلو میں ایک تحریر منجانب مالک مطبع دیکھی گئی کہ باوجود تلاش کتاب اخوان الصفا نہ مل سکی۔

(دیباچہ "اخوان الصفا" سیتاپور ایڈیشن ۱۹۱۶ء)

اب میں عربی۔ فارسی۔ اردو۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے ان مطبوعہ ایڈیشنوں کی ایک فہرست پیش کررہا ہوں جو کسی طرح پر ایک مکمل فہرست نہیں کہی جاسکتی۔ مجھے یقین ہے کہ "اخوان الصفا" پر ریسرچ کرنے والے اس کام کو مجھ سے کہیں زیادہ محققانہ طور پر مکمل کرلیں گے۔

عربی ——————————— !

چونکہ یہ رسائل عربی زبان میں لکھے گئے تھے اس لئے "اخوان الصفا" کے عربی مخطوطات کی تعداد بہت زیادہ ہے ہندوستان میں مطبوعات کی تعداد کم ہے لیکن بلاد اسلامی میں اب تک بے شمار ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ مجھے حال میں سنٹرل لائبریری بھوپال میں اخوان الصفا کے تیرہ رسالوں کا ایک قلمی مجموعہ ملا ہے جس پر نہ تو کاتب کا نام ہے نہ سن کتابت؛ لیکن طرز تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسائل نویں اور دسویں صدی ہجری میں لکھے گئے تھے۔ یہ قلمی نسخہ ابوالفضل مولانا محمد عباس رفعت شروانی (ابن علامہ احمد یمنی) کے کتب خانے سے اس لائبریری میں پہنچا ہے۔ اس مجموعہ کے ابتدائی صفحہ پر خود مولانا شروانی کی لکھی ہوئی یہ تحریر موجود ہے۔

"ابوالفضل علم الدین محمد عباس بن شہاب الاسلام احمد الیمنی الانصاری اشہر شروانی بن الحاج محمد تقی خاں ہمدانی بن متوفی الممالک صدر اعظم معتمد الملک مرزا محمد علی خاں شہید بن مرزا ابراہیم خاں وزیر اعظم دارائے ایران نادر شاہ قہرمان بن الحاج یوسف السلیمی الخزرجی۔

پنجم ماہ رمضان الدین ۱۲۸۵ھ از سید صاحب علی سوداگر خرید نمود

مطبوعات کی فہرست حسب ذیل ہے لیکن اسے مکمل نہ سمجھنا چاہئے۔ اسلامی ممالک میں رسائل "اخوان الصفا" کے صدہا ایڈیشن گذشتہ پچاس سال کے اندر شائع کئے گئے ہیں جن کی فہرست تیار کرنا سخت دشوار کام ہے۔ اس فہرست میں عربی کے انھیں ایڈیشنو کا ذکر کیا گیا ہے جو ہندوستان میں عام طور پر مروج ہو چکے ہیں۔

۱۔ علامہ احمد یمنی شروانی کا ترتیب دیا ہوا "تحفۃ الاخوان الصفا" — جو اُردو "اخوان الصفا" کی اشاعت (۱۸۱۱ء) کے ایک سال بعد ۱۸۱۲ء میں اکرام علی کے ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع کیا گیا تھا۔ عربی کا یہ پہلا ایڈیشن ہے جو ہندوستان میں شائع کیا گیا۔ یہ ایڈیشن فورٹ ولیم کالج کے تعاون واشتراک سے شائع کیا گیا تھا۔ ابتدا میں T.T. THOMASAN کا لکھا ہوا ایک انگریزی مقدمہ بھی شامل ہے جو غالباً فورٹ ولیم کالج کے شعبہ عربی سے تعلق رکھتے تھے۔

"اخوان الصفا" کا یہ رسالہ بھی وہی رسالہ ہے جس کا ترجمہ اکرام علی نے کیا تھا۔ اس ایڈیشن میں مصنف کا نام "ابن الجلدی" (IBN-OOL-JULDEE) لکھا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۴۶ء میں اور تیسرا ایڈیشن مولوی ولایت حسین نے ۱۸۸۸ء میں شائع کیا تھا۔

(۲) ہندوستان میں دوسرے ایڈیشن مطبوعہ لاہور کا پتہ چلتا ہے جو ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔

(۳) تیسرا ایڈیشن ۱۳۰۶ھ میں نورالدین جیوا خاں نے اپنے مطبع "نخبۃ الاخبار" بمبئی سے شائع کیا تھا۔

(۴) ۱۸۹۹ء میں نولکشور پریس لکھنؤ نے عربی کا ایک ایڈیشن شائع کیا۔

(۵) مطبعۃ الآداب مصر میں شیخ علی یوسف کے اہتمام سے ۱۳۰۶ھ چھپا۔ یہ رسائل ریاضی سے متعلق ہیں۔

(۶) زبدہ رسائل "اخوان الصفا" کے نام سے مطبعۃ الترقی مصر ۱۳۱۸ء نے شائع کیا۔

(۷) مطبعۃ التقدم مصر نے دوبارہ انھیں رسائل کو ۱۳۳۱ھ میں شائع کیا۔

(۸) ۱۳۴۷ھ میں مطبعۃ العربیہ مصطفےٰ مصر نے شائع کیا۔

(۹) "رسائل اخوان الصفا" قاہرہ سے ۱۹۲۸ء میں شائع کئے گئے۔

(۱۰) عمرالدسوقی نے "دارالاحیاء الکتب العربیۃ" ۱۹۴۷ء میں شائع کیا۔

(۱۱) "الرسالۃ الجامع الحکیم المجریطی" مطبعۃ المجمع العربی (دمشق) سے ۱۹۴۸ء میں "جمیل صلیبا" نے شائع کیا۔ یہ مجموعہ ۱۱ رسالوں کا ہے لیکن "جمیل صلیبا" نے انھیں "المجریطی" سے منسوب کیا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے دراصل یہ رسائل "اخوان الصفا" ہی کے سترہ رسائل ہیں۔

(۱۲) "عمر فروخ" نے ۱۹۵۳ء میں ان رسائل پر تنقید و تبصرہ کر کے بیروت سے شائع کیا تھا۔

(۱۳) "رسائل اخوان الصفا" کا خلاصۃ الوفافی اختصار رسائل اخوان الصفا ۱۸۸۳ء میں فریڈرک ڈیتری نے شائع کیا۔ ۱۸۸۶ء

فارسی

۱۔ "مجمل الحکمۃ" کے نام سے خراسان میں کسی نے شرف الانسان کا ترجمہ کر کے صاحبقران امیر تیمور سے منسوب کیا ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۰۵ھ/۱۳۰۷ھ (۷۷۱ھ—۸۰۷ھ) میں عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

۲۔ ۱۸۸۴ء میں (بماہ فروری) محمد علی شہید کشکول نے ابوالفضل مرزا محمد عباس رفعت شروانی کے تعاون واشتراک سے ایک ایڈیشن بمبئی سے شائع کیا جس کا انتساب والا جاہ نواب صدیق حسن خاں (بھوپال) کے نام کیا گیا ہے یہ وہی رسائل ہیں جو صاحبقراں امیر تیمور

کے زمانے میں ترجمہ کیے گئے تھے۔

۳۔ سنہ ۱۳۰۲ھ میں دوبارہ اسی ایڈیشن کو مرزا محمد شیرازی نے بمبئی سے شائع کیا۔
۴۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں مولوی الفاظ الدین احمد نے اپنے حاشیے کے ساتھ کانپور سے شائع کیا۔
۵۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں اسی رسالہ (مناظرہ انسان و بہائم) کو لکھنؤ سے غالباً نولکشور پریس نے شائع کیا۔
۶۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں مولوی برکت اللہ لکھنوی نے فارسی کا ایک ایڈیشن کانپور سے شائع کیا۔

اُردو

سنہ ۱۸۱۰ء میں اکرام علی نے عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا اس کے بعد اب تک جس قدر ایڈیشن اس کے شائع ہوئے اس کی مکمل فہرست تو دستیاب نہ ہو سکی مگر جہاں تک میری رسائی ہو سکی ہے اس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ سنہ ۱۸۱۰ء میں پہلا ایڈیشن خود اکرام علی کے ہندوستانی پریس (کلکتہ) سے شائع کیا گیا۔
۲۔ سنہ ۱۸۲۹ء مائیکل نے انتخاب کر کے لندن سے شائع کیا۔
۳۔ سنہ ۱۸۴۹ء = ۱۲۶۵ھ مطبوعہ محمدی تکیہ شاہ فصیح لکھنؤ (پتھر کا چھاپہ)
۴۔ سنہ ۱۸۵۲ء = مطبع محمدی (مچھوا بازار) کلکتہ
۵۔ سنہ ۱۸۶۱ء = ولیم ایلن اینڈ کمپنی پال مال سٹریٹ لندن۔ اکرام علی کے ترجمہ کے مطابق ”فاربس“ اور ”رہ“ نے ترتیب دیا۔ (مصری ٹائپ)
۶۔ سنہ ۱۸۶۱ء = نولکشور پریس لکھنؤ (پتھر کا چھاپہ)
۷۔ سنہ ۱۹۱۶ء = ”سیتاپور ایڈیشن“ اکرام علی کے پوتے منشی حسن رضا ادیب نے امیر المطابع سیتاپور سے شائع کیا۔ (پتھر کا چھاپہ)
۸۔ سنہ ۱۹۳۹ء انجمن ترقی اردو دہلی (پتھر کا چھاپہ)

انگریزی

۱۔ سنہ ۱۸۵۵ء۔ منشی سید حسین نے مدراس سے شائع کیا۔
۲۔ سنہ ۱۸۶۰ء۔ بحوالہ T.M.P (لندن)
۳۔ سنہ ۱۸۶۹ء۔ ”جون ڈالس“ نے لندن سے شائع کیا۔
۴۔ سنہ ۱۸۶۹ء پلاٹس (FLATTS) کا ترجمہ لندن سے شائع ہوا۔
۵۔ سنہ ۱۸۷۳ء ”جوزف وال“ کا ترجمہ۔ اس کا دوسرا ایڈیشن لکھنؤ سے شائع ہوا۔
۶۔ سنہ ۱۸۸۳ء ”لین پال“ (S.LANE-POALE) کا ترجمہ لندن میں چھپا۔
۷۔ سنہ ۱۸۸۸ء مولوی ولایت حسین نے کلکتہ سے شائع کیا۔
۸۔ سنہ ۱۹۰۹ء جان پلاٹس (JHON PLUTTS) کا ”برادر آف پیوریٹی“ (BROTHER OF PURITY) جو لندن پرنٹنگ ورکس لاہور نے شائع کیا۔
۹۔ سنہ ۱۹۳۷ء SOM WORK AN ABOVE SEPPLEMANT لندن سے شائع ہوا۔
۱۰۔ سنہ ۱۹۴۳ء BROCKELMAN. C. (لندن)
۱۱۔ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء M. STERN. THE ANTHERSHINGS OF THE EPISTLAS OF THE EKHWAN-OS-SAEA. ISLAMIC (لندن)

انگریزی ترجموں اور خلاصوں کی یہ مختصر فہرست ہے اس موضوع پر انگریزی زبان میں صدہا کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں جو بجائے خود ایک موضوع ہے۔

فرنچ

فرنچ زبان میں ”اخوان الصفا“ پر زیادہ تر تبصرے اور تنقیدیں متعلق کتابیں ملتی

۱؎ میرا خیال ہے کہ یہ ”پلاٹس“ کے اسی ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن ہے جو پہلی بار سنہ ۱۸۶۹ء میں لندن سے شائع ہوا تھا۔

ملتی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

۱- RASAIL EKHWAN-AL-SAFA IN DER ISTAM

۲- پیرس ۱۹۴۷ء G. GUADRI

۳- ۱۹۴۸ء FRIRES DELA PURETE

جرمن

جرمنی زبان میں بھی اخوان الصفاء پر کافی ریسرچ کی گئی ہے لیکن زیادہ تر کتابیں تنقید۔ تبصرہ اور خلاصے ہیں۔

۱- کل رسالوں کا ترجمہ پانچ جلدوں میں (F. DIETERICHI) نے ۱۸۵۸ء۔ ۱۸۵۹ء میں کیا ہے۔ انھیں رسالوں کا خلاصہ (PHILOS-DAR ARAKER) نے ۱۸۶۱ء۔ ۱۸۶۲ء میں شائع کیا۔

۲- HISTORY OF PHILOSOPHY IN ISLAM مطبوعہ لندن میں انھیں رسائل پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۳- I. GOLDZIHAR نے ۱۹۱۰ء میں رسائل اخوان الصفاء پر تبصرہ کیا۔

ترکی

"شرف الانسان" از محمود بن عثمان بن علی لامعی ۹۳۲ھ- ۱۵۲۶ء

اخوان الصفاء کا تنقیدی تجزیہ

فورٹ ولیم کالج کے ارباب نثر نے اُردو زبان و ادب میں جس اسلوب نگارش کی بنیاد ڈالی تھی حقیقتاً وہ ایک ایسا تاریخی کارنامہ ہے جسے اُردو زبان و ادب کی تاریخ کبھی بھی فراموش نہ کر سکے گی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے اردو ادب پر فارسی ادبیات کے جو اثرات پڑے تھے انھوں نے اردو طرز نگارش کو مقفٰے اور مسجع عبارتوں سے جکڑ رکھا تھا جس میں عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ کی آمیزش نے کچھ ایسی مشکلات پیدا کر دی تھیں کہ یہ زبان ایک مخصوص طبقے کی زبان ہو کر رہ گئی تھی۔ اُردو زبان جو ہندوستان کی مختلف قوموں کے تمدنی میل جول اور ثقافتی اتحاد کی پیامبر تھی اور ہندوستان کی تمام مقامی زبانوں کے فطری امتزاج نے اسے ایک عوامی زبان کی شکل میں جنم دیا تھا اپنی "ادب نگاری" کی مشکل پسندی کے بھنور میں کچھ اس طرح پھنس کر رہ گئی تھی کہ عوامی رجحانات اس سے قریب ہونے کے بجائے دور ہوتے چلے گئے ___ یہاں تک کہ اردو داں طبقے کے ذہن و دماغ پر صدیوں تک یہی فرسودہ تصورات منڈلاتے رہے کہ صحیح اردو زبان وہی ہے جو شاہجہاں آباد (دہلی) کے قلعہ معلیٰ کی چہار دیواری میں محصور رہی ہے۔

اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو میں یہی کہوں گا کہ اردو نظم و نثر کے سنوارنے میں اور اسے "مشکل پسندی" کے رجحانات سے دور رکھنے کے سلسلہ میں میر تقی میر اور انشاء اللہ خاں انشاء نے وہ کام کیا ہے جو ان سے پہلے کوئی بھی دوسرا نہ کر سکا۔ با محاورہ

اور عام فہم نظم کی بنیاد میر نے ڈالی — اور انشاء نے اردو زبان کو عربی فارسی کے متعلق اور غیر مانوس الفاظ سے اتنا پاک کیا کہ "رانی کیتکی" کے قصے میں ایک لفظ عربی یا فارسی کا استعمال نہیں کیا۔

سید انشاء اللہ خاں انشاء (وفات ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء) جن کا زمانہ ادبی خدمات کی سرگرمیوں کے لحاظ سے "فورٹ ولیم کالج" کے قیام سے پہلے ہی کا سمجھنا چاہیئے نہ صرف نظم و نثر کی مرد میدان تھے بلکہ انھوں نے اردو زبان میں بنیادی طور پر بہت سی اصلاحیں بھی کی ہیں اور زبان کو "فصاحت" کے اس فطری معیار سے قریب تر پہنچنے میں مدد دی جسے اس دور کا پڑھا لکھا طبقہ ایک عجیب سی انہونی بات سمجھتا تھا۔

یوں تو ہر ملک میں جب بھی انقلابات آئے سیاست اور اقتدار کی کشمکش نے کسی نہ کسی انداز میں وہاں کی زبان۔ تہذیب۔ تمدن اور معاشرت کو ضرور متاثر کیا بالکل آج کی "سیاست کاریوں" نے اُردو زبان کے لئے خاص طور پر جو مشکلات پیدا کر دی ہیں ایسا وقت شاید ہی کسی ملک گیر زبان پر پڑا ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر اردو زبان و ادب کے معیار کو ہم انشاء کی بنائی ہوئی راہوں پر لے کر چلتے تو آج ہماری مشکلات میں دشواریاں کم اور آسانیاں زیادہ ہوتیں۔ (بابائے اردو) مولوی عبدالحق (سکریٹری انجمن ترقی) کا یہ خیال ہمارے اس نظریہ کی واضح تائید و ترجمانی کرتا ہے۔

جو لوگ اُردو زبان کا محققانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں یا اس کے صرف و نحو یا لغت پر کوئی محققانہ تالیف کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس (انشا کی مشہور کتاب دریائے فصاحت) کا مطالعہ ضروری ہی نہیں ناگزیر ہے۔"

انشاء نے اُردو زبان کی فصاحت اور غیر فصاحت پر اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ تمام دنیا کی "لسانی نفسیات" کا ایک ایسا تجزیہ ہے جس کی کسوٹی پر دُنیا کی تمام زبانوں کو پرکھا جا سکتا ہے خواہ وہ ہندی ہو یا اردو۔

فارسی ہو کہ عربی۔ بنگالی ہو یا پنجابی! اصولی طور پر وہ تمام الفاظ جنھیں عوام کا ذہن و مزاج قبول کر لیتا ہے اس زبان کا جزو بن جاتے ہیں جو اس ملک میں بولی جاتی ہے۔ انشاء نے اس اصول سے بحث کرتے ہوئے اردو زبان میں ان تمام الفاظ کے شامل کرنے پر زور دیا ہے جسے عوام کا ذہن و شعور قبول کر چکا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہوگیا عربی ہو یا فارسی۔ ترکی ہو یا سریانی پنجابی ہو یا پوربی۔ از روئے اصل غلط ہو یا صحیح۔ وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلاف اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اس کی صحت و غلطی اُردو کے استعمال پر موقوف ہے کیونکہ جو کچھ خلاف اُردو ہے غلط ہے گو اصل میں صحیح ہو اور جو کچھ موافق اُردو ہے صحیح ہے گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو۔"

(دریائے فصاحت)

"غلط العوام" غلط نہیں ہے — اور یہی "علم اللسان" کا سب سے بڑا اور قیمتی اصول ہے انشاء کی ان چند سطروں میں اس کی جتنی جامع اور مختصر تشریح کی گئی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ خصوصیت کے ساتھ اُردو زبان کی بقاء و ارتقاء کے لئے اس اصول کی پابندی اتنی ضروری تھی کہ اس پر کافی عرصہ تک پورے طور سے عمل نہ کرنے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اس زبان کو جتنی ترقی کرنی چاہئے تھی نہ کر سکی۔

جہاں تک میرے محدود مطالعہ کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں فورٹ ولیم کالج سے پہلے اُردو زبان کے قدیم طرز نگارش میں انقلابی تبدیلی کا سہرا انشاء ہی کے سر ہے اگرچہ ان کی یہ ادبی جد و جہد ایک انفرادی کوشش و کاوش ضرور تھی لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے اپنے فیض آباد اور لکھنؤ کے زمانہ قیام میں انشاء کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی تھی جس کا فطری "ردِ عمل" یہی ہو سکتا تھا جو "فورٹ ولیم کالج" کی شکل میں ہمارے سامنے آیا تھا۔ انشاء نے نہ صرف اردو کے حروف

تھی میں چند بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی بلکہ اردو صرف و نحو کے اصولوں کا بھی نفسیاتی جائزہ لیا۔ اور سب سے مقفّیٰ اور مسجع رنگین عبارتوں کے "اسلوب بیان" کو ترک کر کے عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ سے بھی بہت کچھ پاک کرنے کی کوشش کی۔ "کیتکی" جو اپنے رنگ کی اُردو میں پہلی تصنیف ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہی ہے کہ اس میں عربی یا فارسی کا ایک لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

اب یہاں سے کہنے والا یوں کہتا ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان چڑھی۔ کوئی کہانی ایسی کہیئے جس میں ہندی کے سوا اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ میں نہ ہو۔ تب میرا جی پھول کر کلی کے روپ کھلے۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے۔ پُرانے دھرانے ٹھاگ بڑے ڈھاگ۔ یہ کھڑاک لائے۔ سر ہلا کر منہ تھتھا کر۔ ناک بھوں چڑھا کر گلا پھلا کر لال لال آنکھیں پتھرا کر کہنے لگے ۔۔ یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔

ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پن بھی نہ ٹھس جائے۔ جیسے بھلے مانس اچھوں سے اچھے لوگ آپس میں بولتے چالتے ہیں۔ جوں کا توں وہی سب ڈول رہے اور چھاؤں کسی کی نہ پڑے۔ یہ نہیں ہونے کا۔ میں نے ان کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹھوکا کھا کر جھنجھلا کر کہا۔ میں کچھ ایسا بڑا بول نہیں جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کر انگلیاں نچاؤں اور بے سری بے ٹھکانے کی اُلجھی سُلجھی تانیں لے جاؤں۔ مجھ سے نہ ہو سکتا تو بھلا منھ سے کیوں نکالتا۔

جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں سے آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ اسے لوگ پکارتے ہیں کہ سناتا ہے۔ اپنا ہاتھ منھ پر پھیر کر مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو جتاتا ہوں۔ جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور راؤ چاؤ اور کود پھاند کر اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں۔ آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچپلاہٹ میں ہے دیکھتے ہی ہرن کے روپ اپنی چوکڑی بھول جائے۔

(رانی کیتکی)

اس صاف ستھری۔ سلیس اور عام فہم عبارت میں ایک لفظ بھی ایسا نظر نہیں آتا جسے عام طور پر ہندوستان و پاکستان میں نہ سمجھا جاتا ہو ان سطروں کی یہی "معجزہ کاری" نہیں ہے کہ اس میں عربی یا فارسی الفاظ کو جگہ نہیں دی گئی ہے بلکہ انشاء کا یہ اسلوب نگارش اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ہندوستان و پاکستان کی تمام زبانوں میں اردو اور صرف اُردو ایک ایسی لوچ دار زبان ہے جسے زمانہ ہر طرح پر اپنے مزاج اور شعور کے مطابق ایسے موڑ دے سکتا ہے جس سے نہ تو اس کی بنیادی شکل و ہیئت میں کوئی فرق پڑتا ہے نہ اس کی لسانی خصوصیات ختم ہوتی ہیں۔ عرض کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اُردو زبان کے جس ہندوستان گیر تصور کو اپنے سفر لکھنؤ و فیض آباد میں جگہ دی تھی ان کا وہ خواب "فورٹ ولیم کالج" کے روپ میں پورا ہوا۔ اب تک انفرادی طور پر انشاء جس کام کو کر رہے تھے گلگرائیسٹ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی امداد نے اسے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل میں انجام دینے کا موقع دے دیا اور ان کی یہ اجتماعی کوشش اس شاندار طریقے پر کامیاب ہوئی کہ ایک صدی کے اندر ہندوستان کے تصنیفی و تالیفی شعور میں ارتقائی پختگی پیدا ہو گئی۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف "اردو پر انگریزی لٹریچر کا اثر" میں لکھتے ہیں:-

فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات ہی کی بدولت ایک بڑے درجے تک اُردو نثر کا معیار اس بلند مقام تک پہنچا ہے جو حال کے زمانے میں اُردو مصنفین کو میسر ہوا ہے فی الواقع فورٹ ولیم کے ترجمے مقفّیٰ عبارت سے پاک ہیں۔ قطع نظر

ان کے سنہ ۱۸۳۲ء یا اس سے بہت بعد تک اُردو نثر کی بہت کم تصنیفات شائع ہوئیں۔ (بحوالہ صفحہ ۱۱۱ "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" مطبوعہ ہندوستانی اکیڈیمی الٰہ آباد ۱۹۳۶ء)

یوں تو "فورٹ ولیم کالج" کے شعبہ تصنیف و تالیف اور دارالترجمے میں کئی درجن ہندوستانی علماء، فضلا اور اہل کمال نے علمی اور ادبی مشاغل میں حصہ لیا ہے لیکن جتنی شہرت اور مقبولیت میرامن دہلوی۔ اکرام علی۔ حیدر بخش حیدری۔ میر میاں علی حسینی۔ مظہر علی ولا، مرزا علی لطف اور حفیظ الدین احمد کو نصیب ہوئی ان کے دوسرے معاصرین اس منزل تک نہ پہنچ سکے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں۔

"وہ خاص لوگ جو انگریزوں کے واسطے سنسکرت اور فارسی سے ترجمہ کرنے یا نئی کتابیں سادہ اور بے تکلف زبان میں لکھنے کی غرض سے جمع کیے گئے تھے۔ سید محمد حیدر بخش حیدری۔ بہادر علی حسینی۔ میرامن۔ حفیظ الدین احمد۔ مظہر علی ولا۔ اکرام علی اور مرزا علی لطف وغیرہ ہیں جن کی تصانیف نہایت صاف سادہ اور دلکش عبارت میں ہیں ان کتابوں سے اکثر ثقیل اور غیر مانوس فارسی اور سنسکرت الفاظ نکال دیے گئے ہیں۔ یہی کتابیں نصف صدی تک نثر اردو کی بہترین تصنیف سمجھی جاتی تھیں اور زمانۂ حال کی جو ترقیاں زبان میں ہو رہی ہیں ان کا زیادہ تر دارومدار انھیں پر ہے۔"

(صفحہ ۲۳۵ و ۲۳۶ "تاریخ ادب اردو" مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ)

لیکن ان سب سے زیادہ جو شہرت میرامن دہلوی نے حاصل کی وہ ان کے دوسرے معاصرین میں کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ چنانچہ اس شہرت کا سہارا لے کر سرسید نے انھیں نثر کا ولی دکھنی قرار دیا اور ڈاکٹر گارساں دتاسی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ۔

"میرامن پہلے ہندوستانی نثر نگار تھے۔"

(خطبات گارساں دتاسی۔ پانچواں خطبہ ۱۸۵۴ء)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "باغ و بہار" میں جو سلیس و عام فہم اُردو استعمال کی گئی ہے وہ ان تمام تعلقات اور رنگینیوں سے پاک و صاف ہے جو اس دور میں مقفیٰ و مسجع عبارتوں کی شکل میں رائج تھیں لیکن اس سلسلہ میں ڈاکٹر عبدالحق کے اس تنقیدی تجزیے کو بھی ضرور سامنے رکھنا چاہیے۔

"فارسی "نوطرز مرصع" کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "باغ و بہار" فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مآخذ "نوطرز مرصع" ہے۔[1] تعجب اس بات کا ہے کہ میرامن نے فارسی کتاب اور اس کے ترجمہ کا تو ذکر کیا ہے مگر "نوطرز مرصع" کا ذکر صاف اُڑا گئے اب میں تینوں کتابوں سے بعض مقامات کا مقابلہ کر کے دکھاتا ہوں جس سے میرے بیان کی پوری تصدیق ہوگی۔

اصل یہ ہے کہ ترجمہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں۔ فارسی قصے کو اپنی اپنی زبان میں بیان کر دیا ہے لیکن جہاں کہیں "نوطرز مرصع" اور فارسی کتاب میں اختلاف ہے "باغ و بہار" میں "نوطرز مرصع" کا اتباع کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی قصے کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا مآخذ "نوطرز مرصع" ہے۔ بعض مقامات پر تو الفاظ اور جملے کے جملے وہی لکھ دیے ہیں جو "نوطرز مرصع" میں ہیں۔"

ڈاکٹر عبدالحق کا یہ دعویٰ بالکل بے دلیل نہیں ہے۔ "باغ و بہار" میں دو ایک مقامات پر پورے پورے وہی جملے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ نظر آتے ہیں جو

---

[1] مولوی عبدالحق کا یہ فرمانا درست نہیں ہے "باغ و بہار" کا جو ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں بحیات میرامن دہلوی کلکتہ سے چھپا ہے اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے۔

"باغ و بہار" تالیف کیا ہوا میرامن دلی والے کا۔ ماخذ اس کا "نوطرز مرصع" کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے۔ فارسی قصہ چہار درویش سے" (صفحہ ۱۴۷ اردو کی نثری داستانیں مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان)

"نوطرز مرصع" میں موجود ہیں۔

"نوطرز مرصع" جسے میر محمد حسین خاں تحسین نے نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں شروع کیا تھا اور ۱۷۷۵ء میں جس سال نواب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے ختم کر کے انھیں کے نام معنون کردیا اور میر امن کی "باغ و بہار" اس کے تقریباً پچیس سال بعد ۱۸۰۳ء (۱۲۱۷ھ) لکھی گئی اس کے علاوہ ایک دوسری "نوطرز مرصع" محمد عوض زرین نے لکھی اور اس کی تاریخ بھی "باغ و بہار" سے (۱۲۱۷ھ) نکلی۔ یہ دونوں کتابیں تخمیناً ایک ہی زمانے میں شائع ہوئیں۔ تحسین کی "نوطرز مرصع" اب قریب قریب کمیاب ہے البتہ اس کے دو قلمی نسخے انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق نے فارسی کی اصل کتاب۔ تحسین کی "نوطرز مرصع" اور میر امن کی باغ و بہار" کو سامنے رکھ کر جو موازنہ کیا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ میر امن کی "باغ و بہار" دراصل "نوطرز مرصع" سے کچھ نہ کچھ قریب ضرور ہے۔

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے ______

(بادشاہ آزاد بخت راتوں کو قبور کی زیارت کرنے جاتا تھا ایک روز اسی سیر میں اس کی چار درویشوں سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے اس کا ذکر فارسی کتاب میں اس طرح ہے کہ)

اصل عبارت فارسی ______

"در میان قبرستان نظرش بر چار جا تے افتاد کہ روشنی چراغ دوری نمود۔ بادشاہ با خود گفت کہ البتہ در آن مکان غریبے از وطن آوارہ یا بیکسے ستم رسیدہ یا بیچارہ، از حادثات فلکی بجان آمدہ یا درویشے از خلق کنارہ گرفتہ با صاحب دلے بہ ارواح قبور سے یافتہ خواہد بود۔ و الا در چنیں مکان بسر بردن کار دیگرے نیست۔"

"نوطرز مرصع" (تحسین) کا یہی مقام ملاحظہ کیجئے ______

"اس عرصۂ فرخندہ سیر کے تئیں دور سے بفاصلہ فرسنگ کے ایک چراغ نظر آیا لیکن باوصف اشتداد باد صرصر کے زنہار اشتعار چراغ کے تئیں سر مو حرکت نہ تھی بادشاہ نے اول خیال کیا کہ طلسم شیشہ نمائی کا ہوگا یعنی اگر پھٹکری کو گرد فتیلہ چراغ کے چھڑک دیجئے تو کیسی ہی ہوا چلے چراغ گل نہ ہوگا۔"

میر امن اس مقام کو یوں لکھتے ہیں ______

"ایک بارگی بادشاہ کو دور سے ایک شعلہ سا نظر آیا کہ مانند صبح کے ستارے کے روشن ہے دل میں اپنے خیال کیا کہ اس آندھی اور اندھیرے میں یہ روشنی خالی از حکمت نہیں۔ یا یہ طلسم ہے کہ اگر پھٹکری اور گندھک کو چراغ میں بتی کے آس پاس چھڑک دیجئے تو کیسی ہی ہوا چلے چراغ گل نہ ہوگا۔"

"نوطرز مرصع" میں اثنائے بیان میں دو ہندی کبت بھی آگئے ہیں۔ میر امن نے دونوں کبتوں کو بعینہ نقل کردیا ہے۔ ایک کبت دوسرے درویش کی سیر میں ہے جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

نکھ بن کٹا دیکھئے سیس بھاری جٹا دیکھئے
جوگن کن پھٹا دیکھئے۔ دیکھئے چھار لائے تن میں

دوسرے کبت کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

جب دانت نہ تھے تب دودھ دیئو
جب دانت دئے کہا ان نہ دے ہے

(مقدمہ "باغ و بہار") (ڈاکٹر عبدالحق)

میر امن کے بعد حیدر بخش حیدری۔ میر بہادر علی حسینی۔ میر شیر علی افسوس مرزا علی لطف اور مظہر علی ولا کا نمبر آتا ہے لیکن ان میں سے کئی ہستیاں ایسی ہیں جنھوں نے اردو زبان میں سلاست اور روانی پیدا کرنے کی انتہائی کوشش

کے باوجود قدیم طرز تحریر سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ مثال زندہ کے طور پر مرزا علی لطف کے اسلوب بیان میں جگہ جگہ مقفیٰ عبارت آرائی کے فن کو زندہ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نئی ہوئی دلی کا ذکر کرتے ہوئے لطف نے خواجہ میر درد کے حالات میں لکھا ہے۔

”جس ایام میں معمورہ شاہجہاں آباد کا۔ اور ہر ایک کوچہ اس خجستہ بنیاد کا۔ مجمع اہل کمال سے اور کثرت منتخبان اہل کمال سے رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا۔ تو معمورے پر شہر کے عرصہ ربع سکون کا تنگ اور اس خراب آباد کو تشبیہ سے ہفت اقلیم کے ننگ تھا۔ جبکہ متواتر نزول آفات کے باعث اور تکرر وردلمیات کے سبب خراب ہوا اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا۔“

(صفحہ ۹۸ گلشن ہند۔ مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور ۱۹۰۶ء)

نواب آصف الدولہ کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

”افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی۔ نائبوں کے ہاتھ میں اہتمام ملک کا سرانجام رکھا آپ سیر و شکار سے کام رکھا۔ مشیر کوئی لائق اور کام کا نہ پایا۔ اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ کا نام پایا۔“

(صفحہ ۱۴ گلشن ہند)

ولی کے ہمعصر حاتم کے متعلق لکھتے ہیں۔

”شاعر خوش بیان تھا۔ صاحب دو دیوان تھا۔ ایک دیوان میں نہایت خروج ابہام کیا ہے اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے۔

(صفحہ ۸۱ گلشن ہند)

یہی اعتراض میر شیر علی افسوس پر بھی کیا جاتا ہے کہ انھیں جہاں کہیں مقفیٰ عبارتیں لکھنے کا موقع مل گیا اسے نہیں چھوڑا۔

مولوی محمد یحییٰ تنہا (بی۔ اے) نے ”سیر المصنفین“ میں افسوس کی ”آرائش محفل“ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”حالانکہ میر شیر علی افسوس کو جہاں کہیں مقفیٰ عبارت لکھنے کا موقع ملا ہے اس سے ہرگز گریز نہیں کیا گیا اور اس امر میں (آرائش محفل کے) ابتدائی یا آخری حصے کی کوئی قید نہیں ہے اب ہم مثال کے طور پر چند عبارتیں نقل کرتے ہیں جس سے ہمارے بیان کی تصدیق ہوگی۔

صفحہ ۵۴ ——

”یہاں کے حسین بھی حسن میں بے نظیر اور چنچل ہیں۔ اور میرا یہ مدعا نہیں کہتا کہ خوبان سے کوئی ملک خالی ہے لیکن اس سرزمین کے معشوقوں کی چال ہی نرالی ہے۔ تراش اور خراش آن و ادا ناز و انداز سج دھج لگاوٹ۔ بانکپن بھبن جو یہاں ہے سو کسی اور ملک میں کہاں۔

صفحہ ۲۷۶ ——

”امور مملکت بخوبی جاری ہوئے۔ ظالم سرکش ظلم و سرکشی سے عاری ہوئے۔ ہر ایک نے موافق اپنے حوصلے کے مجلس نشاط ترتیب دی۔ شراب عیش منقل بٹنے لگی۔ شہر میں کوئی گھر نہ تھا۔ جہاں مبارک سلامت نہ تھی پیر و جوان کا غنچہ دل طرح وا ہوا۔ بلکہ غنچہ تصویر بھی کھل گیا۔ باشندے شہر کے ایک لخت شاد ہوئے ملک نئے سر سے آباد ہوئے۔“

فورٹ ولیم کالج کی تمام شخصیتوں میں اکرام علی کا کردار صرف اس لئے اہمیت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے دوسرے نامور اور مقبول ساتھیوں کی طرح سلیس۔ عام فہم آسان اور بامحاورہ اردو لکھتے میں صرف یہ طرز ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ انھوں نے میر امن، حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی وغیرہ کے شانہ بشانہ ”مشکل پسندی“ کے خلاف

ایک موثر قدم اُٹھا کر اُردو زبان کو حشو و زوائد سے پاک و صاف کیا تھا۔ اور اکرام علی کی اہمیت و خصوصیت اس لئے بھی کچھ زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ وہ عربی زبان کے ایک مستند عالم کا درجہ رکھتے تھے۔ اپنے تمام معاصرین میں اکرام علی اور مولوی امانت اللہ ہی دو ایسے عربی داں عالم تھے جن کا تعلق کالج کے شعبہ عربی سے ثابت ہوتا ہے لیکن اکرام علی کے مقابلے میں مولوی امانت اللہ کا طرز تحریر سلاست و روانی کے لحاظ سے نہ شگفتہ کہا جا سکتا ہے نہ سلیس و بامحاورہ۔

"سیر المصنفین" کے مصنف مولوی محمد یحییٰ تنہا (بی۔ اے) نے اکرام علی اور مولوی امانت اللہ کے اسلوب بیان اور انداز نگارش کا موازنہ کرتے ہوئے بہت کچھ صحیح لکھا ہے۔

"مولوی امانت اللہ عالم و فاضل ضرور ہیں لیکن ان کی عبارت میں شگفتگی اور روانی نہیں ہے۔ میر امن۔ سید حیدر بخش حیدری اور میر شیر علی افسوس سے ان کو کوئی نسبت نہیں ہے بے شک مولوی اکرام علی صاحب بھی عبارت خوب لکھتے ہیں ان کے بعد پھر صفائی اگر پائی جاتی ہے تو نہال چند لاہوری ہیں ورنہ دوسرے نثار تو گنجلک عبارت لکھنے کے عادی ہیں۔

صفحہ ۱۸۹ (سیر المصنفین)

"فورٹ ولیم کالج" کے نثر نگاروں میں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جنھوں نے فارسی کتابوں کو سامنے رکھ کر یا تو ان کے ماخذ سے کام نکالا ہے یا لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ زمانہ وہ ہے جب فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان کے طور پر مستعمل تھی (اردو نے ۱۸۳۴ء میں سرکاری زبان کا درجہ حاصل کیا تھا) عام طور پر فارسی کتابوں کے درس دیئے جاتے تھے۔ خط و کتابت زیادہ تر فارسی ہی میں ہوتی تھی ان حالات میں فارسی کی تلخیص یا ترجمے کوئی زیادہ مشکل کام نہ تھے اس کے برعکس عربی اپنی تمام مشکلات کے ساتھ اس وقت بھی ایسی

زبان کا درجہ رکھتی تھی جسے دوسری زبان میں منتقل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر "اخوان الصفا" جیسی نری اخلاقی کتاب کے خطبات تو اور بھی مشکل چیز تھے لیکن اکرام علی کے ترجمے کا لفظ لفظ اس کی منھ بولتی شہادت ہے کہ انھوں نے ان دشواریوں اور مشکلات پر ایک مشاق زباندان کی حیثیت سے قابو پایا۔ اور یہ ترجمہ ترجمے کے فنکارانہ حدود کے اندر رہ کر اتنا شگفتہ سلیس اور عام فہم کیا ہے جسے نہ تو میر امن کی سلاست اور روانی کے معیار سے گرایا جا سکتا ہے نہ حیدر بخش حیدری کی عام فہم عبارتوں کے مقابلہ میں سبک و کمتر قرار دیا جا سکتا ہے۔ مظہر علی ولا ہوں یا میر بہادر علی حسینی۔ حفیظ الدین احمد ہوں یا نہال چند لاہوری حقیقت یہ ہے کہ اکرام علی اپنے ان تمام معاصرین سے اگر آگے نہیں بڑھ سکے تو ایک قدم بھی پیچھے نہیں رہے مولوی محمد یحییٰ تنہا نے ایک کامیاب نقاد کی حیثیت سے اکرام علی کے طرز نگارش کا جو تجزیہ کیا ہے یقیناً وہ ایک قیمتی تنقید کا درجہ رکھتی ہے۔ تنہا نے "اخوان الصفا" کی کچھ عبارتوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے۔

"مندرجہ بالا عبارت سے ہرگز ترشح نہیں ہوتا کہ یہ کتاب کا ترجمہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مولوی اکرام علی عالم و فاضل تھے۔ روانی اور برجستگی ان کے قادر الکلام ہونے کی دلیل ہے۔ وہ عربی اور اردو دونوں میں ماہر تھے ورنہ ایسا پاکیزہ ترجمہ کرنا بہت دشوار ہے یہ رسالہ تو اپنی خوبیوں کی وجہ سے ضرور قابل تعریف ہے لیکن اس کے مضامین کو اس خوبی سے بیان کر دینا بھی تصنیف سے الگ بھگ ہے۔ اس رسالے کا اقتباس جہاں اس بنا پر کیا گیا ہے کہ اس کا پورا نقشہ ناظرین کے سامنے آ جائے وہاں اس کی اردو عبارت نے بھی اس امر کی سفارش کی کہ اس کا طویل انتخاب کیا جائے تاکہ قارئین اس سے دل شاد ہوں اور ان کو پڑھ کر حظ حاصل ہو۔ میر شیر علی افسوس

نے "آرائش محفل" کے نام سے جو ترجمہ خلاصۃ التواریخ کا کیا ہے اس میں یہ بات نہیں پائی جاتی حالانکہ یہ ترجمہ واقعی ترجمہ ہے یعنی لفظی ترجمہ بھی ہے اور بامحاورہ بھی۔ برعکس اس کے افسوس نے ملخص کیا ہے اور جہاں کہیں چاہا اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا ہے۔ لیکن مولوی اکرام علی نے اپنی طرف سے عربی عبارت کے خلاف کوئی لفظ نہیں گھٹایا یا بڑھایا۔

بیشک بعض کھانوں اور مٹھائیوں کے نام ایسے ہیں جن سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید انھوں نے اصل کا ترجمہ کرتے وقت بڑھا دیے ہوں لیکن مضمون یا خیال میں کوئی اضافہ اپنی طرف سے نہیں کیا اگر اصل عربی رسالہ ہم کو مل جاتا تو ہم تیقن کے ساتھ اس امر کا فیصلہ دو ٹوک کر دیتے۔ بہرحال افسوس کی عبارت سے مولوی اکرام علی کی تحریر بہت بہتر ہے خواہ لفظی ترجمہ ہو یا نہ ہو۔ علمی زبان کا امروز ہے اور شگفتہ ہے۔ لطف یہ ہے کہ آجکل کی تحریرات اور تصنیفات کے مشابہ ہے۔ اب اردو زبان کی تصنیفات کا دَور چہارم ہے اور یہ ڈیڑھ سو برس کی زبان ہے لیکن بہت کم فرق ہے اور غلط یا متروک الفاظ کہیں نہیں ہیں۔ الغرض یہ ترجمہ بھی ایک نمونہ ہے جو ہمارے مترجمین کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔" (صفحہ ۱۷۶ اور ۱۷۷ سیر المصنفین

جلد اول)

پروفیسر سید محمود (عثمانیہ) کی ناقدانہ رائے بھی کچھ تنہا سے ملتی جلتی ہے لیکن ان کا خیال ہے کہ میر بہادر علی حسینی کی طرح اکرام علی کی زبان میں محاورات کی چاشنی نہیں ہے۔ یہ اعتراض کسی حد تک صحیح کہا جا سکتا تھا اگر "اخوان الصفا" ایک عربی کتاب کا ترجمہ نہ ہوتی۔ محاورات اور تمثیلات کا استعمال یقیناً عبارت میں ایک شگفتگی روانی سلاست اور چاشنی پیدا کر دیتی ہے لیکن "اخوان الصفا" جیسے خشک موضوع

میں محاورات کی بھرمار اسے ترجمہ کی بہت سی بنیادی خوبیوں سے محروم کر دیتی۔ "اخوان الصفا" میں جگہ جگہ تمثیلات اور محاورات استعمال کیے گئے ہیں لیکن ان کے محل استعمال میں کلائمیکس (CLIMEX) کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔

"اس نے جواب دیا کہ میں وہاں کس طرح سے جاؤں۔ ڈیل ڈول میرا بدسلیقہ، پیٹھ کبڑی۔ صورت پینٹ زدن۔ ایسا نہ ہو کہ وہاں میری ہنسی ہو۔"

ایک دوسری مثال ——

"کیا کریں ہم ناچار ہو کر جنگل و صحرا میں بھاگے پھر بھی ان صاحبوں نے کسی طرح پیچھا نہ چھوڑا۔ کن کن حیلوں سے پھندے اور جال لے کر در پے ہوئے۔ اگر دو چار "تھکے ماندے" کہیں ہاتھ لگ گئے ان کا احوال نہ پوچھیے کہ "باندھ چھاند" کرتے آتے ہیں۔"

محاورات اور تمثیلات کی ایسی ہی مثالیں "اخوان الصفا" میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں لیکن اردو محاورات کی بھرمار نہیں ہے کیونکہ یہ کتاب ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے۔ "اخوان الصفا" کی سلاست اور روانی کے بارے میں پروفیسر سید محمد نے لکھا ہے۔

"ان کا طرز بیان بالکل آسان اور عام فہم تھا انھوں نے اپنے افسر اعلیٰ کے حکم سے ..... مناظرہ جیسے دقیق مضمون کو بالکل سہل اور سلیس کر دیا ہے اگرچہ اس میں سوا سو برس پہلے کے بعض مروجہ الفاظ جواب متروک ہو گئے ہیں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں لیکن عبارت تعقید سے بالکل پاک ہے جیسا کہ مؤلف نے دیباچہ میں بیان کر دیا ہے وہ تمام دقیق علمی اصطلاحات و خطبات کو خارج کر کے نفس مضمون کو سلیس اور صاف زبان میں بیان کرتے ہیں اور مناظرہ میں قصہ کہانی کا لطف پیدا کر دیتے ہیں اور یہ اس کی خاص خوبی ہے اگر وہ اس کو اس قدر سلیس اور عام فہم نہ کرتے تو مولوی امانت اللہ کے ترجمہ "اخلاق جلالی"

کی طرح یہ کتاب بھی طاق نسیاں کی نذر ہو جاتی اور اس کو ہرگز وہ مقبولیت حاصل نہ ہوتی جو اس نے اپنی پہلی اشاعت کے ساتھ ہی پیدا کر لی تھی۔ میر بہادر علی حسینی کی طرح ان کی زبان میں بھی محاورہ کی چاشنی نہیں مگر علمی مباحث اور عقلی دلائل میں جو سنجیدگی ہونی چاہیے اس کا لحاظ کر کے ان کا طرز بیان کافی دلچسپ ہے ہندی اور عربی کے دقیق اور غیر مانوس الفاظ سے بھی احتراز کیا گیا ہے اور باوجود عربی کے اچھے عالم ہونے کے ثقیل الفاظ سے اجتناب کر کے اُردو کے مروجہ الفاظ و تراکیب کو ترجیح دی ہے اور جہاں تک ہو سکا ہے سیدھی سادی زبان میں خیالات ظاہر کر دیے ہیں۔“

(صفحہ ۲۳۷ ”ارباب نثر اردو“ مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سنہ ۹۳۶ء)

”غلط العوام“ صحیح ہو یا نہ ہو! اگر یہ خیال تو حقیقتاً صحیح نہیں ہے کہ اُردو نثر کی داغ بیل میرامن نے ڈالی۔ اس سلسلہ میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیے کہ ”فورٹ ولیم کالج“ کے تمام نثار نے اردو نثر کو ترقی یافتہ نثر کا رنگ روپ دینے میں برابر کا حصہ لیا ہے۔ کسی کی کتاب چند سال پہلے سامنے آگئی کسی کی کچھ دنوں بعد چھپی اس سے ارباب فورٹ ولیم کالج کی اجتماعی جد و جہد میں کسی قسم کے تقدم یا تاخر کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے اپنے اسلوب بیان کے لحاظ سے اکرام علی کا طرز نگارش ترجمہ کی ”حد بندیوں“ کے باوجود اتنا ہی عام فہم سلیس اور با محاورہ ہے جتنا کہ ان کے دوسرے معاصرین کا بیان کیا جاتا ہے۔ ”اخوان الصفا“ کے ترجمہ کو آج پورے ڈیڑھ سو سال گذر چکے ہیں اردو کے اسلوب نگارش میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو چکی ہے لیکن کہیں کہیں تو اکرام علی کے انداز تحریر سے یہ پتہ لگانا دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ تحریر ڈیڑھ سو برس اُدھر کی اردو ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

”بعد اس کے بادشاہ نے سامنے دیکھا کہ طوطا ایک درخت کی شاخ پر بیٹھا ہوا باتیں سنتا ہے۔ پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا میں شکاری جانوروں کا وکیل ہوں مجھ کو ان کے بادشاہ عنقا نے بھیجا ہے۔ بادشاہ نے کہا وہ کہاں رہتا ہے؟ اس نے عرض کیا۔ دریائے شور کے جزیروں میں بلند پہاڑوں پر رہتا ہے۔ وہاں کسی بشر کا گذر نہیں ہوتا اور کوئی جہاز بھی وہاں تک نہیں جا سکتا۔ فرمایا اس جزیرے کا حال بیان کر۔ اس نے کہا زمین وہاں کی بہت اچھی ہے آب و ہوا معتدل چشمے خوشگوار انواع و اقسام کے درخت میوہ دار۔ حیوانات طرح طرح کے بیشمار۔ بادشاہ نے کہا عنقا کی صورت بیان کر۔ کہا ڈیل ڈول میں سب طائروں سے بڑا ہے۔ اُڑنے میں قوی پنجے اور منقار سخت۔ بازو نہایت چوڑے چکلے۔ جس وقت ان کو ہوا میں حرکت دیتا ہے جہاز کے بادبان معلوم ہوتے ہیں۔ دُم لمبی اُٹھنے کے وقت حرکت کے زور سے پہاڑ ہل جاتا ہے۔ ہاتھی گینڈے وغیرہ بڑے بڑے جانوروں کو زمین سے اُٹھائے جاتا ہے۔“

اکرام علی کے معاصرین

عنوانات

صفحہ

چند ہم وطن معاصرین

اکرام علی کی زندگی کا بڑا حصہ وطن سے باہر گذرا۔ وطن سے برائے نام نسبت رہ گئی تھی پھر بھی انھوں نے اپنے وطن سے کسی قسم کا قطع تعلق کبھی نہیں کیا۔ بیوی بچے ہمیشہ وطن ہی میں رہے۔ خاندان کے تمام افراد اور دوستوں سے ہمیشہ ہم وطنی کے مخلصانہ تعلقات قائم رکھے سال دوسرے برس وطن ضرور آتے اور مہینوں قیام رہتا۔ میرے بزرگوں کو اپنے بزرگوں سے جو روایات پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اکرام علی کے سیتاپور پہنچنے پر یہاں کی ادبی اور علمی سرگرمیوں میں ایک زندگی کی لہر دوڑ جایا کرتی تھی جتنے دنوں ان کا قیام سیتاپور میں رہتا ہم عمر احباب کی نشست انھیں کے یہاں رہتی۔ کبھی کبھی یہ پارٹی دیہاتی زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے ان مختلف دیہاتوں میں چلی جاتی جو ان لوگوں کی زمینداری میں شامل تھے۔ مشاعرے۔ علمی اور ادبی مباحثے اور مذہبی محفلیں اس دور کی ستھری زندگی کے ایسے یادگار پہلو ہیں جن کا صحیح تصور بھی آج ہم نہیں کر سکتے۔

سیتاپور اس زمانے میں ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ پکے پل کے قریب شاہانِ اودھ کی قائم کی ہوئی ایک چھوٹی سی چھاؤنی تھی جس کا نام سعادت گنج تھا ـــ اور اسی کے پورب طرف لب دریا ایک سرکاری تحصیل (جس میں اب میونسپلٹی کا بالا ہے) نظامت خیرآباد میں تھی چکلے دار (جسے کلکٹر یا صوبیدار کہنا چاہئے) وہیں رہتا تھا۔ سیتاپور میں صرف ایک سرکاری عہدہ دار رہا کرتا تھا جسے "فوجدار" کہتے تھے۔ خود

میرے مکان کے مشرق جانب تھوڑی دور پر "محکمۂ قضا" کی ایک عدالت تھی جہاں شہر کا "قاضی" بستی کے فیصلے کیا کرتا تھا۔

اکرام علی کا مکان تو اب سمٹ سمٹا کر چند چھوٹے چھوٹے مکانات کا مجموعہ رہ گیا ہے کسی زمانے میں یہ ایک شاندار محل تھا جس میں چھوٹی اینٹوں کے بنے ہوئے متعدد مکانات حویلیاں اور مسجد تھی ـــ اور یہ سارا محلہ شیخرائے جو اب تقسیم ہو کر کئی محلوں میں بٹ گیا ہے اکرام علی کے خاندان کی موروثی زمینداری تھی۔ خیرآباد کی طرح اکرام علی کے زمانے کا سیتاپور بھی علمی اور ادبی حیثیت سے ایک خاص اہمیت رکھتا تھا جہاں کئی چھوٹی بڑی علمی درسگاہیں بھی تھیں اور بچوں کے ابتدائی مکتب بھی جن میں ہندو اور مسلمان یکجائی طور پر فارسی اور عربی علوم حاصل کیا کرتے تھے۔ اکرام علی کی طرح ان کے معاصرین کے حالات و علمی کارنامے بھی گمنامی کی گہری نیند سو چکے ہیں پھر بھی ایک آدھ جگہ تذکروں میں ان کے مختصر حالات ضرور مل جاتے ہیں خاندانی روایات کا سہارا لے کر انھیں قابل ذکر ہستیوں میں سے چند معاصرین کا تذکرہ پیش کر رہا ہوں۔

مقرب۔ سید مقرب حسین نام مقرب تخلص۔ رضوی سادات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بزرگ قصبہ زید پور (ضلع بارہ بنکی) سے آکر سیتاپور میں آباد ہوئے۔ شاہانِ اودھ کے ابتدائی دور حکومت میں اس خاندان کو اچھا عروج حاصل تھا۔

مقرب میر مستحسن خلیق کے شاگرد تھے اور میر انیس ان کے استاد بھائی۔ میر انیس کی طرح انھوں نے بھی زندگی بھر مرثیہ۔ سلام منقبت اور مدح وغیرہ کے سوا کبھی غزل کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میر انیس کے عروج سے پہلے ان کے مرثیے سیتاپور کی مجالس میں پڑھے جاتے تھے مگر جب انیس کے مرثیوں نے "مرثیہ" کو اوج کمال پر چمکایا

تو ان کے سلام و مرثیہ بھی متروک ہو گئے۔

۱۲۵۹ھ میں (اکرام علی کی وفات کے تین سال بعد) بمقام سیتاپور محسلہ قضیارہ وفات پائی اپنے پائین باغ میں دفن کئے گئے ایک صاحب نے تاریخ وفات کہی۔! بہ جنت رسیدند مقرب حسین

۱۲۵۵ھ

کسی نقاد فن نے اعتراض کیا کہ اس میں تو چھ عدد کم ہیں۔ کہنے لگے۔ ۶ عدد کی کمی بھی کوئی کمی ہے "و بہ جنت رسیدند مقرب حسین" کر دیا

۱۲۵۹ھ

نمونہ کلام ———

رونا غمِ حسینؑ میں ہے موجبِ نجات
اس پر سند حدیث نبیؐ "من بکا" ہوئی

اندیشہ آخرت کا مقرب نہ کر ذرا
تیرے حنوط کے لئے خاکِ شفا ہوئی

مشہدی۔ سید محمد آصف نام مشہدی تخلص۔ پردادا سید محمد خلیل عرف شاہ خلیل الرحمان اورنگ زیب عالمگیر کے دورِ حکومت میں "قندھار" کی منصب قضا پر فائز تھے۔ جب یہ خاندان سیتاپور پہنچا تو مغل دربار کے تمام اعزاز و اکرام اس کے ساتھ تھے۔

"مشہدی" رانی لکشمی بائی (جھانسی کی رانی) کے میکے میں بمقام "بٹھور" باجی راؤ کے ذی عزت ملازم تھے انقلاب ۵۷ء سے پہلے ۱۲۶۰ھ میں سیتاپور آ گئے تھے یہیں وفات پائی اور اپنے خاندانی قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔

فارسی کے خوش فکر و خوش گو شاعر تھے اردو کلام میری نظر سے نہیں گذرا۔ ایک آدھ سلام ان کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن میں خود اس کی تصدیق ابھی تک نہیں کر سکا۔ مشہدی کی پرپوتی افسر الشعراء آغا شاعر دہلوی مرحوم کو منسوب ہوئی تھیں جن کی اولاد پاکستان میں موجود ہے۔

تذکرہ "صبح گلشن" میں ان کا صرف ایک شعر ملا ہے۔

مرا بکوئے تو رفتن چہ مشکل افتاد است
بہر طرف کہ نظر می کنم دل افتاد است

ڈاکٹر جان گلکرائسٹ

(Dr. Ghan Gelchrist)

اسکاٹ لینڈ کا یہ مشرق پسند و مشرق سرشت ادیب ۱۷۵۹ء میں بمقام "اڈنبرا" پیدا ہوا۔ ماں باپ نے "جان برتھ وک گلکرائسٹ" نام رکھا لیکن دنیائے ادب میں یہ صرف ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ مقامی اسکولوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے "اڈنبرا" کے "جارج ہیوٹ اسپتال" میں ڈاکٹری اور طب کی تعلیم مکمل کی۔ "ایسٹ انڈیا کمپنی" تیزی کے ساتھ ہندوستان میں اپنے قدم جماتی چلی جا رہی تھی اور یورپ کے پڑھے لکھے نوجوانوں کی کھیپ ہندوستان کے ساحلوں پر برابر پہنچ رہی تھی۔ گلکرائسٹ بھی کمپنی کے زمرۂ ملازمین میں شامل ہو کر بحیثیت "ڈاکٹر" ہندوستان پہنچے اور ان کا تقرر ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے بمبئی کے ایک اسپتال میں کر دیا گیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے قائم کیا تھا۔ ہندوستان پہنچ کر گلکرائسٹ نے سب سے پہلی چیز جو بات محسوس کی وہ غیر ملکی تمدن، معاشرت اور زبانوں سے ناواقفیت کا مسئلہ تھا چنانچہ اپنی مشہور لغت کے دیباچے میں انھیں تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"میں نے ہندوستان آنے کے بعد شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ جب تک میں ہندوستان کے مقامی باشندوں کی اس زبان سے واقف نہ ہو جاؤں جو یہاں کی عام زبان ہے اس وقت تک نہ تو مجھے خود ہندوستان میں زندگی بسر کرنے کا لطف حاصل ہوگا اور نہ ہی ان فرائض سے عہدہ برآ ہو سکوں گا جن کی انجام دہی کے لئے ہی ہندوستان بھیجا گیا ہوں۔"

(دیباچہ انگریزی ہندوستانی لغت [illegible]ء لغایۃ ۱۷۹۶ء)

کچھ دنوں کے بعد گلکرائسٹ کا تبادلہ بمبئی سے کلکتہ کر دیا گیا۔ انھوں نے پہلی بار کمپنی کے ارباب حل و عقد کو یہ مشورہ دیا کہ اگر تمھیں ہندوستان میں اپنے کاروبار کو ترقی دینا ہے تو سب سے پہلے یہاں کے عوام سے قریب تر پہنچنے کی کوشش کرو۔ اور تمھاری یہ کوششیں اسی وقت کامیاب ہو سکیں گی جب تم یہاں کے علوم اور زبانوں کو اپنا کر ہندوستانی تہذیب و معاشرت سے واقفیت حاصل کرو گے گلکرائسٹ نے ہندوستانی علوم اور زبانوں کے عروج و زوال کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اس لئے انھیں اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی زیادہ دقت پیش نہیں آئی کہ ہندوستان کی تمام مروجہ زبانوں میں اردو ہی ایک ایسی ہونہار اور ترقی کرنے والی زبان ہے جسے "ہندوستان گیر" زبان کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

شروع شروع میں تو کمپنی کے ارباب اقتدار نے گلکرائسٹ کی اس تجویز کو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن ملک کے بدلتے ہوئے حالات نے جلد ہی انھیں اپنی اس غلطی کا احساس کر دیا۔ پہلے گورنر جنرل وارن ہسٹنگز انگلستان جا چکے تھے ان کی جگہ پر "سر جان میکفرسن" نے قائم مقام گورنر جنرل کی حیثیت سے چارج لیا تھا۔ وہ پہلے ہی گلکرائسٹ کی اس تجویز کے حامی تھے چنانچہ انھوں نے ۱۷۸۵ء میں گلکرائسٹ کو ایک لمبی رخصت دے دی کہ وہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں جا کر مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کا مطالعہ کریں۔

۱۷۸۵ء میں گلکرائسٹ اپنے مشن پر روانہ ہوئے۔ کلکتہ سے روانہ ہو کر مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے فیض آباد پہنچے جہاں نواب آصف الدولہ اپنے باپ شجاع الدولہ کی جگہ پر تخت نشین ہو چکے تھے۔

گلکرائسٹ نے کئی سال تک فیض آباد میں مقیم رہ کر اردو اور فارسی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہاں کی تہذیب و معاشرت کو قریب سے دیکھنے کے لئے انھوں نے ہندوستانی لباس اختیار کیا اور اپنے آپ کو ہندوستان کی تہذیب و معاشرت میں اس طرح سمو لیا جیسے ان کا گوشت پوست ہندوستان ہی کے خاک و خمیر کا ورثہ تھا۔

اس وقت کی سرکاری اور مجلسی زبان فارسی تھی، اردو زبان عام بول چال سے آگے نہیں بڑھی تھی اردو اسکول یا مدارس کا ذکر ہی کیا۔ عام طور پر باقاعدہ اردو پڑھانے والے استاد بھی نہیں ملتے تھے۔ گلکرائسٹ نے جیسے کیسے چند سال فیض آباد میں گزارے جو کچھ حاصل کر سکے حاصل کیا لیکن علم کی پیاس نہ بجھی فیض آباد سے لکھنؤ آئے۔ پھر یہاں سے بنارس پہنچے اور آخری منزل دلی کو قرار دیا۔ سفر وسیلۃ الظفر راس آیا اور وہ اس حد تک ضرور مطمئن ہو گئے کہ جس مشن کے لئے در در کی خاک چھانی اور صعوبات سفر برداشت کیں وہ اگر پورے طور پر کامیاب نہیں ہوا پھر بھی نتیجہ خاطر خواہ ضرور نکل آیا۔

سنہ ۱۷۹۸ء میں لارڈ ولزلی LORD WELLESLEY گورنر جنرل بن کر ہندوستان پہنچ چکے تھے گلکرائسٹ کی تجویز ان کے سامنے پیش ہوئی انھوں نے ایسٹ کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹر کو لکھا قریب ڈیڑھ دو سال کاغذی گھوڑے دوڑتے رہے۔ بالآخر فورٹ ولیم کالج کی منظوری آئی اور سنہ ۱۸۰۰ء میں یہ کالج قائم کیا گیا۔

ظاہر ہے اس کالج کے لئے جان گلکرائسٹ سے زیادہ موزوں و مناسب کوئی دوسرا آدمی ہو ہی نہیں سکتا تھا چنانچہ انھیں کا تقرر بحیثیت پرنسپل کیا گیا اور انھوں نے محض چار سال کے اندر کالج اور شعبہ تصنیف و تالیف کی بنیادیں اتنی مضبوط کر دیں کہ ان کے چلے جانے کے بعد بھی کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹر باوجود شدید مخالفت کے پورے پچاس سال تک اسے ختم کرنے کا تصور بھی نہ کر سکا۔

پچھلے بیس پچیس سال متواتر گلکرائسٹ نے جو انتھک دماغی اور جسمانی محنت کی تھی اس کی وجہ سے ان کی تندرستی بہت خراب ہو گئی اور سنہ ۱۸۰۴ء میں وہ اس قدر مجبور ہو گئے کہ انھیں قبل از وقت ریٹائر ہونے کی درخواست کرنا پڑی جسے کمپنی کے ذمہ داروں نے ایک معقول سالانہ وظیفے کے ساتھ منظور کیا اور وہ اپنے وطن "اسکاٹ لینڈ" واپس ہو گئے۔

وطن پہنچ کر بھی گلکرائسٹ کے ادبی اور تصنیفی ذوق نے انھیں چین نہ لینے دیا مگر یہاں کتابوں کا ایسا فقدان تھا کہ وہ کسی طرح یہاں رہ کر اپنے کام کو جاری نہیں رکھ سکتے تھے اس لئے مجبوراً انھیں لندن منتقل ہونا پڑا جہاں انھوں نے سنہ ۱۸۱۶ء میں مشرقی علوم کی ایک درسگاہ قائم کی جس میں ایسے لوگوں کو تعلیم دی جاتی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی "سمندر پار" ملازمتوں میں جانا چاہتے تھے۔

سنہ ۱۸۱۸ء میں خود کمپنی نے اپنی طرف سے ایک ایسا ہی اسکول "لیسٹر اسکوائر" میں کھول دیا اور گلکرائسٹ کی خدمات اس ادارے کے لئے حاصل کر لیں لیکن کمپنی اس کام پر جو رقم صرف کر رہی تھی وہ اتنی کم رقم تھی جو اتنے بڑے کام کے لئے قطعاً ناکافی ثابت ہوئی اور کمپنی کا یہ ادارہ آخری ہچکیاں لے کر ختم ہو گیا۔ اور گلکرائسٹ کی خدمات بھی!

گلکرائسٹ اب کافی بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے۔ لندن میں جو اہم کام انھوں نے شروع کر رکھا تھا اپنے معتمدین کے سپرد کر کے وطن چلے گئے۔ بیماریوں نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا علاج کے لئے فرانس پہنچے۔ لیکن موت کی دوا وہاں بھی نہ ملی۔ ۹ جنوری سنہ ۱۸۴۱ء کو ۸۲ سال کی عمر میں وہیں پیرس میں وفات پائی۔

جان گلکرائسٹ جنھوں نے تقریباً نصف صدی تک مسلسل تصنیف و تالیف کا کام کیا نہ محض ایک اچھے مصنف تھے بلکہ اردو کے "علم قواعد" کے بہترین ماہر بھی تھے

چنانچہ اُنھوں نے اُردو کے قواعد پر کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں ان کی سب سے زیادہ مشہور کتاب "انگریزی ہندوستانی لغت" ایک شاہکار تسلیم کی گئی ہے یہ لغت متواتر نو سال کی سعی و کوشش سے مرتب کی گئی تھی اس کا پہلا ایڈیشن ۱۷۹۸ء میں شائع ہوا اور دوسرا ایڈیشن کپتان روبک کے تعاون و اشتراک سے کچھ ترمیم و اضافے کے بعد مع فرہنگ ۱۸۱۰ء میں انگلستان سے شائع کیا گیا۔ تیسرا ایڈیشن ۱۸۲۵ء میں شائع ہوا۔

گلکرائسٹ کی لکھی ہوئی کتابوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ "ہندوستانی علم اللسان" اردو لسانیات پر ایک دلچسپ اور سیر حاصل تصنیف ہے۔ ۱۸۱۰ء میں اڈنبرا سے پھر ۱۸۲۵ء میں لندن سے شائع ہوئی۔

۲۔ اُردو کی صرف و نحو۔ مذکورہ بالا کتاب کے سلسلہ کا تیسرا حصہ۔ فورٹ ولیم کالج کے نصاب تعلیم میں شامل تھا۔ میر بہادر علی حسینی نے ۱۸۰۳ء میں انھیں رسائل کا خلاصہ "اردو رسالہ گلکرائسٹ" کے نام سے ترتیب دیا۔

۳۔ مشرقی زباندان (یعنی ہندوستان کی مقبول خاص و عام زبان کا آسان مقدمہ) اُردو انگریزی الفاظ کی ایک فرہنگ اور ضمیمہ آلات جنگ (اردو) کے ساتھ پہلی بار کلکتہ سے ۱۷۹۸ء میں پھر ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔

۴۔ اُردو زبان پر مختصر مقدمہ۔ (مندرجہ بالا کتاب کا خلاصہ ہے) ۱۸۲۰ء میں بمقام کلکتہ چھپی۔

۵۔ ہندی کی آسان مشقیں۔ فورٹ ولیم کالج کے طلبار کو امتحانات کی سہولتیں پہنچانے کے لیے ۱۸۰۱ء میں شائع کیا گیا۔

۶۔ فارسی افعال کا جدید نظریہ۔ پہلی بار ۱۸۰۱ء میں پھر ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔

۷۔ اجنبیوں کے لئے رہنمائے اُردو۔ نو وارد انگریزوں کو اُردو سکھانے کے لئے

پہلی مرتبہ ۱۸۰۲ء میں کلکتہ سے شائع کی گئی اس کے بعد ۱۸۰۸ء میں لندن سے۔ تیسرا ایڈیشن بھی ۱۸۲۰ء میں لندن ہی سے شائع ہوا۔

۸۔ بیاض ہندی۔ ہندوستانی مصنفین کی کتابوں سے معیاری مضامین کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اس انتخاب میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کے ساتھ میر عبداللہ مسکین بھی ان کے شریک کار تھے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۰۲ء میں طبع ہوئی۔

۹۔ علمی خاکے۔ اُردو الفاظ کی قرأت اور صحیح تلفظ پر پہلی کتاب۔ ۱۸۰۲ء میں پہلی مرتبہ چھپی۔

۱۰۔ ہندی الفاظ کی قرأت۔ مذکورہ بالا رسالہ کا دوسرا حصہ سمجھنا چاہیے جس میں ہندی الفاظ کے صحیح تلفظ پر اصولی بحث کی گئی ہے ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔

۱۱۔ اتالیق ہندی۔ کالج کے مختلف اہل قلم حضرات سے آسان اُردو میں مضامین لکھوا کر ترتیب دئے گئے ہیں اس کے تین ایڈیشن ۱۸۰۳ء تا ۱۸۲۱ء شائع ہوئے۔

۱۲۔ ہندی عربی آئینہ۔ عربی کے ایسے الفاظ کی جدولیں جو اُردو زبان سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۸۰۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔

۱۳۔ مکالمات انگریزی و ہندوستانی۔ انگریزوں کو اُردو بول چال سکھانے کے لیے مرتب کیا گیا تھا کلکتہ۔ لندن اور اڈنبرا سے اس کے بہت سے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

۱۴۔ مشرقی قصے۔ انگریزی۔ فارسی اور سنسکرت زبان کے چھوٹے چھوٹے قصوں کا دلچسپ مجموعہ ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔

۱۵۔ ہندی داستان گو۔ اردو اور دیوناگری رسم الخط پر بحث کی گئی ہے ۱۸۰۲ء میں چھپی۔

سید حیدر بخش حیدری

سید حیدر بخش نام۔ حیدری تخلص۔ سید ابوالحسن دہلوی کے صاحبزادے تھے۔ آبا واجداد نجف اشرف (عراق) سے ہندوستان آکر دلی میں سکونت گزیں ہوئے۔ حیدری کی کمسنی اور کم عمری میں ان کے والد سید ابوالحسن کو کشاکش روزگار سے تنگ آکر دلی چھوڑنا پڑی۔ اہل و عیال کو لے کر بنارس پہنچے اور یہیں ٹھہر گئے۔

نواب علی ابراہیم خاں خلیل اس زمانے (عہد وارن ہسٹنگز) میں بنارس کے ناظم عدالت تھے حیدری کی ابتدائی تعلیم انھیں کے سایۂ رحمت میں ہوئی۔ کچھ دنوں قاضی عبدالرشید کی درسگاہ علم سے بھی فیض علمی حاصل کیا۔ فقہ حدیث اور دوسرے علوم دینی مولوی غلام حسین غازی پوری کی خدمت میں تکمیل پائے۔ اور تحصیل علم نواب علی ابراہیم خاں خلیل نے اپنے یہاں عدالت ہی میں کسی جگہ پر تقرر کرا دیا۔

اٹھارہویں صدی کے آخری زمانے میں کلکتہ کا سفر کیا۔ تقریب سفر کے طور پر ایک کہانی "قصہ مہر و ماہ" کے نام سے لکھی اور ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی خدمت میں پیش کی۔ گلکرائسٹ نے اس کتاب کو بہت پسند کیا اور فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں جگہ دے دی۔

معلوم ہوتا ہے کہ حیدری کا تعلق صرف چند سال کالج سے رہا کیونکہ تاریخی واقعات اس کی تائید کرتے ہیں کہ وہ ۱۲۲۹ھ میں بنارس پہنچ چکے تھے جو ان کے لئے ایک وطن کی حیثیت رکھتا تھا۔

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے ڈاکٹر اسپرنگر نے حیدری کے ایک دوست منشی غلام حیدر کے حوالے سے حیدری کا سن وفات ۱۸۲۳ء قرار دیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے زمانۂ قیام میں حیدری نے حسب ذیل کتابیں لکھیں۔

حضرت امیر خسرو کی مشہور فارسی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" کا اردو ترجمہ ۱۲۱۴ھ میں کیا۔

سنسکرت کی ایک پرانی کتاب "شکا سپ تتی" (یعنی طوطے کی کہی ہوئی کہانیاں) جسے ۷۳۰ھ / ۱۳۳۰ء میں مولانا ضیاء الدین نخشبی نے فارسی کا جامہ پہنایا تھا چنانچہ اسی "طوطی نامہ" کا ایک فارسی خلاصہ ملا سید محمد قادری نے مرتب کیا۔

حیدری نے ۱۲۱۵ھ / ۱۸۱۰ء میں قادری کے اسی خلاصہ کا ترجمہ "طوطا کہانی" کے نام سے کیا۔

۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء میں حیدری نے ایک فارسی قصہ کو "آرائش محفل" کا روپ دیا جو اس فارسی قصے کا لفظاً بہ لفظاً ترجمہ نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی طبعزاد کہانی بن گئی ہے۔

حضرت نظامی گنجوی کی مشہور فارسی مثنوی "ہفت پیکر" کے رنگ میں حیدری نے ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں "مثنوی حیدری" لکھی تھی جو شائع نہ ہو سکی اس کا ایک قلمی نسخہ لکھنؤ کے شاہی کتب خانے میں محفوظ تھا۔

محمد مہدی ابن محمد نصیر استرآبادی کی فارسی تاریخ "تاریخ جہاں کشائے نادری" کا اردو ترجمہ ۱۲۲۴ھ میں "تاریخ نادری" کے نام سے کیا لیکن یہ کتاب بھی شائع نہیں ہوئی۔

شہدائے اسلام کے ذکر میں ملا حسین واعظ نے جو "گل مغفرت" ہے۔ حیدری نے جگہ جگہ نظم و نثر کے اضافے کے ساتھ اس کا ترجمہ "گلشن شہیداں" کے نام سے کیا جو ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی ۱۸۴۵ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا گیا جو پیرس میں چھپا ہے یہ ترجمہ برٹ رائنڈ (BERT RiAND) نے کیا ہے۔ فارسی کی بہار دانش کا ترجمہ "گلزار دانش" کے نام سے کیا۔ اس قصہ کو

"سحرالبیان" کے طرز میں مرزا جان طپش نے بھی نظم کیا ہے۔ گلدستہ حیدری کے نام سے حیدری نے اپنے مضامین اور نظموں کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا جو حسب ذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

۱۔ مجموعہ مراثی

۲۔ مجموعہ حکایات

۳۔ دیباچہ قصہ مہروماہ

۴۔ قصہ لیلیٰ مجنوں

۵۔ غزلیات۔ قطعات اور متفرق نظمیں وغیرہ۔

حیدری کی دسویں کتاب تذکرہ "گلشن ہند" ہے۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ حیدری کے ایک دوسرے ہم عصر مرزا علی لطف نے تقریباً اسی زمانے میں جو تذکرہ لکھا تھا اس کا نام بھی "گلشن ہند" ہی ہے۔ حیدری نے اپنے تذکرہ کی وجہ تالیف میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے لکھتے ہیں کہ :۔

"جب میں کشتی میں سوار ہوکر بنارس سے ۱۲ رجب سنہ ۱۲۱۴ھ کو مرشد آباد اور وہاں سے کلکتہ جانے کا قصد رکھتا تھا راستہ میں غازی پور کے قریب میرے ایک قدیم دوست مرزا محمد علی دہلوی مل گئے وہ شاعری کا اچھا مذاق رکھتے تھے اور سفر میں ان کے ہمراہ شعرائے اردو کے چند دیوان تھے انھوں نے مجھ سے بہ اصرار تمام کہا کہ میں ایک تذکرۃ الشعرا لکھوں اور جس قدر دیوان ان کے پاس موجود تھے میرے حوالے کردیے چنانچہ میں نے ان کی تحریص و ترغیب سے یہ تذکرہ لکھا۔"

(صفحہ ۵۹ سیر المصنفین مطبوعہ عالمگیر پریس لاہور)

میر بہادر علی حسینی

سید عبداللہ کاظم کے صاحبزادے تھے دلی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف میں ہیڈ منشی تھے۔ ان کے حالات زندگی پر گمنامی کا کچھ ایسا گہرا پردہ پڑا کہ آج ڈیڑھ سو سال میں بھی ان کے حالات سامنے نہ آسکے۔ واقعات کی کڑیاں ملانے سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ میر امن دہلوی کے خاص دوستوں میں تھے اور میر امن انھیں کے توسل سے فورٹ ولیم کالج میں پہنچے۔

حسینی کی تصانیف میں اب تک چار کتابیں سامنے آئی ہیں۔

(۱) نثر بے نظیر۔ (۲) اخلاق ہندی (۳) تاریخ آسام (۴) رسالہ گلکرائسٹ۔

"نثر بے نظیر" میر حسن دہلوی کی مشہور مثنوی "سحرالبیان" کا نثری رنگ و روپ ہے جو سنہ ۱۸۰۲ء میں مکمل کی گئی تھی۔ اسی طرح "تاریخ آسام" شہاب الدین طالش (بن ولی محمد) کی فارسی "تاریخ آسام" کا عام فہم اردو ترجمہ ہے اور اس میں میر جملہ (سپہ سالار اورنگ زیب عالمگیر) کی اس مہم آسام کی تمام تفصیل پیش کی گئی ہے جو سنہ ۱۶۶۲ء میں کی گئی تھی۔ شہاب الدین طالش خود اس جنگ میں موجود تھا اس لئے اس کی تاریخی عظمت نہایت ہی اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ سنہ ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا تھا لیکن حسینی کا کیا ہوا ترجمہ بالکل نایاب و ناپید ہے۔ "اخلاق ہندی" حسینی کی تمام کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول کتاب ہے جس کا ماخذ دراصل فارسی کی مشہور کتاب "مفرح القلوب" ہے اور یہ "مفرح القلوب" پنڈت بشن شرما کی سنسکرت کتاب "ہرپادیشا" کی تلخیص بیان کی جاتی ہے یہ کتاب بھی فورٹ ولیم کالج کی طرف سے سنہ ۱۸۰۳ء میں شائع کی گئی تھی۔

میر امن دہلوی

میر امان نام۔ امن اور لطف تخلص۔ مگر شہرت میر امن کے نام سے پائی۔ دلّی کے رہنے والے تھے۔ احمد شاہ درّانی کے زمانے میں جب دلّی لُٹی تو شاہجہاں آباد کو خیر باد کہکر عظیم آباد پہنچے۔ فطری شاعر تھے ایک چھوڑ دو دو تخلص رکھے مگر کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا بقول فیلن۔ ”امن خود کہا کرتے تھے شاعری میرا پیشہ نہیں ہے نہ میں کسی شاعر کا بھائی۔ میری اُردو ٹکسالی اُردو ہے کیونکہ میں دلّی (شاہجہاں آباد) کا روڑا ہوں اور یہیں کا پروردہ یافتہ ہوں“ میر امن کے حالات زندگی سے عام طور پر تذکرے خالی نظر آتے ہیں۔ اپنا مختصر حال ایک جگہ خود لکھ گئے ہیں۔ سُن لیجئے!

”پہلے اپنا حال یہ عاصی پُر معاصی میر امن دلّی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجالاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدر دانی جتنی چاہیے فرماتے رہے جاگیر، منصب دار خدمات کی عنایات سے مالا مال اور نہال کر دیا اور خانہ زاد موروثی اور منصب دار قدیمی زبان مبارک سے فرمایا چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا جب ایسے گھر کی کہ سارے گھر اس کے سبب سے آباد تھے یہ نوبت پہنچی ظاہر ہے۔ عیاں را چہ بیاں؟ تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ درّانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی تباہی اُٹھا کہ ایسے شہر سے کہ جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے۔ جلاوطن ہوا اور ایسا جہاز کہ

جس کا ناخدا خدا تھا غارت ہوا۔ میں بیکسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے کئی برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پاؤں اُکھڑے۔ روزگار نے موافقت نہ کی عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوا۔ اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانہ کے زور سے آپہنچا۔ چندے بیکاری میں گذری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے لئے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہا جب وہاں اپنا نباہ نہ دیکھا۔ تب منشی میر بہادر علی کے وسیلے سے حضور جان گلکرائسٹ صاحب بہادر سے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے۔ چاہئے کہ دن کچھ بھلے آویں نہیں تو یہی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی بڑے چھوٹے پرورش پا کر دُعا اس قدر دان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔“

فورٹ ولیم کے زمانۂ ملازمت میں میر امن نے صرف دو کتابیں لکھیں ایک تو ”باغ و بہار“ دوسری گنج خوبی۔ اگرچہ مقبولیت ”باغ و بہار“ کو نصیب ہوئی ”گنج خوبی“ وہاں تک نہیں پہنچ سکی۔

باغ و بہار کا پہلا ایڈیشن فورٹ ولیم کالج نے ۱۸۰۳ء میں شائع کیا تھا اس کے بعد سے اب تک اُردو ہی نہیں مختلف زبانوں میں اس کے بہت سے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا اور یہ کتاب اردو زبان و ادب کا ایک قیمتی سرمایہ سمجھی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میر امن کی زبان میں کافی سلاست اور روانی پائی جاتی ہے لیکن سرسید کی یہ بات حلق سے نہیں اُترتی کہ میر امن اُردو نثر کے ولی اور

تیر ہیں۔ موازنہ اور مقابلہ کا سوال نہیں، زبان کی چاشنی اور محاورات کے صحیح استعمال امن کی ایک خصوصیت تھی مگر حیدری اور اکرام علی وغیرہ نے جن مشکل راہوں میں سلاست اور روانی کے دریا بہائے ہیں وہ اپنی جگہ پر میر امن کی زباندانی سے کم درجہ نہیں رکھتے۔

میر امن کی شہرت کے ساتھ ساتھ اُردو نقادوں نے امن کو بیجا تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے اور ڈاکٹر عبدالحق (بابائے اردو) نے تو "باغ و بہار" کے مقدمہ میں ان پر سرقہ کی "فرد جرم" تک لگا دی۔ لکھا ہے۔

"فارسی اور "نوطرز مرصع" کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "باغ و بہار" فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا آخذ "نوطرز مرصع" ہے۔ تعجب اس بات کا ہے کہ میر امن نے فارسی کتاب اور اس کے ترجمہ کا ذکر تو کیا مگر "نوطرز مرصع" کا ذکر صاف اُڑا گئے۔"

ڈاکٹر عبدالحق نے یہ الزام لگانے سے پہلے اگر "باغ و بہار" کا فورٹ ولیم ایڈیشن ملاحظہ فرما لیا ہوتا تو شاید ان کی یہ مشکل آسان ہو جاتی۔ "باغ و بہار" کے ابتدائی ایڈیشن میں سرورق پر یہ عبارت جلی حروف میں لکھی ہوئی ہے۔

"باغ و بہار" تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا۔ مآخذ اس کا نوطرز مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے۔ فارسی قصہ چہار درویش سے۔"

(صفحہ ۱۴۷۔ "اردو کی نثری داستانیں" مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان)

میر امن کے متعلق کسی تذکرے میں ایسی تفصیلات نہیں ملتیں جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ یہ کس زمانہ تک کالج کی ملازمت میں منسلک رہے اور کب وفات پائی۔

میرزا علی لطف

میرزا علی نام۔ لطف تخلص۔ سن ولادت کا پتہ کسی تذکرے سے نہیں چلتا البتہ ان کے خود بیان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے۔

"لطف تخلص۔ میرزا علی نام۔ راقم ہے اس چند اوراق پریشان کا۔ کہ مانند نامہ اعمال اپنے کے سیاہ کئے اور اسم گرامی والد بزرگوار کا کہ اس خاکسار کے کاظم بیگ خاں ہے۔ متوطن استرآباد۔ شجاعت بنیاد کے ہیں۔ ۱۱۵۲ھ میں نادر شاہ کے ساتھ شاہجہاں آباد میں تشریف لائے۔ اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے۔ کہ آپس میں معرفت ولائت کی تھی۔ مصدر عنایات بادشاہی ہوئے۔ اب آگے بیان امورات دنیوی باعث ہے طول کلام کا۔ اور وہ معاملہ دیکھا ہوا ہے خاص و عام کا۔ بہرحال غزل فارسی کے کہنے میں حضرت کو ید طولیٰ تھا۔ ہجری تخلص آپ کا تھا اس تذکرے میں اشعار ہندی کا التزام ہے۔ اسی سبب سے یہاں لکھا نہیں گیا آپ کا کلام ہے۔ اصلاح فارسی کی اس ہیچمدان کو آپ ہی کی جناب سے ہے اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے۔"

(صفحہ ۱۴۶۔ ۱۴۷ تذکرہ گلشن ہند)

بعض تذکروں میں انھیں میر تقی میرؔ کا شاگرد لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ پروفیسر سید محمد نے "ارباب نثر اردو" میں لکھا ہے۔

"جس زمانے میں انھوں نے تلاش معاش میں دہلی کو خیرباد کہا اور سفر کا ارادہ کیا۔ لکھنؤ میں کچھ زیادہ قدر افزائی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی اس لئے حیدرآباد جانے کا تہیہ کیا۔ وہ گلشن ہند میں مرزا جواں بخت ولی عہد شاہ عالم بہادر کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:۔

"شہزادے نے ان کو اپنے ہاں حاضر ہو کر کلام سنانے اور اپنے مشاعرے میں غزل پڑھنے کا حکم دیا۔ یہ عذر و معذرت کرنے لگے مگر ان کا عذر پذیرا نہ ہو اور شہزادے کے پے در پے تقاضوں پر بالآخر نواب آصف الدولہ کے ایما سے حاضر ہونا پڑا۔ شہزادے نے قدر افزائی کی اور اشعار سن کر داد دی۔"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ لطف نے لکھنؤ کی صحبتیں بھی دیکھی تھیں مگر غالباً وہاں ان کی ایسی قدر دانی نہیں ہوئی جیسی وہ چاہتے تھے اور ہوتی بھی تو کیسے۔ آصف الدولہ کا آخری زمانہ اور لکھنؤ میں شعراء کی کثرت۔ یہ بیچارے کس گنتی شمار میں۔ پھر بھی جو کچھ ہوا غنیمت تھا۔ الغرض لطف نے حیدرآباد کے سفر کا ارادہ کیا اور چند روز عظیم آباد پٹنہ میں گذار کر بنگال کی سیاحت کرتے ہوئے دکن آنا چاہتے تھے کہ کلکتہ میں ڈاکٹر گلکرائسٹ سے ملاقات ہوئی اور ان کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں تذکرہ گلشن ہند مرتب کیا۔ تذکرہ کے دیباچے میں بھی اپنے حیدرآباد کے جانے کے ارادہ کا ذکر کیا ہے۔ - - - ۔ مرزا علی لطف ۱۸۰۱ء میں گلشن ہند کی تالیف سے فارغ ہو کر حیدرآباد آئے اور نواب آصف جاہ بہادر اور اعظم الامراء ارسطو جاہ کی مدح میں قصائد لکھ کر گذرانے۔ ان کی آمد کی شہرت ہوئی تو شعرائے دکن نے معاصرانہ فراخدلی سے کام لے کر استقبال کیا اور وہ حیدرآباد کے شاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے۔ اس زمانے کے دکنی شعراء میں شیر محمد خاں ایمان بہت ممتاز تھے ان سے لطف کی اچھی راہ و

رسم تھی۔ سرکار عالی سے از راہ قدر دانی چار سو روپیہ ماہوار اور ایک پالکی عطا ہوئی۔ اعظم الامراء نے ان کی بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی سے محظوظ ہو کر اپنے بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی سے محظوظ ہو کر اپنے مصاحبوں میں شریک کر لیا اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔

(صفحہ ۱۲۸ لغایۃ ۱۳۰ ارباب نثر اردو)

لطف نے ۱۸۲۲ء میں بمقام حیدرآباد وفات پائی اور یہیں پیوند زمین ہوگئے۔ لطف کی پہلی تالیف تو یہی تذکرہ "گلشن ہند" ہے جو انھوں نے کلکتہ میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کی فرمائش پر لکھا تھا دوسرا ایک کلیات ہے۔

تذکرہ گلشن ہند کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ یہ تذکرہ گلکرائسٹ نے لکھوا تو لیا مگر اس کی تکمیل کے بعد نہ تو لطف کے کالج میں ملازم ہونے کا کوئی ثبوت ملتا ہے نہ یہ تذکرہ فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات میں شامل نظر آتا ہے۔

پوری ایک صدی کے بعد حیدرآباد کی موسی ندی میں سیلاب آیا۔ اور یہ سیلاب اپنے ساتھ ایک پورا کتب خانہ بھی بہا لایا جس میں یہ تذکرہ گلشن ہند بھی تھا۔ اسی طرح یہ مولوی غلام محمد مددگار کیبنٹ کونسل دولت آصفیہ کے ہاتھوں میں پہنچا انھوں نے مولانا شبلی کو دکھایا۔ مولانا شبلی ان دنوں "انجمن ترقی اردو" کی روح رواں تھے چنانچہ انھوں نے اور ڈاکٹر عبدالحق (بابائے اردو) نے بیٹھ کر اس کی تصحیح و ترتیب کی اور یہ تذکرہ پہلی بار ۱۹۰۶ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کیا گیا۔

"تذکرہ گلشن ہند" تاریخی حیثیت سے خود کسی بنیادی تالیف کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ اس کا ماخذ دراصل علی ابراہیم خاں "خلیل کا تذکرہ" "گلزار ابراہیم" ہے جو عہد شاہ عالم ۱۱۹۸ھ میں مرتب کیا گیا تھا لطف نے اسی تذکرہ "گلزار ابراہیم" میں کچھ اضافہ

کا ذکر گھٹا بڑھا کر عام طور پر اسے بجنسہٖ ترجمہ کر دیا۔

ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری نے تذکرہ "گلزار ابراہیم" کے مقدمہ میں لطف کی حیثیت کو "مترجم" سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔

"علی لطف نے اس پوری کتاب کا ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن انھوں نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا پہلے حصے میں سلاطین نامدار وزرائے والا تبار۔ امرائے عالی مقدار اور شعرائے صاحب وقار کے حالات جمع کئے ہیں۔

(صفحہ ۴۱ تذکرہ گلزار ابراہیم معہ تذکرہ گلشن ہند مطبوعہ مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سنہ ۱۹۳۴ء)

"تذکرہ گلشن ہند" کے اس پہلے ایڈیشن میں ڈاکٹر عبدالحق کا لکھا ہوا ایک مقدمہ بھی شامل ہے جس میں انھوں نے لطف کو متعصب اور تنگ نظر ثابت کرنے کے لئے مولوی کریم الدین دہلوی (مولف تذکرہ تاریخ شعرائے اُردو مطبوعہ سنہ ۱۸۴۸ء کے ان الزامات کو (بلا حوالہ دئے ہوئے) دُہرایا ہے جو "تاریخ شعرائے اُردو" میں لطف پر عائد کئے گئے ہیں اور ان الزامات کی بیشتر نوعیت اسی قسم کی ہے جس طرح ڈاکٹر عبدالحق نے "قصہ چہار درویش" کو امیر خسروؔ کی تصنیف یا تالیف سے خارج کر دیا ہے۔ اس تذکرہ کا پہلا ایڈیشن میرے پیش نظر ہے اور میں وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی ترتیب و تصحیح کے وقت اس تذکرے کے ساتھ ادبی اور ثقافتی دیانت داری نہیں برتی گئی۔۔ اگر "انجمن ترقی اردو" اس کا اصل مسودہ سامنے لے آئے تو یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ اس میں "ترتیب و تصحیح" کے نام پر اضافے اور ترمیمات کی گئی ہیں۔

میر شیر علی افسوس

شیر علی نام۔ افسوسؔ تخلص۔ نواب بنگال میر جعفر کے داروغہ توپ خانہ میر مظفر خاں کے صاحبزادے تھے اصل وطن "نارنول" (صوبہ آگرہ) تھا۔ ان کے والد اور چچا سید غلام علی خاں عمدۃ الملک کی سرکار سے وابستہ تھے۔ عمدۃ الملک کی وفات کے بعد میر مظفر خاں ترک ملازمت کر کے خانہ نشین ہو گئے۔ نواب بقار اللہ خاں کے بلاوے پر فیض آباد پہنچے انھوں نے تین سو روپیہ ماہوار پر نواب شجاع الدولہ کے یہاں ملازمت دلوادی۔ جب فیض آباد کی بساط رفتہ رفتہ لکھنؤ میں منتقل ہوئی تو یہ بھی لکھنؤ چلے گئے۔ افسوس کی عمر اس وقت گیارہ سال کی تھی۔ لکھنؤ کی صحبتوں میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ میر حیدر علی حیرانؔ دہلوی کے شاگرد ہوئے اور لکھنؤ کو اپنا وطن ثانی بنالیا۔

جب ان کے والد نواب میر جعفر کی طلبی پر داروغہ توپ خانہ ہو کر مرشد آباد پہنچے تو افسوس بھی ان کے ساتھ تھے۔ میر جعفر کی وفات کے بعد میر مظفر خاں دکن چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

افسوس ابتداً گیارہ بارہ سال تک نواب سالار جنگ اور ان کے صاحبزادے نواب نوازش علی خاں کی سرکار سے وابستہ رہے اس کے بعد جب مرزا جواں بخت (ولی عہد) لکھنؤ آئے تو ان کے زمرہ مصاحبین میں داخل ہو گئے لیکن صاحب عالم کے ہمراہ دہلی نہ جاسکے اس لئے یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ اسی زمانے میں نواب آصف الدولہ کے وزیر سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں نے انھیں اپنے پاس

بلا لیا۔ "گلستاں" کا جو ترجمہ افسوس نے کیا ہے اس کے دیباچہ میں اپنے فورٹ ولیم کالج پہنچنے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"خرچ روزمرہ نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خان بہادر کی بدولت جو کچھ کہ مقدور تھا مل جاتا تھا اور تکلیف نوکری کی کچھ نہ تھی۔ غرض اس بزرگ کے اخلاق و خوبیوں کے بیان سے زبان قاصر ہے خدا اس کو جزائے خیر دیوے اور جنت الماویٰ میں درجہ اعلیٰ عطا کرے کرستائیسویں تاریخ روز جمعہ کو وہی سترھویں ماہ اکتوبر کی تھی سن ہجری بارہ سو پندرہ تھی اور ۱۸۰۰ء کہ صاحب جلیل القدر کرنل اسکاٹ بہادر نے مجھے بلوا بھیجا اور کلام میرا سُنا پھر الطاف نمایاں سے فرمایا کہ تو سرکار کمپنی دام دولتہم کے ملازموں میں اسی تاریخ سے سرفراز ہوا۔ بہ دلجمعی کلکتہ کو روانہ ہو کہ صاحب عالی شان دام ظلہم زبان اردو کا محاورہ اور صحت دریافت کیا چاہتے ہیں بنا بر اس کے تجھے طلب کیا ہے یہ ہیچمدان اگرچہ لیاقت موافق اساتذہ سابق کے نہ رکھتا تھا اور اس فن سے بھی دل برداشتہ تھا قدرداں جو اس بزرگ کو دیکھا اور صاحبوں کو جوہر شناس سمجھا فی الواقع قدرداں اہل فن اور عزت بخش صاحبان سخن ان سے بہتر کوئی نہیں اور ان کی سرکار مجمع علماء و طلباء ہے عازم اس ملک کا ہوا۔ اور آب و دانہ یہاں لے آیا۔"

(صفحہ ۱۰۲ سیر المصنفین جلد اول مطبوعہ عالمگیر پریس لاہور)

افسوس ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے اور فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف سے وابستہ ہو گئے۔ مرزا علی لطف نے تذکرہ "گلشن ہند" میں ان کے کلکتہ پہنچنے کا جو ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ کے لئے افسوس کا انتخاب کیا گیا اس کیلئے سب سے پہلے میر تقی میر طلب کئے گئے تھے۔ لطف لکھتے ہیں۔

"جن ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زباندان ریختہ کے

مقدمہ میں کلکتہ سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے سامنے تقریب "میر" (میر تقی میر) کی ہوئی۔ لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے۔ اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتہ میں شاعری کی جا خالی ہے۔"

(صفحہ ۱۵۲ تذکرہ گلشن ہند)

افسوس نے فورٹ ولیم کالج کے زمانہ قیام میں دو کتابیں لکھیں۔ ایک تو سبحان رائے کی "خلاصۃ التواریخ" کو ماخذ بنا کر "آرائش محفل" تالیف کی۔ دوسری گلستان سعدی کا اُردو ترجمہ ۱۸۰۲ء میں کیا۔ یہ دونوں کتابیں کالج کی طرف سے شائع کی گئی تھیں مگر پُرانے ایڈیشن اب کمیاب ہیں۔

افسوس کا انتقال ۱۸۰۹ء میں ہوا۔

شیخ حفیظ الدین احمد

مولوی شیخ ہلال الدین محمد (بن شیخ محمد ذاکر صدیقی) کے بیٹے تھے۔ شیخ ہلال الدین اکرام علی کے ان ساتھیوں میں تھے جنھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے زمانے میں عرصہ تک ایک ساتھ کام کیا تھا اس کے بعد جب وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں اسکول قائم کیا تو وہاں بھی یہ دونوں کچھ دنوں تک ساتھ رہے البتہ فورٹ ولیم کالج قائم ہونے کے بعد شیخ ہلال الدین محمد کا ذکر کہیں نظر نہیں آتا۔ غالباً قیام کالج کے وقت ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ شیخ حفیظ الدین احمد کے بزرگ عرب سے ترکِ وطن کر کے دکن آئے تھے لیکن ان کے پردادا شیخ حسن کو دکن چھوڑ کر بنگال آنا پڑا اگرچہ قسمت نے حیات بھی کچھ دنوں تک "غم دوراں" سے نکلنے نہ دیا مگر یہ فقر و قناعت پر تکیہ کر کے بیٹھ کے ہو رہے۔

شیخ حفیظ الدین احمد کی تعلیم و تربیت اپنے یگانۂ روزگار باپ کی آغوشِ علم میں ہوئی بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ چونکہ ان کے والد شیخ ہلال الدین محمد کمپنی کے قدیم باعزت ملازمین میں تھے اس لیے فورٹ ولیم کالج قائم ہوتے ہی انھیں شعبہ تصنیف و تالیف میں جگہ مل گئی۔ جہاں ۱۸۰۳ء میں انھوں نے فارسی کی کتاب "عیار دانش" کا ترجمہ "خرد افروز" کے نام سے کیا۔

"عیار دانش" کا ماخذ عربی کی مشہور کتاب "کلیلہ دمنہ" ہے جسے سنسکرت سے عربی میں علامہ ابوالفضل نے منتقل کیا تھا پھر ملا حسین واعظ نے اسے "انوار سہیلی"

کے قالب میں ڈھالا جس کا اُردو ترجمہ حضرت جوش ملیح آبادی کے پردادا فقیر محمد خاں گویا نے کیا۔

اگرچہ انوار سہیلی اور "عیار دانش" افسانوی انداز میں ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں لیکن ان دونوں کتابوں کا ماخذ "کلیلہ دمنہ" ہی بیان کیا جاتا ہے۔

۱۸۱۵ء میں شیخ حفیظ الدین احمد کے قیام دہلی کا پتہ چلتا ہے جہاں وہ ریزیڈنٹ دہلی کے میر منشی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ میر منشی کی حیثیت سے ان کا تقرر کب ہوا اور یہ کب تک دلی میں رہے۔

"خلیل الدین اشک"

فورٹ ولیم کالج کے چند دوسرے مصنفین کی طرح اشک کے حالات زندگی اور ادبی سرگرمیوں پر بھی اس وقت تک گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے یہاں تک کہ مورخین میں ان کے نام پر بھی اختلاف ہے کسی نے "خلیل اللہ خاں اشک" لکھا ہے اور کوئی خلیل علی خاں اشک بتاتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان کا صحیح نام "خلیل الدین" تھا اور اشک تخلص تھا۔

خیرآباد ضلع سیتاپور (اودھ) کے رہنے والے تھے۔ علامہ تراب علی نامی خیرآبادی سے ہم وطنی کے علاوہ غالباً کوئی دور کی رشتہ داری تھی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوسکا ہے ان کا خاندانی تعلق شاہ نصیر الدین دہلوی کے خاندان کی کسی ایسی شاخ تھا جو دہلی سے ترک سکونت کرکے خیرآباد میں آباد ہوگئی تھی۔

اگرچہ ان کے والد کا صحیح نام بھی معلوم نہ ہوسکا بعض بزرگوں کے حافظے نے "کریم الدین" کی طرف رہبری کی اور بعض نے "رحیم الدین" کی رہنمائی فرمائی لیکن اس کی تصدیق میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی کہ یہ خیرآباد ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ فکر معاش میں صعوبات سفر اٹھاکر مدراس پہنچے۔ نامی نے اپنے ہم وطن بھائی کی شایان شان میزبانی کی کچھ دنوں اپنے پاس رکھا اور جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو وہاں جگہ دلوادی۔

خیرآباد اور سیتاپور میں فاصلہ ہی کیا صرف چھ میل کی دوری ہے۔ پھر نامی کی

خصوصیت و قرابت نے انھیں جلد ہی "اکرام علی" سے بھی ملادیا جو غالباً پہلے سے بھی ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ ہم وطنی اور عزیزداری کے علاوہ اس پردیس میں یہ دونوں یک جان و دو قالب ہوگئے چنانچہ جب اکرام علی نے کلکتہ میں "ہندوستانی پریس" کے نام سے پہلا شخصی پریس قائم کیا تو خلیل الدین ہی اس کے منتظم و مہتمم بنائے گئے۔ "اختر الدولہ" نے ہندوستانی اخبارات اور پریس کی سب سے پہلی تاریخ "اختر شہنشاہی" میں اس پریس کا ذکر کرتے ہوئے ان کا نام بھی لکھا ہے۔

"ہندوستانی پریس۔ کلکتہ۔ مالک مولوی اکرام علی (سیتاپوری) مہتمم مولوی خلیل الدین (اشک) اجرائی — یکم جنوری سنہ ۱۸۱۰ عیسوی"

(صفحہ ۲۸۴ اختر شہنشاہی مطبوعہ اختر پریس لکھنؤ سنہ ۱۸۸۸ء)

فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی دور میں نامی کی سفارش سے کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف میں ملازم ہوئے۔ سنہ ۱۲۱۵ھ میں ڈاکٹر جان گلگرائسٹ کی فرمائش پر فارسی کی مشہور کتاب "داستان امیر حمزہ" کا اردو ترجمہ کیا۔ اصل کتاب چودہ جلدوں میں ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کئی داستان گویوں نے سلطان محمود غزنوی (سنہ ۹۹۹ء لغایتہ سنہ ۱۰۳۰ء) کی خوشنودی کے لئے لکھی تھی۔ لیکن ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اس داستان کے لکھنے والے "ملا جلال بلخی" ہیں۔ برٹش میوزیم میں فارسی "داستان امیر حمزہ" کا جو نسخہ محفوظ ہے اس میں بحیثیت مصنف شاہ نصیر الدین احمد کا نام لکھا ہوا ہے۔ لیکن یہیں جو دوسرا نسخہ ہے وہ ابوالمعالی سے منسوب ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ داستان امیر حمزہ حقیقتاً فیضی کی دماغی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ شمس العلماء علامہ عبدالحق خیرآبادی جب انقلاب سنہ ۵۷ء کے بعد بسلسلہ ملازمت مدرسہ عالیہ کلکتہ پہنچے تو انھوں نے اپنے دونوں ہم وطن بزرگ

علامہ تراب علی نامی اور خلیل الدین اشک کے بارے میں کچھ تفصیلات معلوم کرنا چاہیں۔ مگر اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ ان کی کتابیں بھی بڑی مشکل سے ملیں۔ کہا جاتا ہے کہ "فورٹ ولیم ایڈیشن" جو علامہ کو بڑی مشکل سے دستیاب ہوا وہ بھی ناقص و نامکمل تھا چنانچہ انھوں نے مدرسہ عالیہ کے کتب خانے سے اس کی مکمل جلد حاصل کی اور اپنے شاگرد رشید مولانا محمد عبداللہ بلگرامی کو ہدایت فرمائی کہ وہ اس پر نظر ثانی کر کے اسے چھپوا دیں۔ بلگرامی نے اپنے استاد کے حکم کی تعمیل میں اس اہم کام کی تکمیل کی اور سنہ ۱۸۷۱ء میں اسے نولکشور پریس لکھنؤ نے شائع کیا۔ جو فورٹ ولیم کالج کے بعد "داستان امیر حمزہ" کا پہلا مستند نسخہ سمجھا جاتا ہے۔

مطبوعات فورٹ ولیم میں "داستان امیر حمزہ" سے زیادہ کوئی ضخیم کتاب نہیں پائی جاتی۔ اس کے بعد "اخوان الصفا" کا نمبر آتا ہے۔

اشک کی دوسری اور (غالباً) آخری کتاب "واقعات اکبری" ہے جو علامی ابوالفضل کے "اکبر نامہ" کا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۰۹ء میں مکمل ہوئی مگر ابتک شائع نہیں۔ "ہندوستانی پریس" قائم ہوجانے کے بعد اشک کی زیادہ تر دلچسپیاں اسی طرف ہوگئی تھیں غالباً اسی وجہ سے پھر ان کی کوئی کتاب سامنے نہ آسکی۔

"واقعات اکبر" کے کئی قلمی نسخے میری نظر سے گذرے ہیں جس میں سے ایک قلمی نسخہ قاضی اکبر علی سیتاپوری کے کتب خانے میں بھی تھا جس کے خاتمہ پر کسی نے خلیل الدین اشک کے سامنے (عرف خلیل علی اشک) کے الفاظ کا اضافہ کر دیا تھا۔ "داستان امیر حمزہ" کا فورٹ ولیم ایڈیشن میں نے نہیں دیکھا ہے مگر اس کے سرورق پر بھی سُنا ہے کہ "خلیل علی اشک" ہی لکھا ہوا ہے۔ ممکن ہے کلکتہ پہنچ کر انھوں نے اس نام سے شہرت پائی ہو اور یہی نام ان کا عرف عام بن گیا ہو۔ ویسے اصلی نام خلیل الدین ہی تھا۔
اشک "ہندوستانی پریس" کے مہتمم ہونے کے باوجود زندگی بھر فورٹ ولیم کالج

سے متعلق رہے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے کہ کتابت کی غلطیاں ان کی نظر سے محو نہیں ہوسکتی تھیں۔ ایک نکتہ کی معمولی غلطی بھی سختی کے ساتھ پکڑ لیتے تھے۔ "فورٹ ولیم کالج" کی کتابوں کے اکثر پروف آخری طور پر ان کے سامنے پیش کئے جاتے تھے اور جب یہ نظر ثانی کر لیتے تھے تب وہ چھپتے تھے۔ "ہندوستانی پریس" کی کتابیں اسی لحاظ سے کافی مستند اور غلطیوں سے پاک و صاف سمجھی جاتی ہیں۔

افسوس کہ خلیل الدین اشک کے بہت کچھ حالات اب تک سامنے نہ آسکے اگر "خیرآبادی" احباب اس کام کی طرف توجہ فرمائیں تو یقیناً تاریخ کے کچھ گمنام اوراق اور بھی مل جائیں گے۔

اشک کا سن وفات نامی سے تین چار سال قبل بیان کیا جاتا ہے یعنی تخمیناً سنہ ۱۲۳۷ھ۔ کلکتہ ہی میں انتقال ہوا۔ وہیں سپرد خاک کئے گئے لیکن آج کوئی نشان لحد کی نشاندہی کرنے والا بھی نہیں۔ "رہے نام اللہ کا"!

مظہر علی ولاؔ

دلی کے رہنے والے تھے۔ اصلی نام مرزا لطف علی تھا لیکن شہرت مظہر علی خاں کی عرفیت سے پائی۔ تخلص کے بارے میں بھی اختلاف ہے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے تذکرہ "گلشن بے خار" میں ان کا تخلص "ولا" لکھا ہے۔ مصحفی "باطن" تخلص بتاتے ہیں۔ ممنون دہلوی کے شاگرد تھے لیکن مصحفی اور مرزا جان طپش سے بھی مشورہ سخن کرتے تھے شاہان اودھ کے کتب خانے میں ان کا ایک قلمی دیوان محفوظ تھا۔ ان کے دادا محمد حسین علی قلی خاں شرفائے دہلی میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔

ولا کی تعلیم و تربیت اپنے والد کی آغوش علم میں ہوئی۔ عربی۔ فارسی اور اُردو کے علاوہ یہ ہندی اور سنسکرت زبان پر بھی عالمانہ عبور رکھتے تھے۔

سنہ ۱۸۰۳ء میں انھوں نے ہندی زبان کے مشہور قصے "مادھونل" کا ترجمہ اُردو زبان میں کیا جسے "موتی رام کبیر" نے لکھا تھا اس ترجمہ میں ان کے ہمعصر للو لال جی کوی نے ان کی مدد کی اور انھوں نے "بیتال پچیسی" لکھنے میں للو لال جی سے تعاون عمل کیا۔

منشی بینی نرائن جہاں لاہوری جو ولا کے ہمعصر تھے اپنے تذکرہ "دیوان جہاں" میں لکھتے ہیں۔

"ولاؔ۔ تخلص نام میرزا لطف علی عرف مظہر علی خاں خلیفہ سلیمان خاں عرف میرزا محمد زمان خاں و دادا امن محمد حسین خاں بہ خطاب علی قلی خاں

دلی کے رہنے والے ہمیشہ عمدہ روزگار رہے۔ بالفعل کلکتہ میں تشریف رکھتے ہیں۔ اور اس خاکسار پر نہایت مہربانی فرماتے ہیں۔"

(صفحہ ۱۹۲ سیر المصنفین)

ولا کا سب سے زیادہ قابل قدر شاہکار "تاریخ شیر شاہی" کا وہ اُردو ترجمہ ہے جو انھوں نے عباس خاں شروانی (بن شیر علی شروانی) کی مشہور فارسی تاریخ سے ۱۸۲۰ء میں کیا تھا۔ فارسی کی یہ تاریخ شہنشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر کے حکم سے عباس خاں شروانی نے لکھی تھی۔ اس ترجمہ کے خاتمہ پر یہ عبارت درج ہے جو غالباً نقل کرتے وقت لکھی گئی۔

"ختم شد اردو ترجمہ تاریخ شیر شاہی بتاریخ ۵ جمادی الاول ۱۲۳۰ھ مطابق ۲ اگست ۱۸۲۰ء"

۱۸۶۵ء میں "ڈاکٹر گارساں دتاسی" نے اس ترجمہ سے اسے فرانسیسی زبان میں منتقل کر کے پیرس سے شائع کیا تھا۔ "اتالیق ہندی" کے نام سے ولا نے فارسی پڑھنے والوں کے لئے ایک اخلاقی کتاب اور بھی لکھی تھی جسے فورٹ ولیم کالج کی طرف سے ۱۸۰۳ء میں شائع کیا گیا۔ اس کتاب میں فارسی کی عام فہم اخلاقی کہانیاں اور آسان سبق دیئے گئے ہیں جنھیں فارسی کے طلبار آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

مظہر علی ولا ۱۸۱۴ء تک بقید حیات تھے۔

للو لال جی کوی

گجراتی برہمن تھے ان کا خاندان شمالی ہندوستان میں آباد ہو گیا تھا۔ ۱۸۰۰ء کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے اور کاظم علی جوان کے ساتھ "سنگھاسن بتیسی" اردو اور ہندی زبان میں لکھی۔ موجودہ ہندی نثر نگاری کی ابتداء للو لال جی کوی سے ہوئی ہے یہ کالج کے ہندی شعبے کے سربراہ بھی تھے لیکن شعبہ اردو کے مصنفین و مترجمین سے بھی اتنا ہی اشتراکِ عمل کرتے تھے جیسا کہ ہندی والوں سے۔ کاظم علی جوان اور مظہر علی ولا ان کے مخصوص احباب میں تھے جنھوں نے آپس میں مل جل کر ہندی اور اردو کی کئی کتابوں کو حیات جاودانی بخشی۔ "شکنتلا" (ناٹک) کے ترجمے میں انھوں نے کاظم علی جوان کا ہاتھ بٹایا۔ کاظم علی جوان نے "سنگھاسن بتیسی" میں ان کا ساتھ دیا۔ اسی طرح مظہر علی ولا نے للو لال جی کے ساتھ بیٹھ کر "بیتال پچیسی" کی تخلیق کی جسے اردو ہندی کے من بھانے والے امتزاج کا ایک شاہکار کہنا بیجا نہ ہوگا۔

للو لال جی کی سب سے زیادہ کامیاب تصنیف "لطائف ہندی" ہے جس میں دلچسپ قصے کہانیوں کے علاوہ کہاوتیں۔ امثال۔ ضلع جگت اور لطیفوں کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے یہ کتاب اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوئی ہے۔ ان کی ہندی تالیفات و تصانیف میں "پریم ساگر" اور "راج نیتی" بھی مقبول کتابیں ہیں لیکن "پریم ساگر" کے جو بازاری ایڈیشن عام طور پر فروخت ہوتے ہیں وہ اصل کتاب سے بالکل مختلف ہیں۔

سید کاظم علی جوان دہلوی

کاظم علی نام جوان تخلص۔ دہلی کے سید زادے تھے۔ سیر و سیاحت کے شوق میں لکھنؤ پہنچے اور یہاں سے آب و دانہ کلکتہ لے پہنچا۔ کرنل اسکاٹ کی سفارش پر ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف سے منسلک ہو گئے۔ عربی۔ فارسی اور اردو کے علاوہ سنسکرت میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے ۱۷۱۶ء میں نواز کبیشر" نے سنسکرت کے مشہور ناٹک "شکنتلا" کو جو "برج بھاکا" کا جامہ پہنایا تھا جوان نے اسے پہلی بار اردو میں اپنایا۔ یہ ناٹک "شکنتلا" ہی کے نام سے ۱۸۰۲ء میں کالج کی طرف سے شائع کیا گیا۔

۱۸۰۵ء میں انھوں نے للو لال جی کوی کے ساتھ مل کر "سنگھاسن بتیسی" کو اردو ہندی کا روپ دیا۔

اور ۱۸۱۲ء میں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں پر ایک "بارہ ماسہ" بھی لکھا جس کا نام "دستور ہند" ہے۔

۱۸۰۹ء میں جوان نے فارسی کی "تاریخ فرشتہ" سے سلاطین بہمنی کے حالات کا اردو ترجمہ بھی کیا جسے فورٹ ولیم کالج نے شائع کیا ہے۔

۱۸۱۴ء تک بقید حیات تھے۔

مرزا جان طپش

اصل نام مرزا محمد اسمٰعیل۔ مگر مرزا جان کی عرفیت سے شہرت پائی۔ طپش تخلص تھا۔ سلسلہ نسب بخارا کے مشہور بزرگ صوفی سید جلال الدین (سید بخاری) تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد مرزا یوسف بیگ کا شمار دہلی کے شرفاء میں تھا۔ طپش (غالباً) ۱۱۶۳ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک دہلی کے علمار کی صحبت میں رہے۔ فارسی۔ عربی اور سنسکرت زبانیں یہیں سیکھیں۔ فن بلاغت کی تکمیل محمد یار بیگ سائل سے کی۔ ابتدار ولی عہد مرزا جوان بخت جہاندار شاہ کے درباریوں میں ملازم ہوئے کچھ دنوں بعد اپنی خدمات فوجی ملازمت میں منتقل کرالیں۔ شعر و سخن کا شوق محمد یار بیگ سائل کے فیض صحبت سے پیدا ہوا کچھ دنوں ان سے اصلاح بھی لی۔ بعد میں خواجہ درد کے شاگرد ہو گئے۔

مرزا جہاندار شاہ کے مرنے کے بعد دلّی سے نکل کھڑے ہوئے۔ ڈھاکہ پہنچے کچھ دنوں نواب سید احمد علی خاں (شمس الدولہ) کے مصاحبین میں رہے پھر وہاں سے کلکتہ آگئے۔ "فورٹ ولیم" تک رسائی پیدا کی۔ کالج میں جگہ مل گئی۔ طپش کی ابتدائی خدمات کالج کی کتابوں پر نظر ثانی کرنے سے متعلق تھیں۔ اسی شعبہ میں منشی خلیل الدین اشک بھی تھے طپش سے انکے خصوصی مراسم تھے۔

طپش نے "بہار دانش" کے نام سے ایک فارسی قصہ کو نظم کیا ہے جو ۱۸۱۱ء میں فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شائع کیا گیا۔ شمس الدولہ کی ملازمت کے زمانے میں بھی طپش نے نواب کی فرمائش پر ایک کتاب "شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان" لکھی تھی جو ۱۲۶۵ھ میں مرشد آباد سے شائع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر نے طپش کا سن وفات قبل ۱۸۱۶ء لکھا ہے۔

بینی نرائن جہاں

مہاراجہ لکشمی نرائن رئیس لاہور کے صاحبزادے تھے ان کے بڑے بھائی رائے کھیم نرائن رند بھی اپنے زمانے کے ایک بلند پایہ شاعر اور صاحب کمال بزرگ تھے۔ لاہور میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ والدین کے مرجانے کے بعد اچانک تقدیر کے چکر میں آ پھنسے۔ شریف الخاندان اور خود دار مزاج انسان تھے دل نے کسی طرح یہ قبول نہ کیا کہ جس جگہ راج رچا ہو وہاں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ لاہور کو چھوڑ کر قسمت آزمائی کے لیے نکل کھڑے ہوئے کئی سال تک ہندوستان بھر میں آوارہ وطنی کی زندگی گذارتے رہے۔ پھرتے پھراتے کلکتہ پہنچے یہاں کی آب و ہوا نے دامن تھام لیا یہیں ٹھہر گئے لیکن بارہ برس تک کسی نے اجنبی مسافر کی طرف آنکھ بھر کر نہ دیکھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت کلکتہ کے ارباب علم و فضل تک رسائی پیدا کر لی تھی۔ سید حیدر بخش حیدری ان کے خاص دوستوں میں تھے انھیں کے سفارش اور کوشش سے فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف میں پہنچے۔ ان کی کوئی تصنیف۔ تالیف یا ترجمہ شائع نہیں ہوا۔ ۱۸۱۱ء میں انھوں نے ایک عشقیہ قصہ اردو زبان میں "چار گلشن" کے نام سے لکھ کر مولوی امام بخش کو سنایا تو انھوں نے بہت پسند کیا۔ پہنچتے پہنچتے یہ بات چند علم دوست انگریزوں تک پہنچی تو انھوں نے ایک معقول رقم دے کر جہاں سے "چار گلشن" کا مسودہ حاصل کر لیا اور یہ اصل مسودہ اب تک برٹش میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

مولوی محمد یحییٰ تنہا نے "سیر المصنفین" میں لکھا ہے۔

"بھی زبان کی دوسری تالیف تذکرہ دیوان جہان ہے۔ یہ تذکرہ جہان نے کپتان روبک (CAPT ROEBUCK) کی فرمائش پر لکھا۔ غالباً ۱۸۱۲ء میں شروع کیا اور ۱۸۱۴ء میں ختم کیا اس تذکرہ میں ۱۲۵ شعرا کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے۔ قدیم تذکروں کی طرح اس کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ شعرا کے حالات میں اکثر حرف نام۔ ولدیت۔ سکونت اور تلمذ وغیرہ پر اکتفا کیا گیا ہے تاریخ ولادت و وفات اور دیگر ضروری امور چھوڑ دیے گئے ہیں اس کا دیباچہ بھی نظم میں ہے اور مرتب نے اپنے کلام کا بہت سا حصہ اس میں شامل کر دیا ہے یہ تذکرہ بالکل نایاب ہے صرف برٹش میوزیم میں اس کا ایک نسخہ ہے۔"

(صفحہ ۱۹۱، ۱۹۲ سیر المصنفین)

ڈاکٹر گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ آخر عمر میں یہ مسلمان ہو گئے تھے اور مولوی سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی دتاسی کا بیان ہے کہ مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ جہان نے مسلمان ہونے کے بعد مولوی شاہ رفیع الدین دہلوی (خلف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) کی فارسی کتاب "تنبیہ الغافلین" کا اردو ترجمہ بھی ۱۲۴۵ھ میں کیا تھا لیکن یہ ترجمہ بھی اب تک غالباً شائع نہیں ہوا۔

نہال چند لاہوری

ان کے بزرگ لاہور سے آ کر دلّی میں رہ بس گئے تھے۔ نہال چند دلّی میں پیدا ہوئے اور "شاہجہاں آباد" ہی کے ماحول میں پلے بڑھے لیکن وطن مالوف کی نسبت کو ہمیشہ سینے سے لگائے رہے "فورٹ ولیم" کے شعبہ تصنیف و تالیف میں کپتان ڈلورٹ کی سفارش سے ملازم ہوئے "قصہ گل بکاولی" جسے فارسی میں شیخ عزت اللہ بنگالی (وفات ۱۱۳۳ھ) نے سب سے پہلے لکھا تھا نہال چند نے "مذہب عشق" کے نام سے اس کا اردو ترجمہ ۱۲۱۷ھ میں کیا جو ۱۸۰۴ء میں فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شائع کیا گیا۔

یہ قصہ "گل بکاولی" وہی ہے جسے انیسویں صدی میں خواجہ آتش کے شاگرد رشید پنڈت دیاشنکر نسیم نے مثنوی کا جامہ پہنا کر زبان زد خاص و عام کر دیا۔

سید حمید الدین بہاری

صوبہ بہار کے رہنے والے تھے ڈاکٹر گلکرائسٹ کے دور صدارت میں کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف میں ملازم ہوئے۔ ۱۸۰۴ء سے کچھ پہلے ڈھائی سو صفحات کی ایک کتاب "خوان ایوان" کے نام سے لکھی جس میں قسما قسم کے ہندوستانی کھانے پکانے کی ترکیبیں لکھی گئی ہیں اور اس کے ۲۴ ابواب ہیں ہر باب کو ایک "خوان" سے تشبیہ دی گئی ہے آخری باب میں "مصطلحات طعام خانہ" کے نام سے حروف تہجی کے مطابق ایک فرہنگ بھی شامل ہے۔

غالباً یہ کتاب شائع نہ ہو سکی اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔

مولوی امانت اللہ شیدا

اردو زبان و ادب کی تاریخ اور عام طور پر تمام تذکرے شیدا کے حالات سے خالی نظر آتے ہیں یہاں تک کہ یہ معلوم کرنا بھی ناممکن ہوگیا کہ یہ کہاں کے رہنے والے تھے۔ خیال یہی ہے کہ شمالی ہند ہی ان کا وطن تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف سے متعلق تھے اور اسی زمانہ میں جامع الاخلاق کے نام سے "اخلاق جلالی" کا اردو ترجمہ کیا تھا جو ۱۸۰۵ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب اردو اور عربی زبانوں میں تحریر فرمائی جس کا نام "ہدایت الاسلام" ہے یہ کتاب اسلامی عقائد اور رسوم سے متعلق ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ سنہ ۱۸۰۴ء میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے کیا تھا۔

۱۸۱۰ء میں ایک منظوم مثنوی "صرف اردو" کے نام سے تحریر کی۔

امانت اللہ شیدا عربی و فارسی کے ایک مستند عالم تھے ان کا ترجمہ "قرآن شریف" بھی ایک شاندار دینی شاہکار سمجھا جاتا ہے

مرزا محمد فطرت

لکھنؤ کے رہنے والے تھے تقریباً سنہ ۱۸۰۰ء میں یا اس سے کچھ قبل انھوں نے "جارج ہاڈلے" کی قواعد اردو کا ایک ترمیم شدہ ایڈیشن تیار کیا تھا جو سنہ ۱۸۰۱ء لندن سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب سے قواعد اردو کے علاوہ ہندوستان کی طرز معاشرت و رواسم و رواج پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ قواعد اردو کئی بار شائع ہو چکی ہے ولیم ہنٹر کی مدد سے فطرت نے "انجیل مقدس" کا اردو ترجمہ بھی کیا جو ۱۸۰۵ء میں پہلی بار پھر سنہ ۱۸۱۷ء میں شائع ہوا اس ترجمہ میں ولیم ہنٹر کے علاوہ فطرت نے پادری مارٹن سے بھی مدد لی تھی۔ آجکل بائیبل "عہد جدید" کے جس ایڈیشن کا رواج ہے وہ بنیادی طور پر فطرت ہی کی انجیل مقدس کی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہے۔

انجیل مقدس کا صرف "عہد جدید" ہی فطرت کا ترجمہ کیا ہوا ہے "عہد عتیق" کسی دوسرے کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے۔

(صفحہ ۲۰۴ سیر المصنفین)

"اخوان الصفاء"

"اخوان الصفاء"

"اخوان الصفاء" کی تفصیلات سامنے آنے کے بعد اب "اکرام علی" کی طرزِ نگارش کے چند نمونے بھی ملاحظہ فرمایئے جو اب سے ڈیڑھ سو سال ادھر کی زبان ہے! فورٹ ولیم کالج میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں "داستان امیر حمزہ" کے بعد "اخوان الصفاء" ہی سب سے زیادہ ضخیم کتاب ہے۔ اور "اخلاق" جیسے خشک فلسفیانہ موضوع کے باوجود اتنی دلچسپ اور پُرازمعلومات ہے کہ باربار پڑھنے کے باوجود سیری نہیں ہوتی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکومت اور اس کے بعد برطانوی دورِ اقتدار میں یہ کتاب برسوں آئی سی ایس کے نصاب تعلیم میں داخل رہی اور انگریزی زبان میں اس اردو ترجمہ سے بار بار منتقل کی گئی۔

---

(۱)

کہنے والے نے احوال ابتدائے ظہورِ بنی آدم کا یوں لکھا ہے کہ جب تک یہ تھوڑے تھے سدا حیوانوں کے ڈر سے بھاگ کر غاروں میں چھپتے اور درندوں کے خوف و خطر سے ٹیلوں اور پہاڑوں میں پناہ لیتے۔ اتنا بھی اطمینان نہ تھا کہ دو چار آدمی مل کر کھیتی کریں اور کھائیں۔ اس کا کیا ذکر کہ کپڑا پہنیں اور بدن کو چھپائیں۔ غرض پھل پھلاری ساگ پات جنگل کا جو کچھ پاتے کھاتے اور درختوں کے پتوں سے بدن کو چھپاتے۔ جاڑوں میں سیر گرم جگہ میں رہتے اور گرمیوں میں سرزمین سرد کا رہنا اختیار کرتے۔

جب اس حالت میں تھوڑی مدت گزر گئی اولاد کی بہتائت ہوئی تو اندیشہ دام و دد کا ہر ایک کے جی میں سمایا تھا بالکل نکل گیا۔ پھر تو بہت سے قلعے۔ شہر۔ قریہ۔ نگر بسا کر چین سے رہنے لگے۔ زراعت کا سامان مہیا کرکے اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہوئے۔ اور حیوانوں کو گرفتار کرکے سواری، بار برداری، زراعت، کاشتکاری کا کام لینے لگے۔

ابھی گھوڑے۔ اونٹ۔ گدھے اور بہت سے جانور کہ سدا جنگل بیابان میں شتر بے مہار پھرتے تھے۔ جہاں جی چاہتا اچھا ہرا سبزہ دیکھ کر چرتے کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ سو ان کے کاندھے رات دن کی محنت سے چھل گئے اور پیٹھوں پر غار پڑ گئے۔ ہر چند بہت پیچھے جنگھاڑے پر حضرت انسان کب کان دھرتے تھے اکثر وحشی خوف گرفتاری سے دور دست جنگلوں میں بھاگ گئے۔ وہاں بھی دہشت کے مارے بسیرا چھوڑ کر بال بچوں کو لے ان کے دیس سے آنکھ اوجھل ہو گئے۔ ہر ایک بشر کو یہ خیال تھا

کہ سب حیوانات ہمارے غلام ہیں۔ کس کس مکر و حیلے سے پھندے اور جال بنا کے اُن کے درپے ہوتے۔

اس دار و گیر میں ایک مدت گزری۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ و آلہ کو خلق کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ نبی برحق نے گمراہوں کو شریعت کی راہ دکھلائی اور بعضے جنات نے ایمان و شرافت اسلام کی پائی۔

جب اس پر بھی ایک زمانہ گزرا اور بیوراسب حکیم جنی کہ لقب اُس کا شاہ مردان تھا قوم جنات کا بادشاہ ہوا۔ ایسا عادل تھا کہ جس کے عہد میں باگ بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ کیا دخل کہ کوئی ٹھگ۔ چوٹٹا۔ دغا باز۔ اُچکا اس کے قلمرو میں رہنے پائے۔

جزیرہ "بلاصاغون" نام کہ قریب خطِ استوا کے واقع ہے اس شہنشاہ عادل کی تخت گاہ تھا۔

اتفاقاً ایک جہاز آدمیوں کا بادِ مخالف کے سبب تباہی میں آ کر اس جزیرہ کے کنارے جا لگا۔ جتنے سوداگر اور اہلِ علوم کہ جہاز میں تھے اُتر کر اس سرزمین کی سیر کرنے لگے۔ دیکھا تو عجب بہار ہے کہ رنگ برنگ کے پھول اور پھل ہر ایک درخت میں لگے۔ نہریں ہر طرف جاری۔ حیوانات ہرا ہرا سبزہ چر چگ کر بہت موٹے تازے آپس میں کلیلیں کر رہے ہیں۔ از بسکہ آب و ہوا وہاں کی نہایت خوب اور زمین بہت شاداب تھی کسی کا دل نہ چاہا کہ اب یہاں سے پھر جائے۔

آخر مکانات طرح طرح کے بنا کے اس جزیرہ میں رہنے لگے اور حیوانات کو دام میں گرفتار کرکے بدستور اپنے کاروبار میں مشغول ہوئے۔ وحشیوں نے جب یہاں بھی "سُبیتا" نہ دیکھا راہ صحرا کی لی۔ آدمیوں کو تو یہی گمان تھا کہ یہ سب ہمارے غلام ہیں اس لئے انواعِ اقسام کے پھندے بنا کر بطورِ سابق قید کرنے کی فکریں ہوئے۔ جب

حیوانوں کو یہ زعم فاسد اِن کا معلوم ہوا تو اپنے رئیسوں کو جمع کر کے دارالعدالت میں حاضر ہوئے اور بیوراسپ حکیم کے سامنے سارا ماجرا ظلم کا کہ اُن کے ہاتھوں سے اُٹھایا تھا مفصل بیان کیا۔

جس وقت بادشاہ نے تمام احوال حیوانوں کا سُنا فرمایا کہ ہاں جلد قاصدوں کو بھیجیں کہ آدمیوں کو حضور میں حاضر کریں۔ چنانچہ ستر آدمی جُدے جُدے شہروں کے رہنے والے کہ نہایت فصیح و بلیغ تھے بموجب طلب بادشاہ کے حاضر ہوئے۔ ایک مکان اچھا سا اُن کے رہنے کے لئے تجویز ہوا بعد دو تین دن کے جب ماندگی سفر رفع ہوئی اپنے سامنے بلوایا۔ جب اُنھوں نے بادشاہ کو تخت پر دیکھا دعائیں دیں اور آداب و کورنش بجا لا کر اپنے اپنے قرینہ سے کھڑے ہوئے۔

یہ بادشاہ تو نہایت عادل و منصف جوان مردی اور سخاوت میں اقران و امثال سے سبقت لے گیا تھا۔ زمانے کے غریب و غربا یہاں آن کے پرورش پاتے تھے۔ تمام قلمرو میں کسی زبردست عاجز پر کوئی زبردست ظالم ظلم نہ کر سکتا جو چیزیں کہ شرع میں حرام ہیں اس کے عہد میں بالکل اُٹھ گئی تھیں۔ ہمیشہ سوائے رضامندی اور خوشنودی خدا کے کوئی امر ملحوظ خاطر نہ تھا۔

اس نے نہایت اخلاص سے ان سے پوچھا کہ تم ہمارے ملک میں کیوں آئے ہمارے تمہارے تو کبھی خط و کتابت بھی نہ تھی۔ کیا ایسا سبب ہوا کہ تم یہاں تک پہنچے؟

ایک شخص ان میں سے کہ جہاں دیدہ اور فصیح تھا۔ تسلیمات بجا لا کر کہنے لگا کہ ہم عدل و انصاف بادشاہ کا سُن کر حضور میں حاضر ہوئے ہیں اور آج تک اس آستانۂ دولت سے کوئی داد خواہ محروم نہیں پھرا ہے۔ امید یہ ہے کہ بادشاہ

لے [illegible] الخ

ہماری داد کو پہنچے۔ فرمایا کہ غرض تمھاری کیا ہے۔ عرض کیا کہ اے بادشاہ عادل یہ حیوانات ہمارے غلام ہیں بعضے سفر اور بعضے اگرچہ جبراً تابع ہیں لیکن ہماری ملکیت سے منکر ہیں!

بادشاہ نے پوچھا کہ اس دعوے پر کوئی دلیل بھی ہے۔ کیونکہ دعویٰ بے دلیل دارالعدالت میں سُنا نہیں جاتا۔ اس نے کہا اے بادشاہ اس دعوے پر بہت سے دلائل عقلی و نقلی ہیں۔ فرمایا بیان کرو۔ ان میں سے ایک شخص کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھا منبر پر چڑھ کے اس خطبہ کو فصاحت و بلاغت سے پڑھنے لگا۔

حمد اُس معبود حقیقی کے لائق ہے جس نے پرورش عالم کے لئے عرصۂ زمین پر کیا کچھ مہیا کیا۔ اور کتنے اسباب بنائے اور انسان ضعیف البنیان کے واسطے کیسے کیسے حیوانات پیدا کئے۔ خوشا حال اُن کا جو اُس کی رضامندی میں راہ عاقبت کی سنوارتے ہیں۔ کیا کہئے اُن لوگوں کو جو نافرمانی کر کے ناحق اس سے برگشتہ ہوتے ہیں اور درود بعد واسطے نبی برحق محمد مصطفےٰ صلعم کے سزاوار ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیچھے سب پیغمبروں کے خلق کی ہدایت کے لئے بھیجا اور سب کا سردار بنایا۔ تمام جن و بشر کا وہی بادشاہ ہے اور روز آخرت میں سب کا پشت و پناہ۔ صلوٰۃ و سلام اُس کی آل پاک پر جن کے سبب دین و دنیا کا انتظام ہوا اور اسلام نے رواج پایا۔ غرض ہر آن میں شکر ہے اس "صانع بیچون" کا جس نے ایک پانی کے قطرے سے آدم کو پیدا کیا اور اپنی قدرت کاملہ سے اس کو صاحب اولاد بنایا اور اس نے حوا کو پیدا کر کے ہزاروں انسان سے روئے زمین کو آباد کیا اور سارے مخلوقات پر ان کو شرف بخشا۔ تمام خشکی و تری میں مسلط کیا۔ طرح طرح کا پاکیزہ کھانا کھلایا۔ چنانچہ آپ ہی فرماتا ہے۔ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ سب حیوانات تمھارے لئے مخلوق ہوئے ہیں۔

ان سے فائدے اٹھاؤ اور کھاؤ۔ ان کی کھال اور بال سے پوشش گرم بناؤ۔ صبح کے وقت
چراگاہ میں بھیجانا اور شام کو پھر گھروں میں لانا تمہارے واسطے زیب و آرائش ہے اور
ایک مقام پر یوں فرمایا ہے۔ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ یعنی خشکی اور تری میں
اونٹوں اور کشتیوں پر سوار ہو۔ اور ایک جا یوں ارشاد ہے۔ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ
لِتَرْكَبُوهَا۔ یعنی گھوڑے، خچر، گدھے اس واسطے پیدا ہوئے ہیں کہ ان پر سواری کرو
اور ایک موضع میں یوں کہا ہے۔ لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ
إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ یعنی ان کی پیٹھوں پر سوار ہو اور اپنے خدا کی نعمتوں کو یاد کرو۔
اس کے سوا اور بھی بہت آیات قرآنی اس مقدمہ میں نازل ہیں اور توریت و
انجیل سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ حیوانات ہمارے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

تب بادشاہ نے حیوانوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اس آدمی نے آیات
قرآنی اپنے دعویٰ پر گزرانیں۔ اب جو کچھ تمہارے خیال میں آئے اس کا جواب
دو۔ یہ سن کر خچر نے زبان حال سے یہ خطبہ پڑھا۔

حمد ہے اس واحد پاک قدیم بے نیاز کی شان میں کہ جو موجود تھا قبل
ایجاد عالم کے نہ زمان میں نہ مکان میں۔ ایک لفظ "کن" کے کہنے میں تمام کائنات
کو پردۂ غیب سے ظاہر کیا۔ افلاک کو آب و آتش سے ترکیب دے کر مرتبہ
بلندی کا بخشا۔ ایک پانی کے قطرے سے آدم کی نسل ظاہر کر کے آگے پیچھے دنیا میں
بھیجا۔ کہ اس کی آبادی میں مشغول ہوں خراب نہ کریں اور محافظت حیوانات کی
کما ینبغی بجا لا کر فائدہ اٹھائیں نہ یہ کہ ان پر ظلم کریں اور ستائیں۔ بعد اس کے
یوں کہنے لگا کہ اے بادشاہ آیتیں جو اس آدمی نے پڑھیں ان سے یہ نہیں
مفہوم ہوتا ہے کہ ہم ان کے مملوک ہیں اور یہ ہمارے مالک، کیونکہ ان آیتوں میں
ذکر ان نعمتوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو بخشی ہیں۔ چنانچہ یہ آیت قرآنی

اس پر دال ہے۔ سَخَّرَ لَكُمْ كَمَا سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالرِّيَاحَ وَالسَّحَابَ
یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے تابع کیا ہے جیسا کہ تابع کیا ہے آفتاب و ماہتاب اور ہوا اور
ابر کو۔ اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ہمارے مالک اور ہم ان کے غلام ہیں۔ بلکہ
اللہ تعالیٰ نے تمام خلائق کو آسمان و زمین پیدا کر کے ایک دوسرے کا تابع کیا۔ اس لئے
کہ آپس میں ایک دوسرے سے منفعت اٹھائے۔ اور نقصان دفع کرے۔ پس ہم کو
جو اللہ تعالیٰ نے ان کے تابع کیا ہے صرف اس واسطے کہ فائدہ ان کو پہنچے اور نقصان
ان سے دفع ہو۔ نہ جیسا کہ انھوں نے گمان کیا ہے اور مکر و بہتان سے کہتے ہیں کہ
ہم مالک اور یہ غلام۔ قبل اس کے کہ یہ آدمی پیدا نہ ہوئے تھے ہم اور ماں باپ
ہمارے بے مزاحمت روئے زمین پر رہتے تھے ہر ایک طرف چرتے جہاں جی چاہتا پھرتے
اور ایک ایک اپنی معاش کی تلاش میں مشغول تھا۔ غرض پہاڑ جنگل بیابان میں آپس میں ملے
جلے رہتے اور اپنے بال بچوں کو پرورش کرتے۔ جو کچھ خدا نے مقدر کیا تھا اس پر شاکر ہو کر رات دن
اس کی حمد میں گزارتے۔ اس کے سوا کسی کو نہ جانتے تھے۔ اپنے اپنے گھروں میں چین سے
رہتے کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ جب اس پر ایک زمانہ گزرا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو مٹی سے
بنایا اور تمام روئے زمین کا خلیفہ کیا۔

جبکہ آدمی بہتایت سے ہوئے جنگل و بیابان میں پھرنے لگے پھر تو ہم غریبوں پر دست تعدی دراز
کیا۔ گھوڑے، گدھے، خچر، بیل، اونٹ پکڑ کر خدمت اپنی لینے لگے اور وے مفتخر ہیں کہ ہمارے باپ
دادا کے دیکھنے میں نہ آئی تھیں مزدوری و قیدی و قرح میں لائے۔ کیا کریں ہم لاچار ہو کر جنگل و صحرا میں
بھاگ گئے پھر بھی ان صاحبوں نے کسی طرح پیچھا نہ چھوڑا۔ کن کن حیلوں سے پھندے اور جال لے کر درپے
ہوئے۔ اگر دو چار تھکے ماندے کہیں ہاتھ لگ گئے ان کا احوال نہ پوچھیے کہ باندھ چھاند کر لے آتے
ہیں اور کیا کیا دکھ دیتے ہیں۔ علاوہ اس کے ذبح کرنا پوست کھینچنا ہڈیوں کا توڑنا سیخ میں
بھرنا آگ میں جلانا بھون کر کھانا ان کا کام ہے۔ ساتھ اس کے یہ کہ پھر بھی راضی نہیں۔ یہی
دعویٰ ہے کہ ہم مالک، یہ غلام ہیں۔ جو ان میں سے بھاگا گنہگار ہوا۔ اس پر کوئی دلیل نہ حجت
ہے مگر سراسر ظلم و بدعت ہے۔

(۲)

"ریچھ نے کہا کتوں نے طبائع کی موافقت اور اخلاق کی مجانست کے سبب
آدمیوں سے ارتباط بہم پہنچایا ہے۔ اس کے سوا بہت سی لذتیں کھانے پینے کی
وہاں حاصل ہوتی ہیں۔ اور طبیعتوں میں ان کی حرص و بخل اور اخلاق بد مثل آدمیوں
کے ہے۔ یہ زیادہ موجب موافقت کا ہے اور درندے ان بدوں سے کنارہ کرتے ہیں
سبب اس کا یہ ہے کہ کتے گوشت کھاتے ہیں کچا و پکا۔ حلال و حرام تر و خشک نمکین
بے نمک اچھا برا جیسا پاتے ہیں۔ اس کے سوا پھل پھلاری ساگ پات روٹی
دال۔ دودھ دہی کھٹا میٹھا گھی تیل۔ شہد۔ حلوا۔ ستو اور جو اقسام آدمیوں کے
کھانے کے ہیں سب کھاتے ہیں کچھ نہیں چھوڑتے۔ درندے ان چیزوں کو کھاتے
نہیں بلکہ پہچانتے بھی نہیں ہیں اور حرص و بخل ان میں اس مرتبے میں ہے کہ ممکن
نہیں جو کسی جانور کو بستی میں آنے دیویں اس واسطے کہ وہ اگر کچھ کھا نہ لیوے۔
اگر کہیں ناگہانی کوئی لومڑی یا گیدڑ کسی گاؤں میں رات کو گیا کہ مرغی یا چوہا یا
بلی یا مردار یا کوئی ٹکڑا روٹی کا چرا لے کر آوے کتے کس شدت سے بھونکتے ہیں
اور حملہ کر کے آخر وہاں سے نکال دیتے ہیں۔ اس طمع و حرص کے باعث ذلیل و
خراب کتے ہیں اگر کسی مرد یا عورت یا لڑکے کے ہاتھ میں روٹی یا کچھ اور کھانے
کی چیز دیکھتے ہیں طمع سے دم اور سر ہلاتے ہیں۔ اگر اس نے حیا سے ایک آدھ ٹکڑا
اس کے آگے ڈال دیا۔ کس طرح دوڑ دوڑ کر اس کو اٹھا لیتے ہیں کہ دوسرا لینے
نہ پاوے۔ یہ سب بدیاں انسان میں ہیں۔ اسی موافقت کے باعث کتے اپنے
ابنائے جنس کو چھوڑ ان سے جا ملے ہیں درندوں کی گرفتاری کے واسطے ان کی

مدد اور اعانت کرتے ہیں۔

بادشاہ نے کہا کتے کے سوا اور بھی کوئی درندہ ایسا ہے کہ آدمیوں سے موافقت اور
دوستی رکھتا ہو۔ ریچھ نے کہا بلی بھی ان سے نہایت مانوس ہے۔ بادشاہ نے پوچھا اس کی
موافقت کا کیا سبب ہے؟ ریچھ نے کہا اس کا بھی یہی ایک سبب ہے کہ طبیعت اس کی
اور انسانوں کی موافق ہے۔ بلی کو بھی حرص و رغبت اقسام اقسام کے کھانے کی مثل آدمیوں
کے ہے۔ بادشاہ نے کہا ان کے نزدیک اس کا کیا حال ہے ریچھ نے کہا یہ کتے سے بھی کچھ
بہتر رہتی ہے۔ اس واسطے کہ ان کے گھروں میں جا کر فرش پر سوتی اور کھانے کے وقت
دسترخوان پر جاتی ہے۔ جو کچھ وے آپ کھاتے ہیں اس کو بھی دیتے ہیں اور جو کبھی بے خبر
پاتی ہے تو کھانے پینے میں ان کی چوری بھی کرتی ہے مگر کتے اس کو نہیں چھوڑتے کہ مکانوں میں
جانے پاوے۔ اسی واسطے کتے اور بلی میں حسد و بغض رہتا ہے۔ کتے جس وقت اس کو دیکھتے
ہیں اپنی جگہ سے جست کر کے اس طرح حملہ کرتے ہیں کہ اگر پاویں تو چیر پھاڑ کریں اور
کھا جاویں اور بلی بھی جس وقت کتوں کو دیکھتی ہے منہ نوچتی اور دم اور بال اپنے کھسوٹتی
ہے۔ نہایت غصہ اور غضب سے پھولتی ہے اور بڑھ جاتی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ بیر آپس کی

شیر نے پوچھا ان دو کے سوا کوئی اور بھی ان سے مانوس ہے۔ ریچھ نے کہا چوہے بھی
ان کے گھروں اور دکانوں میں جاتے ہیں مگر ان کو آدمیوں سے انسیت نہیں ہے بلکہ
وحشت کرتے اور بھاگتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا ان کے جانے کا کیا سبب ہے؟ اس نے کہا یہ
بھی اقسام اقسام کے کھانے پینے کی رغبت سے جاتے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا کوئی جانور
اور بھی ان کے یہاں جاتا ہے۔ ریچھ نے کہا نیولے بھی کبھی کبھی چوری چھپے کچھ چرانے
اور لے بھاگنے کے واسطے جاتے ہیں۔

پھر بادشاہ نے پوچھا کوئی جانور ان کے سوا اور بھی ان کے گھروں میں جاتا ہے۔
ریچھ نے کہا اور کوئی نہیں جاتا۔ مگر آدمی زبردستی چیتوں اور بندروں کو پکڑ لے جاتے ہیں
یہ وہاں جانے سے راضی نہیں ہیں۔

(۳)

بادشاہ نے پوچھا کہ بلّی اور کُتّے کس وقت سے انسانوں سے مانوس ہوئے ہیں ریچھ نے کہا جس وقت سے قابیل بنی ہابیل پر غالب آئے بادشاہ نے کہا یہ احوال کیونکر ہے اسے بیان کر۔ ریچھ نے کہا جس گھڑی قابیل نے اپنے بھائی کو جس کا نام ہابیل تھا قتل کیا۔ بنی ہابیل نے بنی قابیل سے قصاص چاہا اور ان سے لڑائی کی آخر بنی قابیل غالب آئے شکست دے کر تمام مال ان کا لوٹ لیا اور مویشی بیل اونٹ گدھے بھیڑ سب لوٹ کر بہت مالدار ہو گئے۔ آپس میں دعوتیں کیں طرح طرح کے کھانے پکوائے حیوانوں کو ذبح کر کے کلّے پائے اوجھڑی جا بجا اپنے ہر ایک شہر اور گاؤں کے گرد بگرد پھینکوا دئے۔ بلّی اور کتّوں نے جو یہ گوشت کی کثرت اور کھانے پینے کی وسعت دیکھی اپنے ابنائے جنس کو چھوڑ کر رغبت سے انکی بستیوں میں آئے اور معین و مددگار ہوئے۔ آج تک ان سے ہلے ملے رہتے ہیں۔

شیخ نے جب یہ قصہ سنا نہایت متاسف ہو کر لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ ط اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط اور کئی بار اس کلمہ کو تکرار کیا۔

ریچھ نے شیر سے پوچھا کہ بلّی اور کتّوں نے جو اپنے اپنے ابنائے جنس سے مفارقت کی آپ کو اس کا افسوس کیا ہے؟ شیر نے کہا مجھے ان کے جانے کا کچھ افسوس نہیں مگر تاسف اس بات کا ہے کہ حکیموں نے کہا ہے بادشاہوں کے واسطے انتظام و بندوبست میں اس سے زیادہ کوئی فساد و نقصان نہیں ہے کہ ان کی فوج کے مددگار جدا ہو کر دشمن سے مل جائیں اس واسطے کہ یہ جا کر اُس کو اوقات غفلت اور تمام نیک و بد اور ہمارے بھید سے اطلاع کر دیں گے اور ہر ایک امر سے آگاہ کر کے راہیں پوشیدہ اور بہت سے مکر بتلا دیں گے یہ بادشاہوں کے واسطے اور فوج کے واسطے نہایت فساد عظیم ہے۔ خدا ان بلّی اور کتّوں میں کبھی

برکت نہ کرے۔

ریچھ نے کہا جو کچھ بادشاہ نے چاہا خدا نے وہی کُتّوں کے ساتھ کیا اور بادشاہ کی دُعا قبول کی۔ ان کی نسل سے خیر و برکت اُٹھا کر بکریوں کو دی۔ بادشاہ نے کہا یہ کیونکر ہے اسے بیان کر؟ ریچھ نے کہا اس واسطے کہ اب تک ایک کُتیا پر بہت سے کُتّے جمع ہو کر پیٹ رکھاتے ہیں۔ جننے کے وقت نہایت شدت و محنت سے آٹھ دس بچّے اور کبھی اس سے بھی زیادہ جنتی ہے۔ مگر کبھی کسی نے بستی یا جنگل میں کتّوں کا بہت سا غول نہ دیکھا۔ حالانکہ انھیں کوئی ذبح بھی نہیں کرتا۔ اور بکریاں باوجود اس کے کہ تمام سال میں ایک یا دو بچّے جنتی ہیں اور ہمیشہ ذبح ہوتی ہیں پھر بھی گلّے کے گلّے جنگلوں اور بستیوں میں نظر آتے ہیں کہ شمار نہیں ہو سکتا اس کا سبب یہ ہے کہ کُتّے اور بلّی کے بچّوں کو کھانے کے باعث بہت سی آفتیں پہنچتی ہیں اور کھانے کے اختلاف کے سبب وے امراض مختلف کہ کسی درندہ کو نہیں ہوتے انھیں ہوتے ہیں اور اپنی بدی اور آدمیوں کی ایذا کے باعث زندگی بھی ان کی اور ان کی اولاد کی کم ہوتی ہے اسی واسطے ذلیل و خوار ہیں۔

بعد اس کے شیر نے کلیلہ سے کہا کہ تو اب رخصت ہو وہاں جنوں کے بادشاہ کے روبرو جا کر جس بات کے واسطے مقرر ہوا ہے اُس کا سرانجام کر۔

---

(۴۴)

دوسرے قاصد نے جس گھڑی طائروں کے بادشاہ شاہ مرغ کے پاس جاکر احوال ظاہر کیا۔ اس نے ماجرا حیوانوں کا اُن کو حکم کیا کہ سب طائر آکر حاضر ہوں چنانچہ انواع واقسام کے طائر جنگلی پہاڑی دریائی نہایت کثرت سے کہ جن کا شمار خدا کے سوا کوئی نہ جانے بموجب حکم کے آکر جمع ہوئے۔ شاہ مرغ نے ان سے کہا کہ آدم دعویٰ کرتے ہیں کہ سب حیوانات ہمارے غلام اور ہم ان کے مالک ہیں۔ اس واسطے بہت حیوان جنوں کے بادشاہ کے سامنے انسانوں سے مناظرہ کرتے ہیں۔

بعد اس کے طاؤس نے وزیر سے کہا کہ طائروں میں کون گویا فصیح زیادہ ہے کہ وہاں بھیجنے کے لائق ہو اور انسانوں سے جاکر مناظرہ کرے۔ طاؤس نے کہا یہاں طائروں کی جماعت حاضر ہے جس کو فرمائیے وہاں جاوے۔ بادشاہ نے کہا مجھے سب کے نام بتلادے کہ میں انھیں پہچانوں۔

طاؤس نے کہا۔ ہدہد۔ مرغ۔ کبوتر۔ تیتر۔ بلبل۔ کبک۔ سرخاب۔ ابابیل۔ کوا۔ کلنگ۔ سنگخوارہ۔ کنجشک۔ فاختہ۔ قمری۔ ممولا۔ بط۔ بگلا۔ مرغابی۔ ہزار داستان شتر مرغ وغیرہ یہ سب حاضر ہیں۔ شاہ مرغ نے طاؤس سے کہا کہ ایک ایک کو مجھے دکھلادے کہ میں دیکھوں اور ہر ایک کی خصلت معلوم کرلوں کہ اس کام کے واسطے کون لائق ہے۔

طاؤس نے کہا ہُدہُد جانور صاحب سلیمان ابن داؤدؑ کا ہے۔ وقت بولنے کے اس طرح جھکتا ہے کہ گویا رکوع و سجود کرتا ہے۔ نیکی کے واسطے حکم کرتا اور بدی کو منع کرتا ہے۔ اسی نے حضرت سلیمان ابن داؤدؑ کو شہر سبا کی خبر پہنچائی اور یہ کہا میں نے

جو عجائب وغرائب جہاں کے دیکھے ہیں وہ آپ نے بھی نہیں دیکھے۔ چنانچہ شہر سبا سے ایک خبر لایا ہوں آپ کے واسطے کہ ہرگز جھوٹ کا اس میں دخل نہیں۔ وہاں ایک رنڈی ہے کہ جس کے جاہ وحشم کے بیان میں زبان قاصر ہے سلطنت اس ملک کی اسی کے اختیار میں ہے اور ایک تخت نہایت بڑا ہے کہ اس پر بیٹھتی ہے۔ غرض تمام جہان کی نعمتیں اُس کے یہاں موجود ہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ مگر وہ اور اُس کی قوم کے لوگ سخت گمراہ ہیں خدا کو نہیں مانتے آفتاب کا سجدہ کرتے ہیں۔ شیطان نے ازبسکہ ان لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ ضلالت کو عین عبادت جانتے ہیں۔ خالق کریم کو جس نے پیدا کیا زمین وآسمان وعرش اور تمام ظاہر و پوشیدہ سے واقف ہے چھوڑ کر آفتاب کو کہ یہ بھی اُس کے نور کا ایک ذرہ ہے خدا جانتے ہیں۔ حالانکہ قابل پرستش کے اس واحد حقیقی کے سوا کوئی نہیں ہے۔

مُرغ اذان کہنے والا یہ ہے کہ تاج سر پر رکھے ہوئے دیوار پر کھڑا ہے آنکھیں سُرخ بازو پھیلائے ہوئے دُم اُٹھی ہوئی نہایت غیور اور سخی ہمیشہ تکبیر وتہلیل میں رہتا ہے۔ نماز کے وقت پہچانتا اور ہمسایوں کو یاد دلاتا اور نصیحت کرتا ہے صبح کے وقت اپنی اذان میں یہ کہتا ہے کہ اے ہمسائے کے رہنے والو یاد کرو اللہ کے تئیں بہت دیر سے سوتے ہو۔ موت اور خرابی کو نہیں یاد کرتے۔ دوزخ کی آگ سے خوف نہیں کرتے بہشت کے مشتاق نہیں ہوتے اللہ کی نعمتوں کا شکریہ نہیں کرتے۔ یاد کرو اُس شخص کو کہ سب لذتوں کو نیست ونابود کرے گا۔ عاقبت کی راہ کا توشہ تیار کرو اگر چاہتے ہو کہ آتش دوزخ سے محفوظ رہو تو عبادت و پرہیزگاری کرو۔

تیتر ندا کرنے والا یہ ٹیلے پر کھڑا ہوا ہے۔ رُخسارے سپید بازو ابلق رکوع اور سجدوں کی کثرت سے خمیدہ قامت ہو رہا ہے۔ ندا کے وقت غافلوں کو یاد دلاتا

اور بشارت دیتا ہے بعد اس کے یہ کہتا ہے شکر کرو اللہ کی نعمتوں کا کہ نعمت زیادہ ہو اور خدا پر بدگمانی نہ کرو اور اکثر مناجات میں خدا سے یہ دعا مانگتا ہے یا اللہ پناہ میں رکھ مجھے شکاری جانوروں اور گیدڑوں اور آدمیوں کی بدی سے اور طبیب جو یہ ہے گوشت کھانے کے واسطے مریضوں سے فائدہ بیان کرتے ہیں اس سے بھی محفوظ رکھ کہ اس میں میری زندگی نہیں ہے۔ یاد کرتا ہوں میں ہمیشہ خدا کے تئیں صبح کے وقت ندائے حق کرتا ہوں کہ سب آدمی سنیں اور نیک نصیحت پر عمل کریں۔

کبوتر ہدایت کرنے والا یہ ہے کہ نامہ لے کر دور شہروں کی سیر کرتا ہے اور کبھی اڑتے وقت نہایت افسوس سے یہ کہتا ہے وحشت ہے بھائیوں کی جدائی سے اور اشتیاق ہے دوستوں کی ملاقات کا۔ یا اللہ ہدایت کر مجھے وطن کی طرف کہ دوستوں کی ملاقات سے خوشی حاصل ہو۔

کبک یہ ہے کہ پھولوں اور درختوں میں ہمیشہ باغ کے بیچ خوش خرامی کرتی اور نہایت خوش آوازی نغمہ سرائی میں مشغول رہتی ہے۔ ہمیشہ وعظ و نصیحت سے یہ کہتی ہے کہ اے عمر و بنیاد کے فنا کرنے والے باغ میں درختوں کے لگانے والے شہر میں گھروں کے بنانے والے بلندی کے بیٹھنے والے۔ زمانے کی سختی سے کیوں غافل ہے ہرگز کسی دم خالق کو نہ بھول۔ یاد کر اس دن کو کہ یہ عیش اور مکان چھوڑ کر گور کے اندر سانپ اور بچھوؤں میں جا کر پڑے گا۔ اگر اس وطن کے چھوڑنے کے آگے ابھی سے خبردار ہوا ہے تو بہتر ہے کہ وہاں اچھے مکان میں پہنچے۔ نہیں تو خرابی میں پڑے گا۔

سرخاب یہ ہے جس طرح کہ خطیب منبر پر چڑھتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی دوپہر کے وقت ہوا میں بلند ہو کر زراعت کے انباروں پر جا کر انواع و اقسام کے نغمے نہایت خوش آوازی سے کرتا ہے اور اپنے نغمے میں یہ کہتا ہے۔ کہاں ہیں وے ارباب تجارت اور اہل زراعت کہ ایک دانہ بونے میں خدا کی رحمت سے بہت سی نعمتیں اٹھاتے

ہیں۔ اے صاحبو خدا کے خوف سے عبرت کرو موت کو یاد کر کے مرنے کے قبل اس کی عبادت کا حق بجا لاؤ اور اس کے بندوں کے ساتھ نیکی اور احسان کرو۔ بخل کے باعث یہ خیال جی میں نہ لاؤ کہ آج ہمارے یہاں کوئی فقیر و محتاج نہ آوے۔ اس واسطے کہ جو آج کے دن نیکی کا درخت بٹھلاوے گا کل اس کا پھل اور مزہ اٹھاوے گا۔ یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو کہ اس میں نیک عمل کی زراعت کرے گا فائدہ اس کا عاقبت میں پاوے گا۔ اگر کوئی عمل بد کرے گا اس پھوس کے مانند آتش دوزخ میں جلے گا۔ یاد کرو اس دن کو کہ خدا کافروں کو مومنوں سے جدا کر کے جہنم کی آگ میں ڈالے گا اور مومنوں کو بہشت میں پہنچاوے گا۔

بلبل حکایت کرنے والی یہ شاخ درخت پر بیٹھی ہوئی ہے۔ چھوٹا سا جسم اڑنے میں جلد رخسارے سفید داہنے بائیں ہر وقت متوجہ رہتی ہے۔ نہایت فصاحت و خوش الحانی سے نغمہ پردازی کرتی ہے اور باغوں میں انسانوں کے ساتھ گرم صحبت رہتی ہے۔ بلکہ ان کے گھروں میں جا کر ہمکلام ہوتی ہے۔ جس وقت کہ وے یاد الٰہی سے غافل ہو کر لہو لعب میں مشغول ہوتے ہیں وعظ و نصیحت سے کہتی ہے سبحان اللہ کتنے غافل ہو کہ اس چند روزہ زندگی پر فریفتہ ہو کر حق کی یاد سے غفلت کرتے ہو اس کے ذکر میں کیوں نہیں مشغول ہوتے۔ یہ نہیں جانتے ہو کہ تم سب مرنے کے واسطے پیدا ہوئے ہو۔ بوسیدہ ہونے کے لئے پرورش ہوئی فنا ہونے کے واسطے جمع ہوئے ہو یہ گھر خراب ہونے کے واسطے بناتے ہو۔ کب تک اس دنیا کی نعمت پر فریفتہ ہو کر لہو و لعب میں مشغول رہو گے۔ آخر کل مر جاؤ گے۔ مٹی میں دفن ہو گے اب بھی ہوشیار ہو۔ نہیں جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا ابرہہ جو سردار اس گروہ کا تھا۔ چاہتا تھا کہ مکر و غدر سے خانہ خدا کو منہدم کرے۔ بہت سے لوگوں کو ہاتھیوں پر بٹھلا کر متوجہ بیت اللہ کا ہوا۔ آخر خدا نے اس کے مکر و غدر کو باطل

کیا۔ گروہ کے گروہ طائروں کے اس پر مسلط کئے۔ طائروں نے سنگریزے لے کر اس طرح سنگ افشانی کی کہ سب کو ہاتھیوں سمیت کرم خوردہ پتوں کے مانند کر دیا۔ بعد اس کے کہتی ہے الٰہی محفوظ رکھ مجھکو لڑکوں کی حرص اور تمام حیوانوں کے شر سے۔

کوا کاہن یعنی اخبار غیب کو ظاہر کرنے والا یہ ہے۔ سیہ فام پرہیزگار۔ ہر ایک چیز کی خبر کہ ہنوز ظاہر نہیں ہوئی ہے بیان کرتا ہے۔ ہر وقت یاد الٰہی میں مصروف رہتا اور ہمیشہ سیر و سفر میں اوقات بسر کرتا ہے۔ ایک دیار میں جا کر آثار قدیم کی خبر لیتا ہے۔ غفلت کی آفتوں سے غافلوں کو ڈراتا اور وعظ و نصیحت سے یہ کہتا ہے۔ پرہیزگاری کرو اور خوف کرو اس روز سے کہ گور میں بوسیدہ ہو جاؤ گے۔ اعمال کی شامتوں سے پوست کھینچے جاویں گے۔ اب گمراہی سے اس دُنیا کی زندگی پر آخرت کو ترجیح دیتے ہو۔ حکم الٰہی سے بھاگ کر کہیں ٹھکانہ و مخلصی نہیں ہے۔ اگر رہائی چاہتے ہو تو صلوٰۃ و دعا میں مشغول ہو شاید اللہ تعالیٰ رحم کر کے بلا سے محفوظ رکھے۔

ابابیل ہوا میں سیر کرنے والی یہ ہے کہ اُڑنے میں سبک پاؤں چھوٹے بازو وبڑے۔ بیشتر آدمیوں کے گھروں میں رہتی اور وہاں اپنے بچوں کو پرورش کرتی ہے۔ صبح و شام دُعا و استغفار پڑھتی ہے۔ سفر میں بہت دور نکل جاتی ہے۔ گرمی کے دنوں میں سرد مکانوں میں اور جاڑوں میں گرم مکانوں میں سکونت اختیار کرتی ہے ہمیشہ تسبیح و دعا میں بھی ورد رکھتی ہے۔ پاک ہے وہ جس نے پیدا کیا دریا اور زمین کو پہاڑ و ں کا قائم کرنے والا موافق قدر کے رزق و موت کا مقرر کرنے والا کہ اس سے ہرگز تجاوز نہیں ہوتا۔ وہ ہی سفر میں مسافروں کا مددگار ہے۔ مالک ہے تمام روئے زمین اور ساری مخلوقات کا۔ بعد اس تسبیح و دعا کے کہتی ہے کہ ہر ایک دیار میں ہم گئے۔ سب بندوں کو دیکھا اور اپنے وطن کو پھر آئے پاک ہے وہ جس نے نر مادہ کو جمع کر کے اولاد کی کثرت عطا کی اور زاویۂ نیستی سے نکال کر لباس ہستی کا پہنایا۔ حمد ہے واسطے اُس کے کہ

پیدا کرنے والا تمام بندوں کا اور عطا کرنے والا نعمتوں کا ہے۔

کلنگ نگہبانی کرنے والا یہ میدان میں کھڑا ہے۔ گردن لمبی پاؤں چھوٹے اُڑنے کے وقت آدھے آسمان تک پہنچتا ہے۔ رات کو دو مرتبہ نگہبانی کرتا اور حمد الٰہی میں تسبیح کرتا اور کہتا ہے۔ پاک ہے وہ اللہ جس نے اپنی قدرت سے ہر ایک حیوان کا جوڑا بنایا کہ اُس کے ملنے سے توالد و تناسل ہو اور اپنے خالق کی یاد کریں۔

سنگخوارہ خشکی کا رہنے والا یہ ہے۔ ہمیشہ جنگل و بیابان میں رہتا ہے۔ صبح و شام یہ ورد رکھتا ہے۔ پاک ہے وہ جس نے پیدا کیا آسمان و زمین کو وہ ہی پیدا کرنے والا افلاک اور ہر بروج اور سب ستاروں کا ہے۔ سب اسی کے حکم سے پھرتے ہیں۔ پانی کا برسانا ہوا کا چلانا۔ رعد و برق کا ظاہر کرنا اسی کا کام ہے۔ وہی اُٹھانے والا ہے زمین سے بخارات کا جس کے سبب جہان کا انتظام ہے۔ عجب خالق ہے کہ بعد موت کے استخوان بوسیدہ کو زندہ کرتا ہے۔ سُبحان اللہ کیسا خالق ہے کہ زبان انسان کی اس کی حمد و صفت میں قاصر ہے۔ کیا امکان کہ اُس کی کنہ میں عقل کو رسائی ہو۔

ہزار داستان خوش الحان یہ شاخ درخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ چھوٹا سا جسم حرکت میں سبک خوش آواز حمد الٰہی میں اس طرح الحان سے نغمہ سرائی کرتا ہے حمد ہے واسطے اللہ کے کہ صاحب قدرت و احسان ہے۔ یکتا ہے کہ کوئی اس کا ہمتا نہیں۔ بخشش کرنے والا پوشیدہ اور ظاہر نعمتوں کا دینے والا بخش دیا کے بے دریغ ہر انسان کو فیضان نعمت سے سرفراز ہے۔ اور کبھی نہایت افسوس سے اس طور پر کہتا ہے کیا خوش تھا وہ زمانہ کہ باغ میں پھولوں کی سیر تھی۔ تمام درخت انواع و اقسام کے میووں سے لدے تھے۔

اس میں شاہ مُرغ نے طاؤس سے کہا کہ ان میں سے تیرے نزدیک کون صاحب لیاقت زیادہ ہے کہ وہاں اُس کو بھیجیے کہ انسانوں سے جا کر مناظرہ کرے اور اپنے ہمجنسوں کا شریک ہووے۔ طاؤس نے کہا کہ یہ سب اس بات کی لیاقت رکھتے ہیں اس واسطے کہ سب شاعر اور فصیح ہیں مگر ہزار داستان ان میں زیادہ فصیح و خوش الحان ہے۔ شاہ مرغ نے اس کو حکم کیا کہ تو اب رخصت ہو کر وہاں جا اور توکل خدا پر کر کہ وہی ہر حال میں معین و مددگار ہے۔

---

(۵)

پانچویں قاصد نے جس گھڑی دریائی جانوروں کے بادشاہ کے روبرو جاکر مناظرے کی خبر پہنچائی۔ اُس نے بھی اپنے تمام توابع اور لواحق کو جمع کیا۔ چنانچہ مچھلی مینڈک۔ نہنگ۔ ونفین۔ کچھوا وغیرہ سب دریائی جانور رنگ برنگ کی شکلوں اور صورتوں سے بمجرد حکم کے حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے جو کچھ قاصد کی زبانی سُنا تھا ان سے بیان کیا بعد اس کے قاصد سے کہا اگر انسان اپنے تئیں قوت و شجاعت میں ہم سے بڑا جانتے ہوں میں ابھی جاکر ایک دم میں سب کو جلا پھونک دوں اور دم کے زور سے کھینچ کر نگل جاؤں۔ قاصد نے کہا وے ان میں کسی چیز کا فخر نہیں کرتے۔ مگر اپنے تئیں اس بات میں غالب جانتے ہیں کہ ہم عقل و دانائی زیادہ رکھتے ہیں۔ ہر ایک علم و فن سے واقف اور بہت سی صنعتیں اور تدبیریں جانتے ہیں عقل و تمیز ہماری سی کسی میں نہیں ہے۔

بادشاہ نے کہا کہ ان کے علم اور صنعتوں کا احوال مفصل بیان کر کہ ہم بھی معلوم کریں۔ قاصد نے کہا بادشاہ کو نہیں معلوم کہ وے اپنے علم و دانائی دریائے قلزم کے اندر جاکر اس کی تہ سے جواہر نکالتے ہیں حیلے اور مکر سے پہاڑ پر چڑھ کر گدھوں اور عقابوں کو پکڑ نیچے اُتار لاتے ہیں۔ اسی طرح اپنے علم و دانائی سے لکڑیوں کا ہل بناکر بیلوں کے کاندھوں پر رکھتے اور بھاری اسباب ان کی پیٹھ پر لاد کر مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک لے جاتے ہیں۔ تمام جنگل اور بیابان طے کرتے ہیں۔ فکر و دانائی سے کشتیاں بنا کر اسباب چڑھاتے ہیں اور دریا دریا لئے پھرتے ہیں

پہاڑوں اور ٹیلوں پر جاکر اقسام اقسام کے جواہر اور سونا۔ چاندی۔ لوہا۔ تانبا اور بہت سی چیزیں زمین سے کھود کر نکال لیتے ہیں۔ اگر ایک آدمی کسی نہر یا دریا یا وادی کے کنارے پر جاکر ایک طلسم علم کے زور سے بناوے پھر ہزار نہنگ اور اژدہے اگر اس جگہ جاویں مقدور نہیں کہ وہاں گذر سکیں مگر جنوں کے بادشاہ کے روبرو عدل و انصاف۔ حجت و دلیل کا چرچا ہے۔ قوت۔ زور۔ حیلہ۔ مکر کا کچھ مذکور نہیں۔

بادشاہ نے جس وقت قاصد کی زبانی یہ سب سنا۔ جتنے اس کے گرد و پیش بیٹھے تھے سب کی طرف متوجہ ہوکر کہا کہ اب تمھارے نزدیک کیا تدبیر ہے؟ کون شخص وہاں جاکر انسانوں سے مناظرہ کرے گا۔ کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔

مگر "دلفین" کہ دریائے شور میں رہتا ہے اور آدمیوں کے ساتھ نہایت الفت رکھتا ہے۔ جو شخص ڈوبتا ہے اس کو پانی سے نکال کر کنارے پر ڈال دیتا ہے۔ اس نے عرض کیا کہ دریائی جانوروں میں اس کام کے واسطے مچھلی مناسب ہے اس واسطے کہ جسم میں بڑی صورت میں اچھی منہ پاکیزہ رنگ سفید بدن درست حرکت میں جلد تیرنے میں حد سے باہر شمار میں سب دریائی جانوروں سے زیادہ اور اولاد کی کثرت کہ تمام ندی۔ نالے۔ دریا۔ تالاب بھر جاتے ہیں۔ آدمیوں کے نزدیک اس کا مرتبہ بھی بڑا ہے۔ اس واسطے ایک بار اس نے ان کے نبی کو اپنے پیٹ میں پناہ دی تھی اور پھر بحفاظت ان کو مکان پر پہنچا دیا۔ سب آدمیوں کو اعتقاد ہے کہ تمام زمین اس کی پیٹھ پر قائم ہے۔

بادشاہ نے مچھلی سے پوچھا تو اس میں کیا کہتی ہے۔ اس نے کہا میں وہاں کسی طرح نہیں جا سکتی ہوں اور انسانوں سے مناظرہ بھی نہیں کر سکتی اس واسطے کہ میرے پاؤں نہیں ہیں کہ وہاں تک پہنچوں اور نہ زبان ہے کہ ان سے ہمکلام ہوں پیاس کی مجھ کو تاب نہیں پانی سے اگر ایک دم جدا ہوں حالت تباہ

ہو جاوے۔ میرے نزدیک اس کام کے لیے کچھوا بہتر ہے کیونکہ وہ پانی سے جدا ہوکر خشکی میں بھی رہتا ہے اس کے نزدیک دریا اور خشکی کا رہنا برابر ہے۔ اس کے سوا بدن بھی اس کا مضبوط اور پیٹھ سخت ہے نہایت بردبار ہو اذیت و رنج کا متحمل ہوتا ہے۔

بادشاہ نے کچھوے سے پوچھا کہ تیرے نزدیک کیا اصلاح ہے۔ اس نے کہا یہ کام مجھ سے بھی نہیں ہو سکے گا۔ چلنے کے وقت میرے پاؤں بھاری ہو جاتے ہیں اور رستہ دور ہے۔ میں کم گو بھی ہوں کہ زیادہ کلام مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے واسطے دلفین بہتر ہے۔ کیونکہ وہ چلنے میں نہایت قوی گویائی کی قدرت زیادہ رکھتا ہے۔

بادشاہ نے پھر "دلفین" سے پوچھا کہ تیرے نزدیک کیا صلاح ہے۔ اس نے کہا اس امر کے لیے کیکڑا مناسب ہے۔ اس واسطے کہ پاؤں اس کے بہت سے ہیں چلنے اور دوڑنے میں جلد۔ چنگل تیز۔ ناخن سخت۔ پیٹھ مضبوط گویا زرہ پوش ہے۔

بادشاہ نے کیکڑے سے کہا۔ اس نے جواب دیا کہ میں وہاں کس طرح سے جاؤں۔ ڈیل ڈول میرا بھدبسیلا پیٹھ کبڑی۔ صورت نپٹ زبون۔ ایسا نہ ہو کہ وہاں میری ہنسی ہو۔ بادشاہ نے کہا کہ تیری ہنسی کیوں ہوگی۔ تجھ میں عیب کیا ہے۔ کیکڑے نے کہا کہ وے سب مجھے دیکھ کر کہیں گے کہ یہ حیوان بے سر کا ہے۔ آنکھیں گردن پر۔ منہ سینے میں دونوں طرف سے پھٹے ہوئے پاؤں آٹھ دے بھی ٹیڑھے منہ کے بل چلتا گویا سرب کا بنا ہے۔ سب دیکھ کر مجھے مسخرا کہیں گے۔

ئه وہ

بادشاہ نے کہا پھر وہاں جانے کے لئے کون بہتر ہے۔ کیکڑے نے کہا کہ میرے نزدیک نہنگ اس کام کے واسطے بہت مناسب ہے۔ کیونکہ پاؤں اس کے مضبوط اور چلتا بہت ہے۔ دوڑنے میں جلد۔ منہ بڑا زبان لمبی دانت بہت سے۔ بدن سخت۔ نہایت بردبار مطلب کے واسطے انتظار بہت کرتا ہے۔ کسی چیز میں جلدی نہیں کرتا۔

بادشاہ نے نہنگ سے پوچھا۔ اس نے کہا میں اس کام کے واسطے ہرگز مناسب نہیں ہوں۔ اس واسطے کہ مجھ میں غصہ بہت ہے۔ کودنا۔ پھاندنا۔ جس چیز کو پایا لے بھاگنا۔ یہ سب عیب ہیں۔ غرضکہ سراسر غدار و مکار ہوں۔

قاصد نے یہ سن کر کہا کہ وہاں جانے کے واسطے کچھ زور و قوت و مکر کا کام نہیں ہے۔ بلکہ عقل و وقار۔ عدل و انصاف۔ فصاحت و بلاغت یہ سب چیزیں چاہیئے گر نے کہا مجھ میں یہ کوئی خصلت اور وصف نہیں ہے مگر میرے نزدیک اس کام کے واسطے مینڈک بہتر ہے۔ اس واسطے کہ وہ حکیم اور صابر اور زاہد ہے۔ رات دن خدا کی یاد میں تسبیح پڑھتا اور صبح و شام نماز روزے میں مشغول رہتا ہے۔ آدمیوں کے گھروں میں بھی جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کے نزدیک اس کی قدر و منزلت زیادہ ہے۔ اس واسطے کہ ایک بار اس نے ان کے ساتھ سلوک کیا کہ جس وقت نمرود نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو آگ میں ڈالا یہ اپنے منہ میں پانی لے کر چھڑکتا تھا کہ آگ بجھ جاوے اور ان کے بدن میں اثر نہ کرے اور دوسری بار جب کہ حضرت موسیٰؑ اور فرعون سے لڑائی ہوئی۔ اس نے موسیٰ علیہ السلام کی مدد کی۔ اور یہ فصیح بھی ہے۔ باتیں بہت کرتا ہے ہمیشہ تسبیح و تکبیر و تہلیل میں مشغول رہتا ہے اور خشکی و تری دونوں میں پھرتا ہے۔ زمین پر چلتا دریا میں تیرنا سب جانتا ہے اعضا بھی مناسب ہیں۔ سر گول۔ منہ اچھا

آنکھیں روشن ہاتھ پاؤں بڑے چلنے میں جلد آدمیوں کے گھروں میں جاتا اور خوف نہیں کرتا ہے۔

بادشاہ نے مینڈک سے کہا کہ تیرے نزدیک اب کیا صلاح ہے۔ اس نے کہا میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ اور بادشاہ کا تابع جو حکم کرے مجھکو قبول ہے۔ وہاں اپنے ابنائے جنس کی طرف ہو کر انسانوں سے مناظرہ کروں گا۔ لیکن امیدوار ہوں کہ بادشاہ میری مدد اور اعانت کے واسطے خدا سے دعا مانگے۔ اس واسطے کہ بادشاہ کی دعا رعیت کے حق میں قبول ہوتی ہے۔ بموجب اس کے کہنے کے بادشاہ نے خدا سے دعا مانگی اور سب جماعت نے آمین کہی۔ یہ مینڈک بادشاہ سے رخصت ہوا اور یہاں سے جا کر جنوں کے بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا۔

---

(۶)

"انسان جس وقت اپنے کلام سے فارغ ہوا بادشاہ نے حیوانوں کی طرف
خیال کیا۔ ناگاہ ایک مہین آواز کان میں پہنچی دیکھا تو مکھیوں کا سردار الیعسوب سامنے
اُڑتا اور خدا کی تسبیح و تہلیل میں نغمہ سرائی کرتا ہے۔ پوچھا تو کون ہے۔ اس نے کہا میں
حشرات الارض کا بادشاہ ہوں۔ فرمایا تو آپ کیوں آیا۔ جس طرح اور حیوانوں نے اپنے
قاصد اور وکیل بھیجے تو نے اپنی رعیت اور فوج سے کسی کو کیوں نہ بھیجا۔ اس نے کہا میں نے
اُن کے حال پر شفقت و مہربانی کی تاکہ کسی کو کچھ تکلیف نہ پہنچے بادشاہ نے کہا یہ وصف
اور حیوانوں میں نہیں ہے تجھ میں کیوں ہوا۔ اس نے کہا اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت و
مرحمت سے یہ وصف عطا کیا۔ اس کے سوا اور بھی بہت سی بزرگیاں اور خوبیاں بخشی
ہیں۔ بادشاہ نے کہا کچھ بزرگیاں اور خوبیاں اپنی بیان کر کہ ہم بھی معلوم کریں۔ اس نے
کہا اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اور میرے جد و آبار کو بہت سی نعمتیں بخشیں۔ کسی حیوان کو اس میں
شریک نہیں کیا۔ چنانچہ ملک و نبوت کا مرتبہ ہم کو بخشا اور ہمارے جد و آبار کو نسل
در نسل اس کا ورثہ پہنچا۔ اس کے سوا اللہ تعالیٰ نے ہم کو علم ہندسہ اور بہت سی صنعتیں
سکھائیں کہ اپنے مکانوں کو نہایت خوبی سے بناتے ہیں۔ تمام جہاں کے پھل اور
پھول ہم پر حلال کئے کہ بے خلش کھاتے ہیں۔ ہمارے لعاب سے شہد پیدا کیا کہ جس سے
تمام انسانوں کو شفا حاصل ہوتی ہے۔ اس مرتبہ پر آیات قرآنی ناطق ہیں اور ہماری
صورت و سیرت اللہ تعالیٰ کی قدرت پر غافلوں کے واسطے دلیل ہے۔ کیونکہ خلقت
ہماری نہایت لطیف اور صورت نہایت عجیب ہے اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے
جسم میں تین جوڑ رکھے ہیں۔ بیچ کے جوڑ کو مربع کیا نیچے کے دھڑ کو لمبا سر کو مدور بنایا

ہمارے ہاتھ پاؤں مانند اضلاع شکل مسدس کے نہایت خوبی سے مقدار مناسب کے
بنائے۔ جن کے سبب نشست و برخاست کرتے ہیں اور گھر اپنے اس خوش اسلوبی
سے بناتے ہیں کہ ہوا ان میں ہرگز نہیں جا سکتی کہ جس کے باعث ہم کو یا ہمارے بچوں کو
تکلیف پہنچے۔ ہاتھ پاؤں کی قوت سے درخت کے پھل پتے پھول جو کچھ پاتے ہیں اپنے
مکانوں میں جمع کر رکھتے ہیں۔ شانوں پر چار بازو بنائے جن کے باعث اڑتے ہیں اور
ہمارے ڈنک میں کچھ زہر بھی پیدا کیا ہے کہ اس کے سبب دشمنوں کے شر سے محفوظ رہتے
ہیں اور گردن پتلی بنائی کہ داہنے بائیں سر کو بخوبی پھیرتے ہیں اور اس کے دونوں
طرف دو آنکھیں روشن عطا کی ہیں کہ ان کی روشنی سے ہر ایک چیز کو دیکھتے ہیں اور
منہ بھی بنایا ہے کہ جس سے کھانے کی لذت جانتے ہیں دو ہونٹ بھی دئے جن کے
سبب کھانے کی چیزیں جمع کرتے ہیں اور ہمارے پیٹ میں قوت ہاضمہ ایسی بخشی ہے
کہ وہ رطوبات کو شہد کر دیتی ہے اور یہی شہد واسطے ہمارے اور اولاد کے غذا ہے
جس طرح چارپایوں کے پستان میں قوت دی ہے کہ اس کے سبب خون مستحیل
ہو کر دودھ ہو جاتا ہے۔ غرضکہ یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہم کو عطا کی ہیں اس کا شکر
کہاں تک کریں اسی واسطے میں نے رعیت کے حال پر شفقت و مہربانی کر کے اپنے
اوپر تکلیف روا رکھی اُن میں سے کسی کو نہ بھیجا۔

جس وقت یعقوب اپنے کلام سے فارغ ہوا بادشاہ نے کہا آفرین صد آفرین
تو نہایت فصیح و بلیغ ہے کہ تیرے سوا یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے کسی حیوان کو نہیں
بخشیں۔ بعد اس کے پوچھا تیری رعیت اور سپاہ کہاں ہے۔ اس نے کہا ٹیلے۔
پہاڑ اور درخت پر جہاں سبھتا پاتے رہتے ہیں۔ اور بعضے تو آدمیوں کے ملک میں
جا کر ان کے گھروں میں سکونت اختیار کرتے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا ان کے ہاتھ
سے کیونکر سلامت رہتے ہیں۔ کہا بیشتر ان سے چھپ کر اپنے تئیں بچاتے ہیں۔ مگر بھی

جو وے قابو پاتے ہیں تکلیف دیتے ہیں بلکہ اکثر چھتوں کو توڑ کر بچوں کو مار ڈالتے ہیں اور شہد نکال کر آپس میں کھا لیتے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا کہ تم اس ظلم پر ان کے کیونکر صبر کرتے ہو۔ کہا ہم یہ ظلم سب اپنے اوپر گوارا کرتے ہیں اور کبھی عاجز ہو کر ان کے ملک سے نکل جاتے ہیں اُس وقت وے صلح کے واسطے بہت حیلے پیش کرتے ہیں طرح طرح کی سوغات عطر و خوشبو وغیرہ بھیجتے ہیں طبل اور دف بجاتے ہیں۔ غرضکہ انواع و اقسام کے تحفے تحائف دے کر ہم کو راضی کرتے ہیں۔ ہمارے مزاج میں شر و فساد نہیں ہے۔ ہم بھی ان سے صلح کر لیتے ہیں ان کے یہاں پھر چلے آتے ہیں۔ تس پر بھی ہم سے راضی نہیں ہیں۔ بغیر دلیل و حجت کے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم مالک یہ غلام ہیں۔

---

(٧)

جس گھڑی طوطا اس کلام سے فارغ ہوا بادشاہ نے جن و انس کی جماعت کی طرف دیکھ کر کہا کہ دیمک باوجود اس کے کہ ہاتھ پاؤں کچھ نہیں مٹی کیونکر اُٹھاتی ہے اور اپنے بدن پر مکان اپنا محراب دار بناتی ہے اس کا احوال ہم سے بیان کرو۔

عبرانیوں کی جماعت سے ایک شخص نے کہا کہ اس کیڑے کو جن مٹی اُٹھا دیتے ہیں اس واسطے کہ اس نے ان سے یہ احسان کیا تھا کہ حضرت سلیمان کا عصا کھا لیا وے گر پڑے جنوں نے جانا اُنھوں نے وفات پائی وہاں سے بھاگے اور محنت و عذاب سے ان کو مخلصی ہوئی۔ بادشاہ نے جنوں کے عالموں سے پوچھا کہ یہ شخص جو کہتا ہے تم بھی کچھ اس بات سے واقف ہو۔ سب نے کہا ہم کیونکر کہیں کہ جنات مٹی اور پانی اُس کو اُٹھا کر دیتے ہیں۔ اس واسطے کہ اگر جنوں سے اُس نے یہی سلوک کیا تھا جو کہ اس شخص نے بیان کیا تو اب بھی وے اس محنت و مشقت میں گرفتار ہیں مخلصی نہ ہوئی کہ حضرت سلیمان بھی ان سے مٹی پانی اُٹھوا کر مکانات بنواتے تھے اور کسی طور کی تکلیف اُن کو نہیں دیتے تھے۔

حکیم یونانی نے بادشاہ سے کہا ایک وجہ اس کی مجھکو معلوم ہے بادشاہ نے کہا بیان کر اس نے کہا دیمک کی خلقت عجیب و غریب ہے۔ طبیعت اس کی نہایت بارد اور تمام بدن میں تخلخل اور مسام ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ ہوا جو اندر جسم کے جاتی ہے کثرت برودت سے منجمد ہو کر پانی ہو جاتی ہے۔ ظاہر بدن پر وہی ٹپکتا ہے اور غبار جو اُس کے بدن پر پڑتا ہے میل ہو کر جم جاتا ہے اُس کو یہ جمع کر کے بدن پر اپنے پناہ کے واسطے مکان بناتی ہے کہ ہر ایک آفت سے محفوظ رہے اور دو ہونٹ بھی اس کے نہایت بڑے

ہوتے ہیں کہ ان سے پھل پتی لکڑی کاٹتی ہے اور اینٹ پتھر میں سوراخ کرتی ہے۔ بادشاہ نے بلخ سے کہا کہ دیمک کیڑوں کی قسم سے ہے اور تو کیڑوں کا وکیل ہے تو بتا کہ حکیم یونانی کیا کہتا ہے۔

بلخ نے کہا یہ سچ کہتا ہے مگر تمام وصف اس کا بیان نہ کیا کچھ باقی رہ گیا۔ بادشاہ نے کہا تو اسے تمام کر اس نے کہا اللہ تعالیٰ نے جبکہ تمام حیوانات کو پیدا کیا اور ہر ایک کو اپنی نعمتیں عطا کیں حکمت و عدل سے سب کو برابر رکھا۔ بعضوں کو جسم اور ڈیل ڈول بڑا اور بھاری بخشا مگر نفس ان کا نہایت ذلیل و خراب کیا اور بعضوں کو جسم چھوٹا اور ضعیف دیا لیکن نفس ان کا نہایت عالم و عاقل کیا۔ زیادتی اور کمی ادھر ادھر کی برابر ہوگئی چنانچہ ہاتھی باوجود بڑے جسم کے اتنا ذلیل النفس ہے کہ ایک لڑکے کا تابع ہو جاتا ہے۔ کاندھے پر چڑھ کر جدھر چاہے لے جاوے اونٹ باوصف اس کے کہ گردن اور جسم نہایت طول طویل ہے مگر احمق اتنا ہے کہ جس نے مہار پکڑی اس کے پیچھے چلا جاتا ہے اگر چوہا بھی چاہے تو اس کو لئے پھرے۔ اور بچھو اگرچہ جسم میں چھوٹا ہوتا ہے پر جس وقت ہاتھی کو ڈنک مارتا ہے تو اس کو بھی ہلاک کرتا ہے۔

اسی طرح یہ کیڑا جسے دیمک کہتے ہیں اگرچہ جسم میں نپٹ چھوٹا اور کمزور ہے مگر نہایت قوی النفس ہے۔ غرض جتنے کیڑے کہ جسم میں چھوٹے ہیں وے سب بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔

بادشاہ نے پوچھا اس کا کیا سبب کہ بڑے جسم والے احمق اور چھوٹے جسم کے عاقل ہوتے ہیں اس میں کیا حکمت الٰہی ہے۔ کہا خالق نے اپنی قدرت کاملہ سے معلوم کیا کہ جن حیوانوں کے جسم بڑے ہیں وے رنج و مصیبت کے قائل ہیں۔ پس اگر ان کو نفس قوی عطا کرتا ہرگز کسی کے تابع نہ ہوتے اور چھوٹے جسم والے عاقل نہ ہوتے تو ہمیشہ رنج و تکلیف میں رہتے اسی واسطے ان کو نفس ذلیل اور ان کو نفس عاقل عطا

کیا۔ بادشاہ نے کہا اس کو مفصل بیان کر۔ اس نے کہا ہر ایک صنعت میں خوبی یہ ہے کہ صانع کی صنعت کسی کو معلوم نہ ہو کہ کس طرح بناتا ہے۔ جس طرح مکھی بغیر مسطر اور پرکار کے اپنے گھر میں انواع و اقسام کے زاویے اور دائرے بناتی ہے کچھ دریافت نہیں ہوتا کہ کیونکر بناتی اور یہ موم اور شہد کہاں سے لاتی ہے۔ اگر جسم اس کا بڑا ہوتا تو یہ صنعت اس کی ظاہر ہو جاتی

اسی طرح ریشم کے کیڑے کہ ان کا بھی تننا بننا کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ یہی حال دیمک کا ہے کہ اس کے مکان بنانے کی حقیقت کچھ نہیں کھلتی۔ یہ نہیں دریافت ہوتا کہ کس طرح مٹی اٹھاتی اور بناتی ہے۔ حکمائے فلسفی اس کے منکر ہیں کہ وجود عالم بغیر ہیولا کے ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مکھی کی صنعت کو اس پر دلیل کیا ہے کیونکہ وہ بغیر ہیولا کے موم کے گھر بناتی اور شہد سے قوت اپنا جمع کرتی ہے اگر ان کو یہ گمان ہے کہ وہ پھول اور پتے سے اس کو جمع کرتی ہے یہ بھی اس کو جمع کرکے کچھ بناتے کیوں نہیں۔ اور اگر پانی اور ہوا کے درمیان سے جمع کرتی ہے اگر آپ بصارت رکھتے ہیں اس کو دیکھتے کیوں نہیں کہ کس طرح جمع کرتی اور گھر اپنا بناتی ہے۔ اسی طرح ظالم بادشاہوں کے واسطے کہ بغی[1] اور گمراہ ہیں اس کی نعمت کا شکر نہیں کرتے۔ چھوٹے جسم کے حیوانوں کو اپنی قدرت اور صنعت پر دلیل کیا ہے چنانچہ نمرود کو پشے نے قتل کیا باوجود اس کے کہ سب حشرات الارض میں چھوٹا ہے اور فرعون نے جس وقت گمراہی اختیار کی اور حضرت موسیٰ سے "بغی" ہوگیا اللہ تعالیٰ نے فوج بلخ کی بھیجی کہ انھوں نے جاکر اس کو زیر و زبر کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جب حضرت سلیمان کو سلطنت و نبوت بخشی اور تمام جن و انس کو ان کے تابع کیا اکثر گمراہوں کو ان کے مرتبۂ نبوت میں شک ہوا کہ انھوں نے یہ سلطنت مکر و حیلے سے ہم پہنچائی ہے ہر چند کہ وے کہتے تھے کہ مجھکو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و احسان سے یہ مرتبہ بخشا ہے تس پر

---

[1] باغی

بھی ان کے دل سے شک نہ گیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسی دیمک کو بھیجا اس نے آکر حضرت سلیمان علیہ السلام کا عصا کھا لیا۔ یہ تو محراب میں گر پڑے مگر جن و انس کو یہ طاقت نہ پہنچی کہ اس پر جرأت کر سکتے۔ یہ قدرت اللہ تعالیٰ کی گمراہوں کے واسطے نصیحت ہے کہ اپنے ڈیل ڈول اور دبدبے پر فخر کرتے ہیں۔ ہر چند کہ سب صنعتیں اور قدرتیں اس کی دیکھتے ہیں تس پر بھی عبرت نہیں پکڑتے۔ ان بادشاہوں کے سبب جو ہمارے کیڑوں سے عاجز ہیں اپنا فخر کرتے ہیں۔ اور صدف کہ جس میں موتی پیدا ہوتا ہے سب دریائی جانوروں سے جسم میں چھوٹی اور ضعیف ہے مگر علم و دانائی میں سب سے دانا اور ہوشیار ہے۔ قعر دریا میں اپنا قوت و رزق پیدا کر کے رہتی ہے۔ پانی برسنے کے دن تہ کے اندر سے نکل کر پانی کے اوپر ٹھہرتی ہے۔ دو کان اس کے نہایت بڑے بڑے ہوتے ہیں ان کو کھول دیتی ہے جس وقت مینھ کا پانی اس کے اندر جاتا ہے فی الفور بند کر لیتی ہے کہ دریا کے شور کا پانی اس میں نہ ملنے پاوے۔ بعد اس کے پھر دریا کی تہ میں چلی جاتی ہے۔ مدت تک ان دو سیپیوں کو بند رکھتی ہے یہاں تک کہ وہ پانی پختہ ہو کر موتی ہو جاتا ہے۔ بھلا ایسا علم کسی انسان میں کاہے کو ہے۔ خدا نے انسانوں کے دلوں میں دیبا اور حریر اور ریشم کی محبت دی ہے سو وہ ان چھوٹے کیڑوں کے لعاب سے بنتے ہیں۔ کھانے میں شہد زیادہ لذیذ جانتے ہیں۔ سو وہ مکھی سے پیدا ہوتا ہے۔ مجلسوں میں موم بتیاں روشن کرتے ہیں وہ بھی اس کی بدولت ہے۔ بہتر سے بہتر ان کی زینت کے واسطے موتی ہے۔ سو اس چھوٹے کیڑے کی حکمت سے پیدا ہوتا ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کیڑوں سے ایسی نفیس چیزیں اس واسطے پیدا کی ہیں کہ یہ آدمی ان کو دیکھ کر اس کی صنعت و قدرت کا اقرار کریں۔ باوجود اس کے کہ سب صنعتیں اور قدرتیں دیکھتے ہیں تس پر غافل ہیں۔ گمراہی اور کفر میں اوقات ضائع کرتے ہیں۔ اس کی نعمت کا شکر نہیں کرتے غریب اور عاجز بندوں پر اس کے جبر و ظلم کرتے ہیں۔

بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقار
اختر اورینوی — ۸/عہ
فن خطابت (کلب مصطفےٰ ایڈووکیٹ) — ۸/للعہ
جلوے (معین الدین دردائی) — ۱۲/عہ
نقوشِ فانی (کبیر احمد جائسی) — عار
سرسید احمد پاشا (علی عباس حسینی) — ۸/عہ

ادبی کتابیں

بزمِ بے تکلف (ڈاکٹر سید عابد حسین) — ۸/عا
مہاراج بلی یعنی خلاصہ سیر کوہسار — عار
ڈاکٹر احسن فاروقی
بردیسی کے خطوط (مجنوں گورکھپوری) — ۸/ہے
یادگار انیس (جدید اڈیشن) — ے/

امیر احمد علوی
اردو شاعری (امیر احمد علوی) — ۸/عہ
ستاروں کے آگے (ناظر کاکوروی) — ۸/ہے
سنہرا حلقہ " — ۸/
ایک نادر روزنامچہ (ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی) — ۸/عا
ادبی خطوط غالب (مرزا عسکری) — ۸/ہے
شرح دیوان غالب طبا طبائی — ۸/ہے
سرمایہ زبان اردو (جلال لکھنوی) — ے/
دلی کا یادگار مشاعرہ (مرزا فرحت اللہ بیگ) — ۱۲/

ہندی کے مسلمان شعراء (امیر حسن نورانی) — ۱۲/

شبلی کی تصانیف

علم الکلام — عا
دستۂ گل ۔ فارسی کلام منظوم — ۸/
بوئے گل — ۶/
شعر العجم کامل — ۶/، ۱۸/عہ

خلاصہ
خلاصہ روح تنقید — ۱۲/
خلاصہ حیات جاوید — عہ/
خلاصہ قواعد اردو — عہ/
اردو عروض یعنی خلاصہ جواہر العروض — صہ/

ناولیں

لب بام (عادل رشید) — صہ/
قطرے سے گہر ہونے تک (صالحہ عابد حسین) — ۶/لے
عذرا " — صہ/
شہید محبت بوٹا سنگھ (خان محبوب طرزی) — للعہ/
ایک جان تین قالب " — للعہ/
نغمۂ کوہسار " — للعہ/
دوشیزہ قاف " — صہ/
امین آباد (خان محبوب طرزی) — ۸/ہے
مصنوعی چاند " — للعہ/

دل ربا (خان محبوب طرزی) — سہ/
فریدہ (جاسوسی) " " — عا/
آغاز سحر (غدر کے مکمل واقعات) "
صوبہ اودھ کی تاریخ " — ۸/ہے
نیا راستہ " — ۸/ہے
استارہ " — عا/
یاقوتی " — ۸/ہے
زینب ساحرہ (وحشی محمود آبادی) — ہے/
سید سالار مسعود غازی " — ے/
پاگل خانہ (مائل ملیح آبادی) — ۱۲/عا
عمار (اسلامی تاریخی ناول) " —
سفر " " " " — ے/
مغربی دروازہ " " " — للعہ/
فلسفی ابن رشد " " — ۸/ہے
لال قلعہ (۱۸۵۷ء کے مکمل واقعات غدر کی تاریخ) — ے/
رخسار سحر (انصر کریم قدوائی) — ۸/عہ
محبوبہ کربلا (جمیجی زیدان) — ۸/ہے
حجاج بن یوسف " — ۸/للعہ
اسپین کی شہزادی
(صادق حسین سردھنوی) — ۸/للعہ

سیاحت زمین (محمود اعظمی فہمی)
جادو کی آنکھ (جاسوسی) (ڈاکٹر اے۔ بلگرامی) — ۸/ہے
شکست کی آواز (قاضی عبد الستار) — ے/
خبطی (محمد علی واحدی) مع تعارف نامہ — ۸/عہ

شوکت تھانوی

افسانے

ٹھیکرے کی مانگ افسانوں کا مجموعہ — عار
صدیقہ بیگم سیوہاروی
ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے (علی عباس حسینی) — ے/
چوتھی بہن (مسیح الحسن رضوی) — ۱۲/عا
جگ ہنسائی (قیصر تمکین) — ۸/عا
ابو الخمر (مجنوں گورکھپوری) — ۶/
سنہرا حلقہ (ناظر کاکوروی) — ۸/

مزاحیہ

زیٹیوں کا بادشاہ حکیم بانا (ناول)
علی عباس حسینی — ے/
اپنی موج میں (آوارہ) — عہ/
کف گلفروش (غلام احمد فرقت) — ے/
صید و ہدف (غلام احمد فرقت) — ۸/عا
اردو ادب میں طنز و مزاح دو جلدیں کامل — عہ/

دل رُبا (خان محبوب طرزی) سعہ
فریدہ (جاسوسی) ؍؍ ؍؍ عا
آغازِ سحر (غدر کے مکمل واقعات) ؍؍
صوبہ اودھ کی تاریخ ؍؍ ۸؍
نیا راستہ ؍؍ ۸؍
اشارہ ؍؍ عا
یاقوتی ؍؍ ۸؍
زینب ساحرہ (وحشی محمود آبادی) ۳؍
سید سالار مسعود غازی ؍؍ ۳؍
پاگل خانہ (رائل ملیح آبادی) ۱۲؍
عمارہ (اسلامی تاریخی ناول) ؍؍
سفر ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۳؍
مغربی دروازہ ؍؍ ؍؍ للعہ
فلسفی ابن رشد ؍؍ ؍؍ ۸؍
لال قلعہ (۱۸۵۷ء کے مکمل واقعات غدر کی تاریخ) ۳؍
رخسار سحر (اصغر کریم قدوائی) عہ
محبوبہ کربلا (جرجی زیدان) ۸؍
حجاج بن یوسف ؍؍ للعہ
اسپین کی شہزادی
(صادق حسین سردھنوی) للعہ

سیاحت زمین (محمود اعظمی فہمی)
جادو کی آنکھ (جاسوسی) ڈاکٹر اثر بلگرامی ۸؍
شکست کی آواز (قاضی عبد الستار) ۳؍
خسبلی (محمد علی واحدی) مع تعارف نامہ عہ

شوکت تھانوی

افسانے

ٹھیکرے کی مانگ افسانوں کا مجموعہ عا؍

صدیقہ بیگم سیوہاروی

ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے (علی عباس حسینی) ۳؍
چوتھی بہن (مسیح الحسن رضوی) ۱۲؍
جگ ہنسائی (قیصر تمکین) ۸؍
ابوالخمر (مجنوں گورکھپوری) ۶؍
سنہرا حلقہ (ناظر کاکوروی) ۸؍

مزاحیہ

زیٹیوں کا بادشاہ حکیم بانا (ناول)
علی عباس حسینی ۳؍
اپنی سوچ میں (آوارہ) عہ
کف گلفروش (غلام احمد فرقت) ۳؍
صید و ہدف (غلام احمد فرقت) ۸؍
اردو ادب میں طنز و مزاح دو جلدیں کامل عہ